کتاب نما

ماہنامہ

نئی دہلی

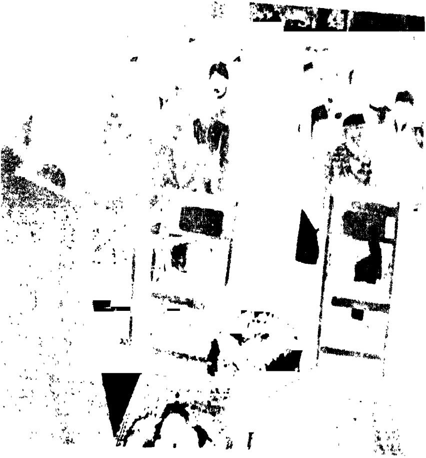




پروفیسر محمد مجیب کارکنانِ پریس کے ساتھ



پروفیسر محمد مجیب خودکار آفسٹ مشین چلا رہے ہیں



[illegible] جنرل منیجر مہمانوں کا شکریہ ادا کر رہے ہیں

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

جنرل ایڈیٹر: غلام ربانی تاباں | ایڈیٹر: ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۶ | جنوری ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۱

اشاریہ

پروفیسر محمد مجیب صاحب، چیرمین بورڈ آف ڈائرکٹرز، مکتبہ جامعہ نے ۱۲ر دسمبر کی شام کو لبرٹی آرٹ پریس کا افتتاح کیا۔ یہ پریس جو ۱۵۲۸، پٹودی ہاؤس دریا گنج میں واقع ہے مکتبہ جامعہ نے خرید لیا ہے اور اس میں ایک آٹومیٹک آفسٹ مشین کا اضافہ کر دیا ہے۔

پریس کے افتتاح کی تقریب بڑے پیمانے پر منائی گئی جس میں بہت سے معززین نے جن میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، وزارت خارجہ کے جوائنٹ سکریٹری جناب محمد یونس صاحب، وزارت محنت کے ڈپٹی سکریٹری جناب شاہ عزیز احمد صاحب، جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب اور مکتبہ کے ڈائرکٹر جناب کرنل بشیر حسین صاحب زیدی، جیسی نامور ہستیوں نے شرکت فرمائی۔

اس موقع پر سب سے پہلے مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب غلام ربانی صاحب تاباں نے ایک مختصر تقریر کی جس میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور مکتبہ جامعہ کے پریس لگانے کے مقصد پر روشنی ڈالی۔ تاباں صاحب نے فرمایا کہ مکتبہ جامعہ کا یہ پریس بہت چھوٹا پریس ہے۔ ابھی یہ صرف ایک آٹومیٹک آفسٹ مشین اور دو ٹریڈلز پر مشتمل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ دو چار مہینے میں ایک اور آفسٹ مشین کا اضافہ کیا جائے گا .... بڑا پریس لگانے کا نہ تو ہمارا خیال ہے اور نہ ہی ہمارے پاس اس کے لیے وسائل ہیں .... ہاں ہماری یہ خواہش ضرور ہے کہ جس طرح مکتبہ جامعہ کا نام معیاری اور عمدہ مطبوعات کی ضمانت ہے، اسی طرح پریس کا نام

بھی اچھی طباعت کی ضمانت بن جائے۔ حاضرین جلسہ نے تالیوں کے شور کے ساتھ اس پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد تا آں صاحب کی درخواست پر جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اپنے مخصوص اور دل چسپ پیرایہ میں فرمایا کہ جب جرمنی میں خود انھوں نے پریس کا کام سیکھا تھا اس وقت ان کے کام کو دیکھتے ہوئے ان کے نگراں نے کہا تھا کہ وہ کبھی پریس نہ لگائیں۔۔۔۔۔۔ لیکن اب جبکہ مکتبہ جامعہ کے کارکنوں کا سلیقہ اور تجربہ دیکھا تو خیال ہوا کہ اب ہمیں پریس لگا لینا چاہیئے۔ آخر میں مجیب صاحب نے پُر یقین لہجے میں امید ظاہر کی کہ پریس برابر کامیابی کی طرف گامزن رہے گا۔ اس کے بعد جناب مجیب صاحب پریس میں آفسٹ مشین کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ نے اس کا بٹن دبایا اور پریس میں کام ہونے لگا۔

آخر میں مہانوں کی چائے وغیرہ سے پُر تکلف ضیافت کی گئی۔

اس موقع پر جو تصاویر لی گئی تھیں ان میں سے کچھ اس پرچے میں دی جارہی ہیں۔

مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن

کاروانِ غزل

ہم اپنے اعلان کے مطابق یکم نومبر ۶۶ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی موقعے پر پیش کیے گئے مکتبہ جامعہ کے سالانہ ادبی سمپوزیم "فن اور فن کار" کی تفصیل اس شمارے میں شائع کر رہے ہیں ـــــ یہ پروگرام ایک طرح ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ پس پردہ نہایت باوقار انداز میں غزل کا تعارف اور شاعر کے حالات وغیرہ سنائی دیتے تھے اور پھر باری باری مختلف حضرات اسٹیج پر آکر ترنم کے ساتھ شاعر کا کلام پڑھتے تھے۔ وقت کی کمی کے باعث مرحومین شعراء میں سے صرف منتخب شاعروں کا کلام ہی اس پروگرام میں پیش کیا گیا۔ (ادارہ)

غزل دو عظیم تہذیبوں کے ملاپ کی نشانی ہے۔ ہندی اور عجمی رنگ و آہنگ کی وہ قوس قزح ہے جو ہمارے ادبی افق پر صدیوں سے نور و نکہت برساتی رہی ہے جب جوانی نے پہلی بار محبت کا گیت گایا ہوگا اس وقت غزل کی روح نے جنم لیا ہوگا وہ رنگیلے البیلے عرب جو ناقے پر سوار مانوس راہوں سے گزرتے ہوئے محبت کے بیتے ہوئے لمحوں اور بچھڑے ہوئے محبوب کی یادوں کا نغمہ چھیڑتے ہوں گے اس وقت غزل قصیدے کے ایک روپ کی شکل میں ابھری ہوگی اور عرب سے ایران پہنچتے پہنچتے قصیدے سے الگ ہو کر غزل نے اپنا ایوان سجایا۔ اس کی لے میں عشق کا جادو حسن کی جگمگاہٹ اور دل کی داستان کا سوز و گداز شامل ہوا جب انسان دوست صوفیوں نے آزادی، رندی اور سرمستی کی تان چھیڑی تو غزل میں تصوف کا رنگ بھی جھلک اٹھا جو ہر انسان میں ذاتِ واحد کا جلوہ دیکھتا ہے اور سبھی انسانوں کو محبت کی ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔

اُردو غزل کا چراغ بھی اسی عظیم الشان روایت سے روشن

ہوا۔ دکن کے دور دراز علاقے میں جب ولی دکنی آج سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے پیار اور پریم کا نغمہ چھیڑتا ہے۔

غزل ولی

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

مجھ پہ نہ کرو ظلم تو یں لیلیٰ خوباں
مجنوں ہوں ترے غم کوں بیاباں سوں کہوں گا

دیکھا ہوں تجھے خواب میں اے مایۂ خوبی
اس خواب کو جا یوسفِ کنعاں سوں کہوں گا

قرباں پری مکھ پہ ہوئی چوب سی جل کر
یہ بات عجائب مہ تاباں سوں کہوں گا

بے صبر نہ ہوا ے ولی اس درد سے ہرگز
چلتا ہوں ترا درد میں درماں سوں کہوں گا

سُرخ ہونٹوں کی صفت۔ جادو بھری انکھڑیوں کی توصیف کے ساتھ ساتھ غزل کے نغمے میں ایک ٹوٹے ہوئے دل کی کراہ بھی شروع ہی سے شامل رہی ہے۔ ٹوٹا ہوا دل انسان کو انسان سے ملاتا ہے دوسرے انسانوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کا بہانہ بنتا ہے اسی لیے صوفیوں نے اسے متاعِ دو جہاں پر ترجیح دی ہے اُردو کے سب سے پہلے اہم صوفی شاعر سراج اورنگ آبادی کی زبانی سنیے :

غزل سراج

خبرِ تحیرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہ بے خرد نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی جا دری رہی

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلا کہیں زباں سیں بیاں کروں
کہ شرابِ صد قدح آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حضر رہا جو رہی سو بے خبری رہی

مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی ——— اُردو غزل

نے دکن سے دہلی تک کی مسافت طے کی محمد شاہ سے لے کر شاہ عالم کے زمانے تک جب زمانہ دہلی کی تہذیبی بساط تہہ کر رہا تھا غزل "درد و داغ و جستجو و آرزو" کی داستان سناتی رہی۔ ایہام گو شاعروں نے غزل کو ہنسنا بولنا سکھانا چاہا۔ مگر زمانے کی درہمی نے اُسے شکست آرزو کا تماشائی بنائے رکھا دہلی لٹ رہی تھی۔ نادر شاہی قتل عام ہوا۔ ابدالی کی فوجیں راجدھانی کو پامال کرتی گزر گئیں اور دہلی والوں کے حساس دل کی آہیں صرف غزل کی سسکیوں میں سنائی دے سکیں۔ اور اس لٹتی ہوئی دہلی کا عظیم ماتم گسار مغنی تھا میر تقی میر۔ جس کے لہجے میں نرمی، زبان کی سادگی، گہری داخلیت اور سوز، غرض جس کی شاعری کا جادو آج بھی جاگتا ہے۔

غزل میر

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا — اُس کی دیوار کا سر سے مری سایہ نہ گیا
کاو کاوِ مژۂ یار و دل زار و نزار — گتھ گئے ایسے شتابی کہ چھڑایا نہ گیا
وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا — ہم سے ہی حالِ تباہ اپنا دکھایا نہ گیا
پاس ناموسِ محبت تھا کہ فرہاد کے پاس — بے ستوں سامنے سے اپنے اُٹھایا نہ گیا
خاک تک کوچۂ دلدار کی چھانی ہم نے — جستجو کی پہ دلِ گم شدہ پایا نہ گیا
آتشِ تیز جدائی میں یکایک اُس بن — دل جلا یوں کہ تنک جی بھی جلایا نہ گیا
مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اُسے — پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا

زیرِ شمشیرِ ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا

عمر بھر کوچۂ دل دار سے جایا نہ گیا ——— مگر نہیں کوچۂ دلدار چھوٹا دلی چھٹی اور دلی کے وہ کوچے چھٹے جو کبھی اوراقِ مصور تھے۔ میر ہی نہیں دہلی کے لاتعداد باکمال سخن ور اہلِ ہنر اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر اودھ سدھارے۔ پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ شاعروں اور باکمالوں کی پناہ گاہ

بنے۔ بہو بیگم محمد شاہ کی منہ بولی بیٹی تھیں اور شجاع الدولہ سے بیاہی تھیں انھیں کی سرپرستی کی امید نے بہتوں کو کھینچ بلایا۔ دہلی ماتم سرا تھی لکھنؤ عشرت کدہ دربار رنگ رلیوں کا مرکز اور محفل اور ایوان رنگینیوں سے چور۔ غزل معاملہ بندی اور بازاری عشق بازی کا بھی شکار ہوئی اور لفظی صناعی اور کاری گری کا بھی۔ شعر زبان و قواعد اور عروض کی میزان پر تو پورا اترا مگر تاثیر کھو بیٹھا ٹوٹے ہوئے دل کی دولت لٹ گئی۔ اور غزل مرصع ساز کا کام بن کر رہ گئی۔ مگر لکھنؤ کے غزل گو شعراء کی صف میں ایسے باکمال بھی تھے جن کی آواز میں تاثیر سے خالی نہ تھیں وہ پینترے باز نہیں تھے شاعر تھے۔ یقین نہ ہو تو اس آواز کو سنیے ــــــ شاعر کا نام غلام ہمدانی مصحفی۔

غزل مصحفی

چلی بھی جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم — کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا
یہی ہے دل کا دھڑکنا کرے اگر تہہ خاک — تو کیا مزار پہ سنگِ مزار ٹھہرے گا؟
کرے گی تن کو بھی بے تاب بیقراری روح — ہوا میں خاک یہ مشتِ غبار ٹھہرے گا
شباب آئیو ٹھہرا رکھیں گے ہم اس کو — جو دم لبوں پہ شبِ انتظار ٹھہرے گا
اُسے نہ دفن کرو ہمدمو یہ سمجھو تو
لحد میں مصحفیٔ بے قرار ٹھہرے گا؟

مگر قافلۂ نوبہار کہاں ٹھہرا ہے؟ لکھنؤ کی بساط بھی زمانے نے تہہ کر دی مگر اس بزم کے لٹے لٹے بھی بعض ایسے مناظر سامنے آ گئے جو مدتے تک دلوں کو گرماتے رہیں گے۔ مشرقی تمدن کے اس آخری گہوارے سے جو آوازیں اٹھیں ان میں کیف و مستی کے نت نئے لطف تھے ابھی تک کسی غزل گو نے شراب نوشی سے غزل میں خمریات کا باقاعدہ اسلوب پیدا نہیں کیا تھا کسی غزل گو نے اس سے پہلے بانک پن اور خودداری، درویشی اور قلندری کو اس تیکھے پن اور

تک دیج ہے غزل میں نہیں سمویا تھا۔ حیدر علی آتش کے لیے یہ کام ازل سے مقدر تھا۔

غزل آتش

آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

یا میسر نہ ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

ری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

ہو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

صاحبو! اب شمعِ محفل اودھ کی شام سے جہاں آباد کی نیم شب تک پہنچتی ہے۔ بزم آخر سجی ہے۔ آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے تاروں کا کارواں کوچ کرنے والا ہے مگر ان میں سے ہر تارہ مہر نیم روز کی سی چمک اور ماہ منور کی سی ٹھنڈک اور ضیا رکھتا ہے۔ روشنیاں جھلملا رہی ہیں کہیں بجھ نہ جائیں مگر مٹتی ہوئی تہذیبوں کے آخری جلوے بڑے تاب ناک ہوتے ہیں تخیل کی مدد سے لال قلعے کے دیوان عام تک رسائی حاصل کیجیے۔ آج رات یہاں بزم مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ خاندان تیمور کا آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر میر مجلس ہے اور اس محفل کے نورتنوں میں مومن۔ غالب۔ ذوق جیسے نامور غزل گو شامل ہیں۔ لیجیے مشاعرہ شروع ہو گیا مومن خاں مومن اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔

غزل مومن

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستمِ ناز تو دیکھو

اس بت کے لیے میں ہوس حور سے گزرا
اس عشق خوش انجام کا آغاز تو دیکھو

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح
طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھے وہ
بدنامیِ عُشاق کا اعزاز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو

غزل کا یہ مزاج یہ تہہ داری اور رندیت یہ عشق کی چھیڑ چھاڑ اور حسن کی شوخی مومن کی غزل کے علاوہ کہیں نہیں ملے گی عمر نے وفا نہ کی ورنہ یہ آواز شاید بہت دور تک گونجتی اور بہت سی دوسری آوازوں پر غالب آجاتی مگر غالب کی آواز آواز نہیں نور و نکہت تغزل اور تخیل فکر و معنی کا عظیم الشان آبشار ہے غالب نے اردو شاعری کو ذہن دیا مگر ذہن ہی کیوں پوری شخصیت دی جیتی جاگتی، ہنستی بولتی اور سب سے بڑھ کر حسرت تعمیر دی نئے خواب دیکھنے کی آرزو، ناکردہ گناہوں کی تمنا۔ اس آواز کو کون بھلا سکتا ہے۔

غزل غالب

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمک داں کئے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

باادب باملاحظہ ہوشیار! نگاہ روبرو نگاہ دار! ظلِ سبحانی صاحب قران

ثانی حضرت بہادر شاہ ظفر کا کلام بلاغت نظام سماعت فرمایئے دلی کا آخری مغل بادشاہ جو انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کا ہیرو بن گیا۔ کلام الملوک ملوک الکلام ——!

غزل ظفر

یا مجھے افسرِ شاہا نہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایا نہ بنایا ہوتا
خاک ساری کے لئے گرچہ بنایا تھا مجھے کاش خاکِ درِ جانا نہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن زلفِ مشکیں کا تری شانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے تو چراغِ درِ میخانہ نہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

زمانے نے یہ ورق بھی الٹ دیا درباروں کی داستان ختم ہوئی مگر ٹھہریئے آخری دربار دُربار تھا رام پور جہاں اس دور کے چار بڑے شاعر نغمہ سرا ہوئے امیرؔ۔ داغؔ۔ جلالؔ اور تسلیمؔ۔ ان شاعروں میں لکھنؤ اور دہلی کے رنگِ سخن گلے ملے داغؔ نے معاملہ بندی کو زبان کے چٹخارے سے پیش کیا اور مشاعروں کو لوٹ لیا۔

غزل داغؔ

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن لطفِ سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در پہ جبہ سائی کی شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھئے مے کشوں سے لطفِ شراب یہ مزا پاک باز کیا جانیں

جن کو اپنی خبر نہیں اب تک　　وہ مرے دل کا حال کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

زبان کی صفائی اور سلاست روزمرہ کی مٹھاس اور گفتگو کا سا مزہ پھر کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔ انگریزوں کا راج آیا تو مغربی ادب سے واقفیت بڑھی نظم نگاری کا چلن ہوا نئے مضامین سامنے آئے۔ لیکن نئے زمانے میں غزل کی سلاست حلاوت اور تاثیر کی بازیافت کا کام تھوڑا بہت ہوتا رہا۔ حسرت موہانی نے غزل کو پھر سے زندہ کیا۔ اور اس طرح زندہ کیا کہ قدیم اساتذہ کے رنگ سخن کی جاذبیت نکھر کر سامنے آگئی۔ حسرت نے صحت مند تصور عشق اور جیتے جاگتے ارضی محبوب کی اداؤں سے محراب غزل میں نئے سرے سے چراغ جلائے۔

غزل حسرت

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام　　دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام
حیرت غرور حسن سے شوخی سے اضطراب　　دل نے بھی ترے سیکھ لئے ہیں چلن تمام
اللہ ری جسم یار کی خوبی کہ خود بخود　　رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
دیکھو تو چشم یار کی جادو نگاہیاں　　بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام
نشو و نمائے سبزہ و گل سے بہار میں　　شادابیوں نے گھیر لیا ہے چمن تمام
اچھا ہے اہل جور کئے جائیں سختیاں　　پھیلے گی یوں ہی شورش حب وطن تمام
شیرینی نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطف سخن تمام

حسرت تنہا نہیں تھے ان کے کارواں میں اصغر۔ فانی۔ یگانہ جیسے غزل گو بھی شامل تھے۔ گو یگانہ تو خود اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ان میں کوئی مقلد نہیں تھا مجدد؟ شاید ہو! ان میں ہر ایک کی آواز میں ایک نرالی تھرتھراہٹ ایک نیا ارتعاش تھا۔ اصغر

گو نڈوی صوفی تھے مگر ان کی آواز بھی اس نرالے پن سے خالی نہیں۔ ان کے ہاں حسن حقیقی بھی حسن مجازی کی سی کیفیت اور ادا رکھتا ہے اور ان کی غزل اسی کے جلوہ تابناک سے مزین ہے۔

غزل اصغر

گزر گئی ترے رندوں پہ وہ بھی تیرہ شبی
یہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی

یہ زندگی ہے یہی اصلِ علم و حکمت ہے
جمالِ دوست و شبِ ماہ و بادہ عنبی

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادائے رسمِ بلالی و طرزِ بولہبی

ہجومِ غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا
کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی

سرشتِ عشق طلب اور حسن بے پایاں
حصولِ تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی

وہیں سے عشق نے بھی سورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لئے خندہ ہائے زیرلبی

کشش نہ جام نگاریں کی پوچھ اے ساقی
جھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

گزر گئی ترے رندوں پہ وہ بھی تیرہ شبی ــــــ مگر کچھ رند ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تیرہ راتیں کبھی نہیں گزرتیں۔ اور وہ انھیں راتوں کی تیرگی کو زندگی بنا لیتے ہیں۔ فانی کی غزل اسی تیرہ شبی کی داستان ہے جو شاعر کی زندگی پر محیط رہی ہے۔ فانی کی آواز عرفانِ غم سے بوجھل ہے۔ اسی میں درد آشنائی ہی نہیں غم کو زندگی بنا لینے کی سمائی بھی ہے اسی لیے ان کے دل کا درد نغمے میں ڈھل کر جاوداں ہو گیا ہے۔

غزل فانی

ہو نا رہتا ہے مگر کوئی دل میں جہاں کو دور
اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور

میں در خور نگہ گرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور

پوچھے ہیں اور کوئی دیتا نہیں جواب
کس کی ہوا فنا ہے دسترسِ امتحاں سے دور

آنکھیں چرا کے آپ نے افسانہ کر دیا
جو حال تھا زباں سے قریب اور بیاں سے دور

ہے منع راہِ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
رہتی کہاں کسے پاس ہے منزل، کہاں سے دور

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

یاس یگانہ چنگیزی نہ یاس تھے۔ نہ چنگیزی۔ ہاں یگانہ ضرور تھے۔ اور ان کی غزل کا یہی انوکھا البیلا پن ان کی متاع بے بہا ہے۔ یگانہ کی کلاہ ہمیشہ کج رہی زمانے سے انھوں نے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اور کبھی ہتھیار نہیں ڈالے ان کی غزل اسی بانکپن کی نظیر ہے وہ بانکپن جو آتش کی میراث تھا۔ یگانہ نے کامیابی سے برتا اور ان کی غزل ان کی ہر شکست کو کامرانی میں بدل دیا۔

غزل یگانہ

چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا
دلیلِ راہ محبت ہے فیصلہ دل کا

ہوائے کوچۂ قاتل سے بس نہیں چلتا
کشاں کشاں لئے جاتا ہے ولولہ دل کا

گلہ کسے ہے کہ قاتل نے نیم جاں چھوڑا
تڑپ تڑپ کے نکالوں گا حوصلہ دل کا

خدا بچائے کہ نازک ہے ان میں ایک سے ایک
تنک مزاجوں سے ٹھہرا ہے معاملہ دل کا

دکھا رہا ہے یہ دونوں جہاں کی کیفیت
کرے گا ساغرِ جم کیا مقابلہ دل کا

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

پیالہ خالی اٹھا کر لگا لیا منہ سے
کہ یاس کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

اور اب زمانۂ حال کے غزل گو شعراء کے قافلے سالار حضرت جگر مرادآبادی ہجر و فراق کا مغنی عشق کے کیف اضطراب کا مطرب، سرمستی، رندی، آزادروی اور عالم گیر محبت کا پیغامبر، جس کی غزلوں کے ہر حرف میں ترنم اور موسیقی کروٹ لیتی ہے۔ وہ آیا۔ اس نے دیکھا اور اس

نے فتح کرلیا۔

غزل جگرؔ

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

میں شکوہ بہ لب تھا مجھے یہ بھی نہ رہا یاد
شاید کہ مرے بھولنے والے نے کیا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرم نوازش
اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

ہاں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجیے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

نئے دور میں غزل کے سنگیت نے نئے طرز اختیار کیے۔ متعدد نظم نگار شاعروں نے غزل کی طرف بھی توجہ کی۔ حالیؔ سے لے۔ اکبرؔ۔ اقبالؔ چکبستؔ اور اخترؔ شیرانی تک لاتعداد شاعروں نے غزلیں لکھیں۔ اور خراجِ تحسین وصول کیا۔ مگر نوجوانوں کے دلوں پر اسرار الحق مجازؔ کی غزلوں نے اس طرح سکہ بٹھایا کہ آج وہ نقش قائم ہے۔ مجازؔ نے اپنے آپ کو "شاعرِ محفل وفا مطربِ بزمِ دیراں" کہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مجازؔ کی غزلوں میں جوانی کا بانکپن اور عہد جدید کی صبر آزما حقیقتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ نرالے ڈھنگ سے جلوہ گر ہوا ہے۔

غزل مجازؔ

خلشِ شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

ناصحے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکرِ بیش و کم نہیں ہے

مری بربادیوں کا ہم نشینوں — تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے
ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں — ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے
بہ ایں سیلِ غمِ و سیلِ حوادث — مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجازؔ ایک بادہ کش تو ہے یقیناً
جو ہم سنتے تھے وہ عالم نہیں ہے

اس طرح غزل کا کارواں افسانہ و افسوں حقیقت اور زندگی کی دھوپ چھاؤں میں سفر کرتا اپنی موجودہ منزل تک پہنچا ہے۔ اس میں شاخِ گل کی لچک بھی ہے اور تلوار کی خاراشگافی بھی۔ اس میں عارض و لب کی حکایتیں بھی ہیں اور دار و رسن کے تذکرے بھی، اس میں زمانے کی درہمی کے شکوے بھی ہیں اور زلفِ گیتی سنوارنے کے ارمان بھی۔ فکر و فلسفہ بھی ہے اور وطن دوستی اور آزادی کا ولولہ بھی۔ آیئے شعر و سخن کے اس کارواں سے رخصت ہوتے وقت آزاد کے الفاظ میں ان تمام سخن وروں کو یاد کریں جنھوں نے اس عظیم الشان روایت کی تشکیل و تربیت میں حصہ لیا۔ اور جن کے خونِ جگر سے بزمِ ادب کے چراغ روشن ہوئے۔ "اے ہمارے رہنماؤ! تم کیسے مبارک قدموں سے چلے تھے اور کیسے برکت والے ہاتھوں سے رستے میں چراغ رکھتے گئے تھے کہ جہاں تک ہم آگے جاتے ہیں تمھاری ہی روشنی میں جاتے ہیں۔ ذرا ان برکت والے قدموں کو آگے بڑھاؤ کہ ہم آنکھوں سے لگائیں۔ اپنا مبارک ہاتھ ہمارے سر پر رکھو اور ہمارے سلام کا تحفہ قبول کرو۔"

■■

آئینۂ تضمین

پروفیسر طالب کاشمیری "آئینۂ تضمین" کے نام سے فنِ تضمین اور اس کے محاسن پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس میں وہ نمونے کے طور پر مشہور شعرائے جدید و قدیم کی تضمینوں کا ایک گلدستہ بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ان شعرا حضرات سے جنھوں نے اس صنعتِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے استدعا ہے کہ وہ اپنی دو چیدہ تضمینیں ذیل کے پتے پر ارسال کریں۔

پتہ: پروفیسر طالب کاشمیری، گورنمنٹ کالج [illegible]

آنند نرائن ملا

غزل

دیکھا کچھ آج یوں کسی غفلت شعار نے
میں اپنی عمر رفتہ کو دوڑا پکارنے

ہنگامۂ شباب کی پوچھو نہ سرگزشت
اپنے چمن کو لوٹ لیا خود بہار نے

پیکان تیر زہر میں اتنے بجھے نہ تھے
کچھ اور کر دیا ہے نظر کو خمار نے

تمت بخیر دل کی شکایت کی داستاں
ہونٹوں کو سی دیا نگہِ شرمسار نے

ہمت پڑی نہ شیخ سے کہنے کی محتسب
آئے ہوا اک غریب پہ غصہ اتارنے

وہ تو کہو کہ آئی قفس تک بھی بوئے گل
ورنہ بھلا دیا تھا ہمیں تو بہار نے

جو ننگ گل تھے طرہ دستار بن گئے
جو گل تھے آئے تربت بیکس سنوارنے

لے آئے ہو کیا تمہیں مجھے آواز دو ذرا
آنکھوں کا نور چھین لیا انتظار نے

آلام روزگار سے ملا کو کیا غرض
اپنا بنا لیا ہے اسے چشم یار نے

یہ نظم آنند نرائن ملا کے نئے شعری مجموعے "میری حدیث عمر گریزاں" سے لی گئی۔ اس کتاب میں ملا صاحب کے پہلے دونوں شعری مجموعے "جوئے شیر" اور "کچھ ذرے کچھ تارے" کا انتخاب اور کچھ تازہ کلام شامل ہے
سائز ۱۸×۲۲ صفحات ۳۶۰۔ مجلد مع خوب صورت گردپوش
قیمت ۱۰/۵۰

حمید کاشمیری

مکان

اس مکان کے مل جانے پر میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو نہیں آئے البتہ مجھے اپنی قسمت پر رشک ضرور آنے لگا۔ رشک کیسے نہ آتا۔ جو مشکلات مجھے یہ مکان حاصل کرنے سے پہلے پیش آئی تھیں ان کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ سال بھر تو میرا عجیب و غریب قسم کے دلالوں سے سابقہ پڑتا رہا۔ سینکڑوں پیالیاں چائے کی پلائیں اور ہزاروں سگریٹ اس کے بدلے میں انھوں نے مجھے بیسوں مکان دکھائے اور پچاسوں ناکامیاں۔ مکان کوئی ڈھنگ کا ملا نہیں۔ اگر ملا تو دام ہیبت ناک۔ یہ مکان جس کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اگر کسی اور مقام پر واقع ہوتا تو ممکن ہے میں اسے باہر سے دیکھ کر ہی واپس چلا جاتا کیوں کہ اس کی چھت کھپریل کی تھی اور دیکھنے میں نہایت ہی خستہ معلوم ہوتی تھی لیکن خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ ایسی سڑک پر واقع ہے جسے ہم شہر کا دل کہتے ہیں۔ جس پر سے آدمی فخر کے ساتھ گزرتا ہے جو بڑے بڑے مہمانوں کی آمد پر سال میں کئی بار دلہن کی طرح سجائی جاتی ہے اور لوگ خوش آمدید کہنے کے لیے دن دن دو رویہ قطاروں میں کھڑے آنے والوں کا انتظار کرتے ہیں اور یہ شہر تو پاکستان کا دل ہے ہی، اس میں آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لہٰذا میں نے مکان کو اندر سے دیکھ لینا بھی مناسب سمجھا اور جب اندر سے دیکھا تو دل کے کنول کھل گئے اور شکر کیا کہ کہیں نیچے سے ہی دیکھ کر واپس نہ چلا گیا۔

اس وقت اس مکان میں ایک ریٹائرڈ جج صاحب رہتے تھے۔ جنھوں نے اسے بڑے اہتمام سے سجا رکھا تھا۔ اگرچہ اس کے تینوں کمرے آگے پیچھے تھے تاہم بہت بڑے تھے اور چوں کہ رخ مغربی سمت تھا اس لیے اندر کمروں میں ہوا اتنی تیز تھی کہ کھڑکیوں میں ٹنگے ہوئے پردے تو کیا، سر کے بال تک اڑنے لگتے۔ ایسا ہوا دار اور اتنا بڑا فلیٹ اس سڑک پر مشکل ہی سے مل سکتا تھا اور پھر طرہ یہ کہ اتنی گنجان آبادی میں الگ تھلگ

نیچے ایک بڑی قالین کی دکان تھی اور اوپر یہ تنہا فلیٹ ہوادار اور بڑے وارا مکان تو مجھے پسند آگیا مگر اب پگڑی سننے کی ہمت نہ تھی اور جب سُنی تو ہمت بھی پیدا ہوگئی۔ قیمت اتنی کم کہ میں اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ دلال نے مجھ سے کہا، یہ تو جج صاحب نے محض اپنی لاگت مانگی ہے اور بات بھی ٹھیک تھی۔ اتنی قیمت پر دور دراز کے معمولی گھٹیا اور تنگ فلیٹ بھی نہیں مل سکتے تھے۔ میں نے مزید انتظار خود کیا نہ ریٹائرڈ جج صاحب کو کرنے دیا اور نہ دلال کو۔ بس جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔ ادھر مکان دیکھا ادھر سودا کرلیا۔ جج صاحب کی صرف ایک خواہش تھی کہ مکان لینے والی پارٹی شریف ہو۔ یعنی ہم لوگ شریف ہوں تاکہ بعد میں مالک مکان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔ میں نے اپنی شرافت کا یقین دلایا اور ذمہ داری دلال نے لی جو سودا کر رہا تھا جج صاحب کو اطمینان ہوگیا۔ پھر میں نے ویسے ہی ان سے مکان چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ وہ حج کو جا رہے ہیں اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں ہی رہیں گے۔ پھر ہم مکان میں داخل ہوگئے اور جج صاحب جو حج کو جا رہے تھے خارج۔ ان کا سامان دو گاڑیوں میں لادا گیا لیکن ہم نے جو دعائیں انھیں دی تھیں وہ دس گاڑیوں میں بھی نہیں سما سکتی تھیں۔ میری بیوی کہنے لگیں ـــــ "پرانے زمانے کی شرافت اب بھی دنیا میں باقی ہے" اور میں نے تائید کی۔ بہرحال جج صاحب چلے گئے۔ لیکن اپنی شرافت کا سکہ ہمارے دلوں پر بٹھا گئے۔

ہم جب اپنا سامان وغیرہ پوری طرح قرینے سے لگا کر اس گھر میں خوش و خرم طریقے سے آباد ہوگئے تو اس وقت محسوس ہوا کہ مکان کے پچھلے کمرے میں روشنی نہیں آتی ہم نے روشنی کی خاطر برابر والی کھڑکیاں کھولنی چاہیں لیکن وہ بہت سخت جام ہوگئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب سے مکان بنا ہے کھڑکیاں بند ہیں بڑی مشکل سے ہتھوڑے مار مار کے کھڑکی کھولی اس ے کھلتے ہی روشنی تو خیر جو آئی سو آئی لیکن بدبو کے جھکڑ سے چلنے لگے اور مچھروں کی بوچھار ن گری۔ ایک دم ناک سڑنے لگی اور بیوی کی طبیعت بری طرح متلانے لگی۔ میں نے لدی سے کھڑکی بند کردی اور اوپر سے ہتھوڑے مار مار کے درزیں بٹھا دیں۔

میری بیوی نے جج صاحب کو جو حج پر گئے ہوئے تھے چند بڑے ہی سنگین کلمات سے یاد کرکے ان کی شرافت کے بت کو توڑنے کی کوشش کی لیکن میں نے جج صاحب کی

وکالت کرکے وقتی طور پر اس مجھے کو لوٹنے سے بچا لیا۔ میں نے بیوی کو قائل کر لیا کہ آخر اس میں جج صاحب کا کیا قصور ہے بدلوا اور مجھ باہر سے آئے ہیں۔ کیوں نہ دیکھ لیا جائے کہ اس کے اسباب کیا ہیں؟ پچھلی طرف جو صحن تھا اس کے باہر والے دروازے سے صرف بھنگی آیا جایا کرتا تھا۔ ہم نے اس دروازے کو کھول کر حالات معلوم کرنے چاہے۔ لیکن وہ دروازہ انتہائی تاریک اور گندی گلی میں کھلتا تھا۔ اس لیے ہم نے اسے پھر بند کر دیا اور بھنگی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ بھنگی آیا تو اس نے بتایا کہ اس گلی میں کبھی کسی آدم زاد کا گزر نہیں ہوا اور اس میں صدیوں کی غلاظت اور گندگی کے انبار پڑے سڑ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے فلیٹ سے جو استعمال کا پانی باہر جاتا ہے وہ بھی اس گلی میں گرتا ہے اور نیچے گٹر کا کوئی انتظام نہیں۔ گٹر کا مسئلہ تو خیر دوسرا تھا۔ پہلا مسئلہ جو ہمیں درپیش تھا وہ پانی کا تھا جس کے لیے گٹر کی ضرورت محسوس ہوتی۔

جج صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ مکان میں پانی نہیں ہے لیکن ہم نے مکان کے محل وقوع کے پیش نظر اسے بغیر پانی کے ہی قبول کر لیا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ جس طرح جج صاحب گزارا کرتے رہے ہیں اسی طرح ہم بھی کر لیا کریں گے۔ جج صاحب کیسے گزارا کرتے تھے۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ بھنگی نے بتایا کہ وہ صرف دو میاں بیوی تھے اور چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بالٹی پانی کی استعمال کرتے تھے اور یہ بالٹی جج صاحب صبح پانچ بجے سامنے والے کمپاؤنڈ سے بھر کر لے آتے تھے اور جب کبھی غسل کرنا ہوتا دو بالٹیاں لے آتے تھے لیکن ہمیں تو ایک ٹنکی پانی کی روز درکار تھی اس سلسلے میں جب ہم نے ماشکیوں سے رجوع کیا تو وہ صاف انکار کر گئے۔ دراصل ہمارے فلیٹ میں پانی بھرنے کے لیے انھیں بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ ایک تو تینوں طرف سے باہر کا برآمدہ طے کرنا پڑتا اور تین کمرے عبور کر کے پچھلی طرف غسل خانہ آتا تھا۔ جس میں پانی ڈالا جاتا۔ غور سے دیکھنے پر ان تینوں کمروں کی طوالت ایک ریل گاڑی کی سی لگتی تھی لہٰذا کوئی بھی ماشکی پانی بھرنے کے لیے تیار نہ ہوا اور ہمیں بیٹھے بٹھائے جج صاحب بن گیا یعنی صبح پانچ بجے اٹھ کے سامنے والے کمپاؤنڈ کے نلکے سے پانی کی بالٹیاں بھر کر لانا پڑا۔ ایک ہفتہ لگا تار یہ مشق کرنے سے محسوس ہوا کہ مجھے دمے کی بیماری ہو گئی ہے

اور اگر نہیں ہوئی تو ہونے والی ضرور ہے۔ اُس دن پھر میں نے ماشکوں کی منت سماجت کی۔ آخر کار ایک ماشکی کو مجھ پر ترس آ گیا وہ آٹھ آنے فی مشک دینے پر راضی ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے صدیوں کا لدا ہوا بوجھ سر سے نیچے اتار دیا ہو۔

پانی کا مسئلہ حل ہوا تو ایک ہفتے بعد یہ انوکھی بات محسوس ہوئی کہ جب ہم چلتے ہیں تو مکان ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل جاتا ہے یعنی اس طرح جیسے کوئی ہلکا ہلکا زلزلہ آ رہا ہو۔ یہ بات میں نے پہلے بھی محسوس کی تھی لیکن شدت سے اس لیے نہیں کی کہ ایک تو پانی کی مشکل حل کرنی تھی۔ دوسرے جس دن ہم نے بند کھڑکی کھولی تھی اس دن بدبو کے ساتھ مچھروں کا ایک جم غفیر اندر گھس آیا تھا اور اس دوران میں ہم پانی کا مسئلہ حل کرنے اور مچھر مارنے کی طرف مصروف رہے تھے خیر مچھر تو کسی حد تک ختم ہو گئے اس لیے کہ اوپر ہوا بہت چلتی تھی اور پانی کے لیے ماشکی کا خدا بھلا کرے اچھا ہے اٹھنی مشک ہی پر رضامند ہوا، ہوا تو سہی۔ لیکن اب مکان کے لرزنے سے ہمارے دل بھی لرزنے لگے۔ مرد تو خیر حوصلہ کر ہی لیتے ہیں لیکن بیوی کا یہ عالم تھا کہ دن میں بیس بیس مرتبہ بہ آواز بلند کلمہ پڑھتی۔ میں نے کہا چلو یہ بھی اچھا ہے۔ اسی بہانے خدا اور رسول کو تو یاد کرتی ہیں۔ اس پر وہ چڑھ گئیں اور ان کی بجائے جج صاحب کو سو تروں سے یاد کرنے لگیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ بیوی نے جج صاحب کی شرافت کے مجسمے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ میں نے کبھی جج صاحب کی وکالت کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ کسی حد تک بیوی کا ہی ہاتھ بٹھانے لگا۔ اب چوبیس گھنٹے ہمیں بلڈنگ لرزتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ مالک مکان کی حالت مکان سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ بلدیہ سے رجوع کرتے تو مکان کو خطرناک قرار دے دیا جاتا اور ہمیں خالی کرنے کا نوٹس مل جاتا اور ساری رقم ڈوب جاتی لہٰذا مجبور ہو کر صبر کر لیا اور فرش جو پاؤں کے نیچے تھا اس کا خطرہ سر پر سوار ہو گیا۔ خطرہ کا مقابلہ کرنے کی تاب تو تھی نہیں لہٰذا میں نے پھر دلالوں سے رابطہ قائم کر لیا اور ایک آدھ پارٹی خبر سن کر میرا مکان دیکھنے کے لیے آنے لگی لیکن مکان کم دیکھتی اور باہر بالکونی میں ٹھہر کر مجھے بازو قوس سڑک کا نظارہ زیادہ کرتی جو ہمیں کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے کہ مکان کی اصلیت جاننے کے بعد نظارے میں ہمارے لیے کوئی دلچسپی ہی نہیں

رہی تھی۔

اس طرح کئی پارٹیاں آئیں لیکن تھوڑی دیر بالکونی سے نظارہ دیکھ کر چلی گئیں۔ دلال جس نے یہ مکان دلوایا تھا اب پارٹیاں لانے میں بہت سرگرمی دکھا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے مکان فروخت کرنے کی وجہ تک نہ پوچھی۔ البتہ لوگوں کے سامنے مکان کی تعریف اسی انداز سے کرتا تھا جس طرح خریدنے سے پہلے میرے سامنے کیا کرتا تھا۔ ہم مکان فروخت کرنے کی کوشش میں معروف ہی تھے کہ ایک دردناک خبر ملی یہ کہ ہمارا پانی بھرنے والا ماشکی مر گیا ہے۔ ہم نے ماشکی کے مرنے کا یوں افسوس کیا جیسے وہ کوئی ہمارا عزیز ہو۔ یہ بھی ہماری خودغرضی کی علامت تھی۔ اس کے بعد کوئی ماشکی ہمارے گھر میں ایک روپیہ فی مشک کے حساب سے پانی لانے کو تیار نہ ہوا۔ ماشکیوں کا خیال تھا کہ مرنے والا ماشکی دمے کا مریض ہو کر مرا ہے اور یہ دمہ اسے ہماری سیڑھیاں چڑھنے میں برآمدے کا چکر کاٹنے اور فلیٹ کے ریل نما کمرے عبور کرنے سے ہوا ہے واللہ اعلم یہ کہاں تک سچ ہے لیکن ہمیں کوئی پانی ڈالنے والا نہیں ملا۔ ہم بوند بوند پانی کو ترسنے لگے۔ اور ترس ہی رہے تھے کہ خدا نے سن لی اور گھر کے اندر پانی ہی پانی ہو گیا۔

قریباً نصف رات ہو گی کہ ساون کی پہلی جھڑی شروع ہو گئی۔ چھت نے جگہ جگہ سے ٹپکنا شروع کر دیا اور سامان بھیگنے لگا۔ ہم سامان کو بچاتے، ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے۔ جہاں کہیں ٹپکنے کے آثار ہوتے لیکن کہاں تک۔ تھوڑی ہی دیر میں فلیٹ کے اندر چھ چھ انچ پانی جمع ہو گیا! پہلے تو چھت ٹپک رہی تھی، اب پرنالے چلنے لگے جہاں تک چادریں وغیرہ ڈال کے سامان کو بچایا جا سکتا تھا۔ ہم نے اسے بچانے کی کوشش کی، لیکن سب بے کار، آخر ناامید ہو کر کوشش ہی ترک کر دی۔ ہمیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ باہر گھپ اندھیری رات میں بجلی زور زور سے چمک رہی تھی، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور ہم اندر سکڑتے سکڑتے درمیان والے کمرے میں ایک چارپائی پر سمٹ کے بیٹھ گئے تھے۔ پانی باہر کم اور اندر زیادہ برس رہا تھا۔ تمام کمرے تالاب کی طرح بھر گئے تھے۔ صرف یہی ایک چارپائی کسی حد تک محفوظ تھی جہاں پانی نسبتاً کم ٹپک رہا تھا۔ اس رات ہمارے گھر میں پانی اتنا تھا کہ سب اگلی بجلی کسر میں

نکل گئیں۔ پانی کی قلت کا مسئلہ فوراً ختم ہو گیا۔ ہم نے ماشکی کو بھلا دیا۔ اور اللہ کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ بیوی زور زور سے کلمہ پڑھ رہی تھیں۔ اور چڑچڑے پن سے جج صاحب کے عزیزوں تک کو نام لے کر یاد کرنا شروع کر دیا۔ میں نے خطرے کو جب بہت زیادہ قریب دیکھا تو پھر وہ بدبو والی کھڑکیاں کھول دیں اور پانی کی کڑاہیاں بھر بھر کے کھڑکیوں سے باہر پھینکنے لگا۔ اس وقت ہمیں بدبو، سڑاند اور مچھروں کا قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ تمام رات میں نے پانی باہر پھینکتے ہوئے اور بیوی نے جج صاحب کو خطابات پیش کرتے ہوئے گزاری۔

صبح بارش تھمی اور دھوپ نکل آئی تو ہم نے بھنگی کو بلوا کر سارا مکان صاف کروایا اور پھر کئی روز تک گھر کے سامان کو دھوپ میں رکھ کر سکھاتے رہے۔ اس عرصہ میں مکان کی اندر سے یہ حالت ہو گئی تھی کہ آسیب زدہ معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا ہمارے موقع شناس دلال نے جو اپنے پیشے میں ثانی نہیں رکھتا تھا، اس دوران میں کسی پارٹی کو مکان دیکھنے کی دعوت نہیں دی۔ میں نے دل پہ ضبط کر کے کچھ رقم اور خرچ کر ڈالی اور مکان کی اندر سے بہت اچھی ٹیپ ٹاپ کرادی۔ اس طرح کہ ٹپکنے کا ایک نشان بھی کہیں چھت یا دیوار پر باقی نہ رہا۔

ایک دن دلال نے بڑے وثوق سے کہا کہ اب جو پارٹی آئے گی وہ سو فیصدی خریدنے والی ہوگی۔ میں نے کہا، ایسی پارٹی کو لانے کا ایک دن مقرر کر لو۔ دلال نے دن مقرر کر لیا اور میں نے پارٹی کی آمد سے ایک دن پیشتر ہی تینوں کمروں کو رئیسانہ طریقہ سے سجا دیا۔ چاروں طرف کھڑکیوں اور دروازوں پر خوب صورت ریشمی پردے ڈال دیئے اور جب پارٹی جو ایک آدمی پر مشتمل تھی، ہمارا مکان دیکھنے آئی تو ہمارے گھر کی فضا بڑی پر وقار معلوم ہو رہی تھی۔ ہم نے دلھن کی طرح سجے ہوئے تینوں کمروں میں اگربتیاں سلگا رکھی تھیں اور سنگھار میز پر رکھی ہوئی عطر کی شیشی نہ جانے کیسے الٹ گئی تھی کہ ہلکی ہلکی خوشبو تمام کمروں میں پھیل رہی تھی۔ پارٹی اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے مکان کو نہایت ہی سرسری طریقے سے دیکھا جیسے کوئی گاہک معمولی سبزی ترکاری کو دیکھتا ہے۔ ہم لوگ پارٹی کے ساتھ باہر کے برآمدے میں بیٹھ گئے اور نہایت دوستانہ ماحول میں گفتگو ہونے لگی۔ اسی گفتگو میں مکان کا سودہ

بھی ہوگئی اور پارٹی نے بیعانہ دے دیا۔ سودا میری لاگت سے اوپر ہی ہوا تھا لیکن دلال اس وقت میری وکالت کر رہا تھا اور بڑے اعتماد کے ساتھ پارٹی کو یقین دلا رہا تھا کہ ہم نے منافع نہیں لیا بلکہ صرف اپنی لاگت پر سودا کیا ہے نیز یہ کہ ہمیں منافع سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ پارٹی شریف ہو تاکہ آئندہ مالک مکان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے جواب میں پارٹی نے اپنی شرافت کا یقین دلایا اور دلال نے حسب معمول ذمہ داری لی۔ میں بھی جج صاحب کی طرح مطمئن ہوگیا۔ پھر پارٹی نے مجھ سے مکان چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا "حج کو جا رہے ہیں اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں ہی رہنے کا ارادہ ہے۔" ہماری یہ گفتگو جس دوستانہ ماحول میں شروع ہوئی تھی اسی میں ختم ہوگئی۔۔۔ جاتی دفعہ ہم نے پارٹی سے مکان خالی کرنے کے لیے چار دن کی مہلت مانگ لی۔

چوتھے دن صبح جب ہمارا سامان جا چکا تھا اور مکان کو ہم نے اس طرح صاف کرایا جیسے وہ چٹیل میدان ہو۔ خیر خریدار بھی آگیا اور دلال کے روبرو اس نے بقایا تمام رقم ادا کردی۔ ہم مصافحہ کرکے رخصت ہوگئے۔ اس وقت ہم بہت اداس تھے اور خریدار ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ میری بیوی اس بات سے بہت متاثر ہوئیں۔ چلتے چلتے کہنے لگیں "کتنا شریف آدمی ہے ؟"

میں نے کہا "جی ہاں، آئندہ سال یہ بھی حج کو جائے گا اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں آکر اترے گا۔"

(بشکریہ "شاہ کار"، الہ آباد)

مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والے کچھ افسانوں کے مجموعے

پندرہ اور دوسرے افسانے	بیگم آصف مجیب	۱/۵۰	خیالستان	سید سجاد حیدر یلدرم	۲/۷۵
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۲/۷۵	دیا جلے ساری رات	خواجہ احمد عباس	۲/۵۰
دو ہاتھ	عصمت چغتائی	۲/۵۰	سپنوں کا قیدی	کرشن چندر	۳/-
کالے صاحب	اوپندر ناتھ اشک	۲/۵۰	کیمیاگر	پروفیسر محمد مجیب	۲/-
نروان	جیلانی بانو	۲/۷۵	نئی بیماری	مہندر ناتھ	۲/۵۰
واردات	منشی پریم چند	۲/۵۰			

شرابِ کہنہ

آبرو

متوفی ۱۷۵۰ء

نجم الدین، نام۔ شاہ مبارک، لقب۔ آبرو تخلص۔ گوالیار میں پیدا ہوئے، شاہ محمد غوث گوالیاریؒ جو اپنے وقت کے ایک صاحبِ طریقت بزرگ گزرے ہیں ان سے بہت قریب کا واسطہ تھا۔

جوانی میں دلی آ گئے (کچھ دنوں نارنول میں بھی رہے تھے) شاعری کی ابتدا اور شہرت و استادی کا مرتبہ سب کچھ دلی ہی میں رہ کر حاصل کیا، پچاس برس سے زیادہ کی عمر پا کر یہیں وفات پائی۔

پختہ کار اور مشاق ہونے کے باوجود سراج الدین علی خاں آرزو کو اپنا کلا دکھایا کرتے تھے۔ عربی کی صرف و نحو اور علمی مسائل سے واقف اور آشنا تھے ان کی زندگی میں اور مرنے کے بعد ہر ایک ان کی استادی کا قائل رہا۔ یہ بات بھی غلط نہیں کہ دلی میں اردو شاعری کی بنیاد ڈالنے یا ان کا باقاعدہ آغاز کرنے والے اساتذہ اور بزرگوں میں آبرو کا نام سرِ فہرست ہے۔

تین باتیں آبرو سے متعلق اور بھی ہیں جن کا ذکر کم و بیش ہر تذکرہ نگار نے کیا۔ ۱؎ وہ ایک آنکھ سے معذور تھے ۲؎ مرزا مظہر جان جاناں سے چشمکیں ۳؎ میر لکھ پاک باز سے غیر معمولی اُنس اور اُس کا طرح طرح سے اظہار۔ آبرو کا اصل اور مکمل دیوان ۱۸۵۷ء کے معرکے میں تلف ہو گیا۔ ایک مختصر سا دیوان کہیں کہیں مل جا ہے جو بقول حکیم عبدالحی مولف گلِ رعنا "شاید اسی کا انتخاب ہو"

۱؎ ۱۱۴۶ھ مطابق ۱۷۳۳ء قاضی عبدالودود

اُردو کے چند قدیم اور ایہام گو شعراء میں آبرو کی حیثیت نمایاں ہے۔ ایہام کے علاوہ ان کے یہاں عجیب و غریب تشبیہیں، نامانوس الفاظ، بے جوڑ قافیے اور لفظی رعایتوں کی کثرت۔ اس بنا پر اگر ایک طرف ان کے شعر بے لطف اور غیر دلچسپ نظر آتے ہیں تو دوسری طرف انداز و بیان میں شیرینی و شگفتگی یا محاورں کی چاشنی کی بدولت بہت سے شعروں میں لطف کا سامان بھی موجود ہے۔

انتخاب

دل تو دیکھو آدم بے باک کا — عشق سے پتلا بھرا ہے خاک کا

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیے — کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری سو جگ بیتا

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی — ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا

یہ سبزہ، یہ آب رواں اور ابر یہ گہرا — دیوانہ نہیں گھر میں رہوں چھوڑ کے صحرا

آیا ہے صبح نیند سے اٹھ رسمسا ہوا — جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا
کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگ زرد — سونا وہ ہے جو ہووے کسوٹی کسا ہوا
انداز میں زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں — جو خال اپنی حد سے بڑھا سو مسا ہوا

رخسار کے گل اوپر شبنم ہے یا پسینا — یا لال پر جڑا ہے الماس کا نگینا

حق میں عاشق کے مگر لطف ستم تھا یار — دل دیا جب سے مجھے تب سے تی آزار دیا

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی — اس دل بے قرار کی صورت

نہ تھا کچھ اور مجھے شوق کا حسن و صفا باعث
یہی پیاری طرح موجب یہی کافر ادا باعث

مجلس رنداں میں مت لے جا دلِ بے شوق کو
شیشۂ خالی کی کیا عزت ہے مے خواروں کے بیچ

کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو
مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح

جلتا ہے اب تلک ترے مکھڑے کے رشک سے
ہر چند ہو گیا ہے چمن کا چراغ گل

نکلے تم آ، صبا کی طرح، جب چمن میں کھل
گلشن کے دیکھ تجھ کو گئے ہاتھ پانوں پھول

حسن ہے یہ خوب رویوں میں وفا کی خو نہیں
پھول ہیں یہ سب پر ان پھولوں میں ہرگز بو نہیں

یار ہے غافل مرے درد سے بیدار کرو
بے خبر جان، نہ جا جا کے خبردار کرو

دل کب آوارگی کو بھولا ہے
خاک گر ہو گیا، بگولا ہے

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتیں
جب رو برو ہو تیرے گفتار بھول جاوے

کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد
روح پتھر سے سر پٹکتی ہے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے
وہ عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

نئی مطبوعات

جامعہ کا طریقہ (طریقۂ تعلیم) عبدالغفار مدہولی ۲/۵۰ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی [۲۹]
بچوں کی دنیا (نظم) تلوک چند محروم ۲/۰ ایجنسی: 〃 〃 〃 〃
نغمہ سرور (منظوم ترجمہ) عرش ملسیانی ۵/- ناشر: مکتبہ تصنیف و تالیف، نکودر
لمعات آفاق (مجموعہ کلام) مرتبہ منور لکھنوی ۱۰/- 〃 ادبی کتاب گھر، دہلی
ماتم نہرو (نظم) جگن ناتھ آزاد -/۵۰ 〃 دہلی کتاب گھر، دہلی
صوفیہ (ناول) اے۔ آر۔ خاتون ۵/۵۰ 〃 تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی
پھول اور کانٹے (نظم) موہنی زتشی ۱/۵۰ 〃 موہنی پرکاشن، لکھنؤ
لعل و جواہر (نظم) مرتبہ ساجد صدیقی و والی آسی ۲/۵۰ 〃 مکتبہ دین و ادب، لکھنؤ
صہبائے حرم (مجموعہ نعت) ساجد صدیقی ۱/- 〃 〃 〃 〃
ترنم (ناول) زبیدہ خاتون ۵/- 〃 آئینۂ ادب، لکھنؤ
بنیادی اسالیب بیان (ادب) عزیز احمد قاسمی ۱/۵۰ 〃 کمال بک ڈپو، دیوبند
ضرب آتشیں (مجموعہ کلام) قمر ساحری پتہ ۱۳۴ نیو بلڈنگ، حیدرآباد [۲]
شعر پہ شوشہ (غالب کے اشعار پر کارٹون) وہاب حیدر ۱/۵۰ ناشر: عباس سورتی، بمبئی
یادِ جگر (غیر مطبوعہ کلام) مرتبہ محمد اسلام ایم اے ۲/- 〃 دانش محل، لکھنؤ
پارہ الم (منظوم ترجمہ) کیف بھوپالی ۳/- 〃 معراج پبلیکیشنز، وارانسی

زیر طبع

آفاقی ادب (تنقید) سید ابراہیم خلیل لٹریری سرکل زمستان پور، حیدرآباد [۲۰]
آئینہ گیتی (مجموعہ کلام) 〃 〃 〃 〃 〃 〃
ایک خواب اور (〃) سردار جعفری ۶/- حلقہ ادب، بمبئی
چائے کے باغ (ناولٹ) قرۃ العین حیدر ۱/۷۵ 〃 〃 〃
گلابی (مجموعہ کلام) عنوان چشتی نیو تاج آفس، دہلی
سلگتی آرزو (ناول) عبدالواحد خاں یکتا نیو سلور بک ڈپو، بمبئی [۲]

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

لکھنؤ کی پانچ راتیں

(سن طباعت جولائی ۱۹۶۴ء)

از: سردار جعفری
صفحات ۲۰۵ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت: ۳ روپے ۵۰ پیسے
ناشر: مکتبہ میرا اینڈ کمپنی، جامع مسجد دہلی ۶

اردو ادب سماج کی عکاسی میں کوشاں ضرور ہے، لیکن خود عکاس کی اُن ذہنی اور سماجی کیفیتوں کی نشان دہی سے ابھی دور ہے، جو اس عکس میں رنگ و آہنگ پیدا کرتی ہیں تنقید کا پرانا ڈھنگ اور خالص ادب ہی کو سمجھتے رہنے کا دور ختم ہوچکا۔ اب تصنیف کے ذریعے خود مصنف کو سمجھنے اور پرکھنے کا زمانہ ہے۔ تخلیق کو سمجھنے کے لیے اس کے خالق کا ماحول، گرد و پیش کے اثرات اور اس کی فطرت و جبلت سے زیادہ سے زیادہ آگاہی اور واقفیت بہت ضروری ہے۔ اردو ادب کا خزانہ ابھی ایسی چیزوں سے خالی ہے۔ نہ قدما کے تذکرے اس کمی کو پورا کرتے ہیں اور نہ دورِ حاضر کے لکھنے والوں کی تحریریں۔ ایسی صورت میں سردار جعفری کی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" اردو ادب کے لیے ایک نیا اور قابل قدر تحفہ ہے۔ اس میں علی سردار جعفری نے اپنی سوانح اور افکار کے ان عناصر کو پیش کیا ہے جن کی وجہ سے وہ ترقی پسند ادب کی طرف مائل ہوئے۔ اور آج اس کے ممتاز علم برداروں میں ان کا شمار ہے۔ تعلیم و تربیت، سیاسی زندگی کی جھلکیاں، ادبی سرگرمیاں، اس کے لیے جدوجہد، کاوشیں اور کامرانیاں، اسی ضمن میں کئی ایک رومانی اور سیاسی نظموں کے محرکات اور موضوعات پر بھی بڑی صاف روشنی پڑتی ہے۔ مصنف نے اپنی ذات کے علاوہ اس دور کے اور بھی کئی مشہور و معروف ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے مشاغل و افکار کا بھی نہایت بے تکلفی اور بے ساختگی سے ذکر کیا ہے۔

جن کی بدولت اس ادبی تحریک میں جان پڑی اور جن کوششوں نے اس کو چلا بخشی ہے۔

لکھنؤ کی سرزمین تو بڑی سخن نواز اور ادب پرست واقع ہوئی ہے، اس کی یہ صفت اور یہ روایت، ترقی پسند ادب کی ترویج اور ارتقا کے معاملے میں بھی باقی اور برقرار رہی۔ اس کے بھی متعدد ثبوت اور مثالیں اس کتاب میں موجود ہیں۔

پانچویں اور آخری رات مجاز کی موت سے متعلق ہے، ایک تو سانحہ اپنی جگہ پر دل گداز، دوسرے ایک مخلص رفیق کا آنکھوں دیکھا بیان۔ اسباب و واقعات کا ذکر، مجاز کی زندگی، شاعری اور حالات کا جائزہ، حقیقت بینی کے ساتھ دوستوں کی دشمنی اور زمانے کی سفاکیاں غرض ان تمام باتوں کو جس یگانگت، تعلق اور درد واثر کے ساتھ لکھا گیا ہے اسے پڑھ کر سخت سے سخت دل بھی ممکن نہیں کہ متاثر نہ ہو۔

لکھنؤ کی پانچ راتوں کے علاوہ کتاب کے نصف سے کچھ زائد حصے میں سردار جعفری کی ان صبحوں اور شاموں کی داستانیں اور مشاہدے بھی ہیں جو انھوں نے روس اور ملک کے دوسرے شہروں میں گزاری ہیں، نقطۂ نظر خیالات اور باتیں وہی ہیں جو ان کی ترقی پسندی پر دلالت کرتی ہیں مگر انداز تحریر میں تبلیغ یا جانب داری کا خیال نہیں آتا۔ بلکہ اشتراکی نظام، روس والوں کی زندگی اور بعض ادبی نکات اور مسائل سے براہ راست ذہن آشنا ہوتا ہے اور کہیں کہیں تو جذباتی لگاؤ بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔

"یادوں کے تانے بانے سے" جو تصویریں بنائی گئی ہیں وہ اور بھی واضح اور قابل شناخت ہو سکتی تھیں اگر واقعات کی تھوڑی سی تشریح کر دی جاتی یا چند ناموں کو پوشیدہ نہ رکھا جاتا۔ اس معاملے میں سردار نے جو مصلحت یا مروت برتی ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انھوں نے راز داری کا بھرم رکھا اور تلخ نوائی کے بجائے یادوں کے خوش گوار عناصر اور لطیف پہلوؤں کو اجاگر کرنا زیادہ ضروری اور بہتر خیال کیا۔ یہ جذبہ بھی اپنی جگہ پر نامناسب نہیں ہے۔

ہندوستان میں جدید سیاسی نظریے اور نئے ادبی رجحانات کی تحریکوں اور ان کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہر حال مفید اور کار آمد ثابت ہوگی۔

اُمید ہے کہ دوسرے اہلِ قلم حضرات بھی اپنی اس نوعیت کے تاثرات اور تجربوں کو ضبطِ تحریر میں لاکر، اُردو ادب کو فیض پہنچانے کی طرف متوجہ ہوں گے۔
یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی سے مل سکتی ہے۔ رشید نعمانی

فنِ تقریر

مصنف: مظاہر حسن
صفحات: ۱۷۶ سائز: $\frac{20\times30}{16}$
قیمت: ۳ روپے
ناشر: بک لینڈ، محلہ کلیانی، بہار

مظاہر حسن صاحب بہار سول سروس کے ایک جواں سال رکن ہیں۔ اپنی تصنیف "فنِ تقریر" میں انھوں نے موثر اور مدلل تقریر کرنے کے نکات پیش کیے ہیں۔ پہلے مضمون کا عنوان ہے کہ "اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے بارہ طریقے"۔ یہ نسخہ ترکیب استعمال قسم کی چیز ہے اور کسی قدر غیر ضروری اور بے جا ہے۔ دیگر نو مضامین اپنے موضوع کے اعتبار سے مفید اور مناسب ہیں۔

مظاہر حسن صاحب نے اپنی تمہید میں فرمایا ہے کہ "...... لیکن ہم جانتے ہیں کہ قریب قریب ہر ملک میں اگر کوئی شخص وزیر اعظم بن سکا ہے یا حکومت کا کوئی بڑا سیاسی عہدہ حاصل کرسکا ہے تو صرف تقریر کی بدولت ...... تجارتی زندگی میں بھی بہت سے لوگ موثر تقریر کی طاقت کے سہارے اپنے کاروبار یا فرم کے اعلیٰ ترین عہدہ پر پہنچ گئے ہیں"۔ تقریر کی اہمیت اور افادیت سے تو کسی کو انکار نہ ہوگا لیکن اس کی حمایت میں ایسا بیان یک طرفہ اور ادعائی ہی کہلائے گا۔ سنجیدہ تحریر کا وقار قائم رکھنے کے لیے ایسے بیانات سے احتراز برتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ انھوں نے اپنی تمہید میں لکھ دیا ہے کہ "اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں مصنف کو یورپ اور امریکہ کے مشہور مصنفین کی کتابوں سے بھی استفادہ کرنا پڑا ہے" تاہم حوالوں کے انتخاب میں اگر وہ "دیسی" ہی رہتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اس کتاب میں ہر مضمون کے آخر میں خلاصے کے عنوان سے اہم نکات درج کرکے قاری کے لیے سہولت بہم پہنچائی گئی ہے۔

مظاہر حسن صاحب کی زبان رواں، اور بیان سلجھا ہوا ہے۔ ہمارے اردو ادب میں موضوعاتی مواد کم ملتا ہے اور عموماً فنی مسائل کو ہم نظر انداز کرنے کے عادی ہیں، اس لیے خوشی کی بات ہے کہ مظاہر صاحب نے فن تقریر کے موضوع پر قلم اٹھایا۔

امید ہے کہ یہ کتاب تازہ واردانِ بساطِ خطابت "زنہار جنبیں ہوس، شہ سواریٔ میدانِ سیاست ہے" اپنے لیے مفید پائیں گے اور تشنگانِ ساحل کو بھی اس کا مطالعہ حوصلہ عطا کرے گا۔

کتابت اور طباعت بالکل معمولی ہے۔ عبداللہ ولی بخش قادری

✧

روداد

از: مولوی احترام الدین احمد شاغل جے پوری
صفحات: ۱۱۰، سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۸}$
قیمت: چار روپے
ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو تسلیم منزل، جے پور، راجستھان

نومبر ۱۹۶۲ء میں جے پور میں آل انڈیا اردو کانفرنس ہونے والی تھی مگر چین کے ناگہانی حملے کی وجہ سے اسے ملتوی کرنا پڑا۔ کانفرنس کے مقامی باہمت اور سرگرم کارکنوں نے اس کے بجائے وسط نومبر ۱۹۶۳ء میں ایک اردو سمپوزیم منعقد کیا۔ اس کے جلسوں اور مشاعرے کی مفصل اور ضروری کارروائیاں اس رسالے میں درج ہیں۔

اردو سے متعلق حکومت کے وعدے اور عمال کی بے اعتنائیاں اتنی نمایاں اور مشہور ہیں کہ ان پر کچھ لکھنا بے کار ہے۔ مگر راجستھان کے اردو نواز حضرات اس زبان کی بقا و ترویج کے لیے جس عزم و خلوص سے کوشاں اور سرگرداں رہے اس کی مثالیں اور جھلکیاں اس "روداد" میں محفوظ ہیں۔ جو بہت سی حیثیتوں سے قابلِ قدر ہیں اور ان صوبوں کے لیے جن کا تعلق اردو سے زیادہ رہا ہے۔ قابلِ رشک۔

الطاف احمد صاحب خیری کا مضمون "دل کش جے پور" پڑھنے کے بعد اس ریاست اور اس خوب صورت شہر کے بارے میں بہت سی [illegible]

معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ چیف منسٹر اور ناگرجی کی تقریریں اُردو کے بہی خواہوں یا خدمت گزاروں کی حوصلہ افزائیوں کا سبب بن سکتی ہیں۔ پنڈت سندرلال کی تقریر کے اقتباسات ان کی صاف گوئی، انصاف پسندی اور اُردو سے بے لوث محبت کے آئینہ دار ہیں۔ ریاستی حکومت کے اعلانات سے اردو کی آئینی حیثیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ دورِ حاضر میں اُردو کی ترقی اور رفتار کا اندازہ لگانے، اس کا جائزہ لینے اور پھر اس پر تنقید یا تبصرہ کرنے میں مقالہ نگاروں کی کوششیں قابل لحاظ ہیں۔ عام دلچسپی کے لیے نظموں اور مشاعرے کی غزلوں کا انتخاب بھی موجود ہے مخصوص مہمانوں، کارکنوں اور شعرا کی متعدد تصویروں سے بھی رسالے کو مزین کیا گیا ہے۔ حصّہ نظم میں کتابت اور طباعت کا معیار بلند کرنے کی ضرورت تھی۔

رشید نعمانی

از: محمد ابراہیم خیرؔ

صفحات: ۳۲، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

قیمت: ۵۰ پیسے

ناشر: مکتبۂ اسلامی۔ ۳۱ محمد علی روڈ بمبئی ۳

دیوناگری میں بھی اُردو لکھیے

محمد ابراہیم صاحب خیرؔ نے اپنی اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ بہت ہی اچھے ڈھنگ سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہم اردو ادب کو ہندی میں زبان ادب کی خوبیاں قائم رکھتے ہوئے سائنٹفک طریقے سے کیسے منتقل کر سکتے ہیں؟ اس اہم سوال کا جواب کسی حد تک اس کتاب کے پڑھنے سے مل جاتا ہے۔ مثلاً زبر، زیر، پیش، نون غنہ، جزم، تشدید، یائے معروف، یائے مخلوط یا پھر ث، ح، خ، ذ، ز، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق اور ژ کو ہندی میں کس طرح سے لکھیں۔ ان کے اس کام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑی محنت اور دل سوزی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا ہے۔ جگہ جگہ وضاحت کے ساتھ مدلل طریقے سے اپنی بات سمجھائی ہے۔ ان کی یہ کوشش واقعی لائق تحسین اور قابل ستائش ہے۔

سید منیر الحسن

ادبی خبریں

جلسہ اساتذہ اُردو

دلی میں اُردو کے اساتذہ کا ایک جلسہ مورخہ ۱۶ ر دسمبر کی شام کو فتح پوری ہائیر سکنڈری اسکول میں زیر صدارت پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، صدر شعبۂ اُردو دلی یونی ورسٹی منعقد ہوا۔ جس میں پرائمری مڈل ہائیر سکنڈری اُردو و دیگر اسکولوں، کالجوں میں اُردو کے تحفظ اور اس کی ترویج و اشاعت کی کوشش کرنے اور اس راہ کی مشکلات کو دور کرنے اور اردو کے اساتذہ کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں ایک انجمن کی تشکیل عمل میں آئی۔

امتحانات جامعہ اُردو

اُردو دنیا کے لیے یہ خبر نہایت مسرت کا باعث ہوگی کہ جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحان ادیب کامل اور کسی مستند یونی ورسٹی سے بی، اے پاس شدہ امیدوار کو دلی یونی ورسٹی نے ۱۴ ر دسمبر ۶۴ء کے خصوصی جلسے میں ایم، اے (اُردو) میں داخل کرنا منظور کر لیا ہے۔ اس طرح وہ اُمیدوار جو اردو میں بی، اے نہیں کر سکتے ہیں وہ بھی مستفید ہو سکتے ہیں یا تھرڈ ڈویژن پاس شدہ اُمیدوار ادیب کامل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم، اے (اُردو) میں داخلہ لے سکتے ہیں اور اپنی تعلیم مکمل کر سکتے ہیں۔

(سکریٹری شعبۂ اُردو)

انجمن فارسی

بریلی کالج بریلی کی انجمن فارسی کا افتتاحیہ جلسہ ۲۸ ر نومبر ۶۴ء کو زیر افتتاح ڈاکٹر محمد شمعون صاحب اسرائیلی ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و پروفیسر ایس کے چڈھا صاحب انچارج پرنسپل بریلی کالج و سرپرست انجمن منعقد ہوا۔ ڈاکٹر محمد شمعون صاحب و پروفیسر جلالی صاحب صدر شعبۂ فارسی بریلی کالج اور پروفیسر ڈاکٹر جمیل صاحب صدر شعبۂ ہندی بریلی کالج نے فارسی زبان و ادب پر پُرمغز تقریریں کیں۔ علاوہ ازیں متعدد طلبا و طالبات نے مقالات پڑھے اور تقریریں کیں۔ جن میں سید ذاکر حسین، انتظار حسین خاں، عشرت ایم آغا خان وارثی بریلوی اور مس فریدہ خاتون قابل ذکر ہیں۔

[illegible]

Regd. No. D. 58

Janu

Kitab Numa

JAMIA NAGAR NEW DELHI. 25.

کتاب نما

ماہنامہ

نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

غزل سرا (اُردو)

اُردو غزل گو شعراء میں سے ۱۲ مشہور شعراء کی غزلوں پر مجنوں صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مقالوں کا مجموعہ۔ یہ مقالے جو تنقید نگاری کے اصول اور معیار پر پورے اُترتے ہیں، نہایت دیانت داری۔ اور ذمّے داری کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ مجنوں صاحب کے ہاں تنقید کا پہلو زیادہ جان دار، زیادہ نمایاں اور زیادہ صحیح ہے اس لیے نئے تنقید نگاروں کو جن کے لیے یہ کتاب شمعِ ہدایت کا کام دے گی، اِس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ صفحات — ۳۰۲

مجلّد قیمت :—— ۶/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

منیجنگ ایڈیٹر
غلام ربانی تاباں

ماہنامہ **کتاب نما** نئی دہلی

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۶ | فروری ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۲

اشاریہ

قارئینِ کتاب نما کو یاد ہوگا، اب سے ٹھیک ایک سال پہلے کتاب نما کے فروری ۶۴ء کے شمارے میں ہم نے سستی اور معیاری کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ایک پروگرام کا اعلان کیا تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ مکتبہ جامعہ اُردو کی ان کتابوں کو جو ہمارے ادب میں مسلّم حیثیت رکھتی ہیں، بالکل صحیح متن کے ساتھ شائع کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس سلسلے کی پہلی کتاب "باغ و بہار" طویل تلاش و تحقیق اور عرق ریزی کے بعد تیار ہو کر اس ماہ کے آخر تک منظرِ عام پر آرہی ہے۔

جیسا کہ ہم نے کتاب نما کے مذکورہ شمارے میں لکھا تھا "میر امن" کا یہ شاہ کار پہلی بار ۱۸۰۳ء میں کلکتے میں چھپا تھا۔ اس کا ایک اور قابلِ ذکر اڈیشن وہ ہے جس کو مشہور مستشرق فاربس نے لندن سے شائع کیا تھا اور جس میں خاصی بڑی فرہنگ بھی شامل تھی اور مرتب ضبطِ حرکات کا بھی اہتمام کیا تھا۔ یہ دونوں اڈیشن اب کم یاب ہیں۔ ہم نے فورٹ ولیم کالج کے شائع کردہ مذکورہ بالا اڈیشن کو اپنے نسخے کے متن کی بنیاد بنایا ہے اور نسخۂ فاربس کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ اشاعتِ اول میں جو اغلاطِ طباعت رہ گئی تھیں اور جو اس کے غلط نامے میں شامل نہیں ہو سکی تھیں ان کی تصحیح بھی نسخۂ فاربس کی مدد سے کی گئی ہے۔ غرض مکتبہ جامعہ کا یہ نسخۂ "باغ و بہار" معتبر متن اور ضروری فرہنگ پر مشتمل ہے اس کی ترتیب و تصحیح میں حسبِ احتیاط اور اہتمام سے کام لیا گیا ہے اس کی بنا پر ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ نسخہ اربابِ ذوق کی پسندیدگی کی سند حاصل کرے گا اور ہم طلبہ کے لیے مختلف اعتبار سے نہایت مفید ثابت ہوگا۔

نیاز فتح پوری

مومن کے قصائد

قصیدہ گوئی میں سودا اور ذوق کو خاص شہرت حاصل ہے، کیوں کہ ان دونوں نے متعدد قصائد لکھے اور اپنا پورا زورِ طبع ان پر صرف کر دیا۔ غزل کی طرح اردو میں قصیدہ گوئی بھی فارسی کی تقلید تھی اور چوں کہ فارسی کی قصیدہ گوئی کا تعلق شاعری سے اتنا زیادہ نہ تھا جتنا اظہارِ فضل و کمال سے اس لیے اردو میں قصیدہ گوئی کا رنگ یہی رہا۔ تاریخی و علمی اصطلاحات، دقیق و مشکل الفاظ، تخیل کی بلندی، مضمون آفرینی، زورِ بیان، مبالغہ و تعلی، قصیدہ گوئی کی وہ خصوصیات تھیں جو فارسی میں عام طور پر پائی تھیں اور جن تتبع اردو میں بھی کیا گیا۔

فارسی قصیدہ گوئی کی تفصیل پر اظہارِ خیال کا محل نہیں، ورنہ میں شاید زیادہ تفصیل کے ساتھ ان خصوصیات پر روشنی ڈال سکتا۔ بہرحال ان تمام ذیلی مباحث سے ہٹ کر جب وقت ہم اردو کی قصیدہ نگاری پر نگاہ ڈالتے ہیں تو چار شاعروں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔
سودا، ذوق، غالب، مومن

غالب نے اردو کے کوئی قصیدہ نہیں لکھا جس کا ذکر سودا اور ذوق کے قصائد کے ساتھ کیا جا سکے۔ اس نے اپنا سارا زورِ قلم فارسی قصیدہ نگاری میں صرف کر دیا اور بہت کامیاب ہوا۔ سودا ان خصوصیات کے لحاظ سے جو قصیدے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں بڑا کامیاب قصیدہ گو تھا۔ ذوق کے قصائد گو زورِ بیان کے لحاظ سے سودا کے قصائد سے کمتر ہیں لیکن روانی اور پختگی کے لحاظ سے وہ سودا سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مومن کے یہاں ذوق و سودا دونوں کا رنگ پایا جاتا تھا اور اگر مدح گوئی کو اپنا پیشہ بنا کر زیادہ قصائد لکھتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ سودا اور ذوق کے ساتھ ان کا نام بھی نہ لیا جاتا۔

مومن نے صرف نو قصیدے لکھے۔ ایک حمد میں، دوسرا نعت میں، چار خلفائے کرام کی منقبت میں۔ ایک حسینؓ کی شان میں۔ صرف دو قصیدے انھوں نے دنیاوی حیثیت

سے لکھے۔ ایک والیٔ ٹونک کی مدح میں۔ دوسرا راجہ پٹیالہ کی تعریف میں اور ان تمام قصائد میں انھوں نے سوداؔ اور ذوقؔ دونوں سے اپنی راہ علیحدہ اختیار کی۔

قصیدہ میں تشبیب خاص چیز ہے اور اس پر تمام شعرا نے اپنا پورا زور صرف کیا ہے لیکن عرفیؔ کی طرح یہ خصوصیت مومنؔ ہی کو حاصل تھی، اکثر قصائد میں انھوں نے تشبیب کو اس کے صحیح معنی میں پیش کیا اور پورا رنگ تغزل اس میں بھر دیا۔

خلیفۂ ثانی کی منقبت میں جو قصیدہ ہے اس کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

جو اس کی زلف کو دوں اپنا عقدۂ مشکل — تو بوالہوس کا بھی ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل
تم اور حسرتِ ناز، آہ کیا علاج کروں — میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا — غضب ہے شوقِ رسائی و دوری منزل
خدا سے ڈر بت بیدرد، ہے یہ کیا انصاف — کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں خجل

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ غزل کے اشعار نہیں ہیں، سوداؔ اور ذوقؔ کے قصائد میں ایسا رچا ہوا رنگِ تغزل آپ کو نہ ملے گا۔

مومنؔ نے بھی دوسرے شعراء کی طرح قصائد میں زمانہ کی شکایت، اس کی ناقدر شناسی اور اپنی ناکامی نامرادی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر اسی متغزلانہ رنگ میں خلیفۂ ثالث کی منقبت میں تو انھوں نے غزل کیا پوری واسوخت لکھدی۔

نیک نامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار — چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار
گر تمہیں صحبتِ اغیار سے پرہیز نہیں — ہم بھی کچھ چارۂ آزار کریں گے ناچار
وہ جلے محفلِ دشمن میں جو ہو شمع لقا — مجھ کو چھیڑا نہ کرو تم سے کہا ہے سو بار
بے مروت مری نظروں میں ہیں انداز ترے — آجکل کچھ نگہِ لطف ہے سوئے اغیار
آپ دکھانہ سنا اور سے، پر جھوٹ نہیں — تیری آنکھیں کہے دیتی ہیں نہ کرنا انکار

الغرض مومنؔ کی یہ خصوصیت کہ وہ قصیدوں میں بھی غزل کی طرف آجاتے ہیں، ان کی وہ انفرادی خصوصیت ہے جس میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، قصائد میں زورِ بیان، مبالغہ، دقت آفرینی اور تلمیحات کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اور یہ وہ روایت تھی جس سے مومنؔ بھی نہ بچ سکے اور یوں کہ عرفی

فارسی کے فاضل، طب و نجوم کے ماہر تھے اس لیے ایسی ایسی علمی اصطلاحیں استعمال کیں اور ایسی ایسی تلمیحات سے کام لیا ہے کہ ہر شخص ان کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مثلاً حضرت عثمان کی منقبت کے مطلع ثالث میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

صوفیوں نے تیرے چہرہ کا جو عالم دیکھا
ہوئے قایل کہ تجلی کو نہیں ہے تکرار

اس شعر کا مفہوم سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا جب تک کسی کو صوفیوں کا نظریہ معلوم نہ ہو کہ تجلی خداوندی کی تکرار نہیں ہو سکتی۔ مدعا یہ کہ صوفیوں کو تیرا چہرہ دیکھنے کے بعد ہی اس کی تصدیق ہوئی کہ تجلی کی تکرار ممکن نہیں۔ کہنا صرف یہ تھا کہ تو اپنے جمال میں بے مثل ہے لیکن اسے ظاہر کیا اس انداز سے! اس قصیدے میں اصطلاحاتِ نجوم کا عالم دیکھیے۔

ذروۂ اوج سے برجیس کی رجعت ہو جائے
ثور میں زہرہ کرے مہ کے قراں سے انکار

تاکہ ہو جائے ہر آزار کا مصدر ایک ایک
سختِ نحسین کو ہے دفعِ طبیعت پہ قرار

بندھے امید گر اک خوشۂ گندم کی مجھے
مہر تحویل سے ہو برجِ شرف کے بیزار

گر حصولِ زرِ مسکوک کی سمجھوں میں دلیل
ناخنِ شیر سے ہو سینۂ خورشید فگار

خون کے میرے ارادہ سے ہوا ذابحِ سعد
قتل پر میرے کمر باندھے ہے شکلِ جبار

زیست اپنی ہے تو تربیع و تقابل کے سوا
بھول جائیں گے منجم جو ہیں باقی انظار

ان اشعار میں ذروۂ (بلندی) برجیس، زہرہ، نحسین، تحویل، شرف، ذابح سعد، تربیع، تقابل، انظار، سب علم نجوم کی اصطلاحیں ہیں۔

رئیس پٹیالہ کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا گیا ہے اس کی ابتدا بھی انھوں نے اسی اشعار سے کی ہے۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ درد سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

چشم ستارہ سحر یوں ہے زحل سے سرمہ سا
دشنۂ ترک چرخ سے تیز نگاہِ مشتری

مومن نے فلسفہ کی اصطلاحوں سے بھی کام لیا ہے، مثلاً:۔

جب ستایا مجھے اس نے وہی الفت وہی دل
یہ غلط ہے کہ اعادہ نہیں بہر معدوم

فلاسفہ کا اعتقاد ہے کہ جو شے معدوم ہو جائے وہ پھر وجود میں نہیں آ سکتی، مومن کہتا ہے کہ یہ خیال غلط ہے کیوں کہ جب کبھی محبوب نے مجھے ستایا۔ گئی ہوئی محبت پھر لوٹ آئی۔

ایک اور شعر:۔

فکرِ الزامِ حکیم و متکلم ہوا سے　　تو مجسم نظر آجائیں نقاطِ موہوم

نقطے کو حکیم و متکلم فرضی و موہوم مانتے ہیں، مومن کہتے ہیں کہ اگر میرا ممدوح ان کے اس نظریہ کو باطل کرنے پر آئے تو نقطہ بھی جسم اختیار کرکے سامنے آجائے۔

نعتیہ قصیدہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

ہے دشت، بزمِ طرب کثرتِ نتائج سے　　نہ کیوں ہو شکلِ حماری کو نازِ شکلِ عروس

شکل حماری اور شکلِ عروس، اقلیدس کی دو شکلیں ہیں۔ جن میں شکل عروس کثرت نتائج کے لحاظ سے زیادہ اہم چیز کہی جاتی ہے۔

اسی شکلِ عروس کا ذکر انھوں نے ایک اور جگہ بھی کیا ہے:۔

گواہِ عصمتِ مریم ہو کثرتِ اولاد　　عقیمہ مجھ سے سنے گر بیانِ شکلِ عروس

مومن کا یہ شعر بہت مشکل ہے، اس لیے اس کی توضیح کیے دیتا ہوں:۔

شکلِ عروس اقلیدس کی ایک ایسی شکل ہے جس سے نتائج کثیر پیدا ہوجاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر میں کسی عقیمہ (بانجھ عورت) کے سامنے شکل عروس کا بیان کروں تو اس کا بانجھ پن دور ہوجائے اور اس کی اولاد کی کثرت کو دیکھ کر لوگوں کو جناب مریم کی پاک دامنی کا یقین آجائے کیوں کہ جب ایک عقیمہ کے اتنی اولاد پیدا ہوسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوشیزہ کے بطن سے اولاد نہ ہوسکے۔

دیکھ کر تیری تیغ کو وہ شگاف　　ٹوٹ جاتی ہے سرکشوں کی کمر

خطِ نصف النہار ہو محسوس　　گر فلک کو عدو بنائے سپر

خطِ نصف النہار فضائے آسمان کا ایک فرضی خط ہے۔ لیکن مومن اپنے ممدوح سے کہتا ہے کہ اگر تیرا دشمن تیری تلوار کا وار بچانے کے لیے آسمان کو سپر بنائے تو اس خطِ نصف النہار بھی باوجود فرضی و موہوم ہونے کے محسوس ہونے لگے اور ایسا معلوم ہو گویا آسمان کی ڈھال میں بال پڑ گیا ہے۔

طبی اصطلاحات ملاحظہ ہوں:۔

جو ہوں معالجِ مبطوں تو قابضِ ارواح　　کرے دعائے رواجِ طریقِ جالینوس

ورم ہو چارہ گر قبض تا بدستِ لیئم　　کیا ہو مینے جو تجویز وزنِ مغزِ فلوس

مطلوب اس مریض کو کہتے ہیں جسے معدہ کی شکایات رہتی ہوں۔ جالینوس یونان کا مشہور طبیب تھا جسے امراض معدہ کے علاج میں بڑی دستگاہ حاصل تھی اور جس کی جوارش جالینوس بڑی مشہور چیز ہے۔ مومن کہتا ہے کہ اگر میں کسی مریضِ معدہ کا علاج کروں تو خود ملک الموت جان نکالنے کی جگہ جالینوس کے طریق علاج کی دعا کرنے لگیں۔

دوسرے شعر میں دِرم قبض اور فلوس سے ایہام کا کام لیا ہے۔ فلوس املتاس کو کہتے ہیں، اور پیسوں کو بھی اس طرح دِرم طبی وزن بھی ہے اور سکہ کا نام بھی۔ قبض اسہال کا ضد بھی ہے اور مٹھی بند کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر میں رفعِ قبض کے لیے ایک درم مغز فلوس تجویز کروں تو بخیل کا بخل بھی دور ہو جائے۔ چوسر کی اصطلاحات دیکھیے۔

نرد بازوں کو عہد میں تیرے ششش جہت جیسے مہرۂ ششدر

مہرۂ ششدر چوسر میں اس مہرہ کو کہتے ہیں جو چھ خانوں میں سے کسی خانہ میں نہ چل سکے اور زچ ہو جائے۔

مومن کے یہاں تاریخی و مذہبی تلمیحات بھی بکثرت پائی جاتی ہیں (جن کی تفصیل کا موقع نہیں) اور اپنے اظہارِ فضل و کمال کے لیے ایسے ایسے دقیق الفاظ استعمال کیے ہیں کہ معمولی پڑھا لکھا انسان انھیں سمجھ ہی نہیں سکتا نعتیہ قصیدے کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:۔ مجوس (ابر باراں) غموس (جھوٹی قسم) قربوس (زین کے سامنے کا حصہ) بدرلیطوس۔ (ایک مخصوص دمائے جلائی) مطموس (مٹا ہوا) قصہ مختصر یہ کہ ان تمام خصوصیات کے لحاظ سے جو ایک قصیدہ کی کامیابی کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ مومن کے قصیدے بھی کامیاب ہیں اور اگر ہم اس رنگ تغزل کو دیکھیں جو مومن کے قصائد میں پایا جاتا ہے۔ تو یہ کہنے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ اس باب میں مومن کی انفرادیت بہت نمایاں ہے۔

(بشکریہ "نگار" کراچی)

ماتیؔ جائسی

غزل

جا ، پہچان بھی گویا نہیں الفت کیسی
اب امید نگہہ لطف و مروت کیسی

سختی منزلِ الفت کی شکایت کیسی
امتحان کا جو یقیں ہو تو مصیبت کیسی

جب ازل ہی سے کوئی اور دل پہ دل کا مالک
پھر جو دل چاہے وہ ہو جائے یہ حسرت کیسی

قید میں فرقِ مراتب کی ہیں وہ ہم ہوں کہ تم
ہائے مجبور ہے آزادیٔ فطرت کیسی

چیخ اٹھتا ہے تڑپ جاتا ہے بےبس مظلوم
اور چپ محوِ تماشا ہے مشیت کیسی

حسن کو حاجتِ تصدیق تھی سو عشق نے کی
عشق کو پھر بھی رہی حسن سے حاجت کیسی

نہ سہی غم کی جزا غم پہ تبسم کیوں ہے
کچھ بتاؤ تو یہ تعزیر محبت کیسی

تم بھی اس در کے گدا ہم بھی اسی در کے فقیر
اے امیرو یہ غریبوں سے رعونت کیسی

وقت آتا ہے گزرنے کے لیے اے ماتیؔ
عشق کا ذکر ہے کیا غم کی شکایت کیسی

یہ غزل جناب ماتیؔ جائسی کے مجموعہ کلام "نگارستانِ ماتی" سے لی گئی۔ صفحات: ۱۶۸ قیمت ۲/۵۰

خواجہ اطہر حسین

بعض آزمائشی لمحے

زندگی کے وہ لمحے جب انسان اپنے آپ کو عقلمند تصور کرتا ہے، بالعموم اس کی بیوقوفی کے شاہد اور دوسروں کے لیے سرمایۂ تفریح و تفنن ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ موقعے ایسے بھی آتے ہیں جب انسان اپنے آپ کو بالکل بے وقوف یا نرا احمق تصور کرتا ہے اور اس طرح ایک دوسرے انداز سے دیکھنے والوں کے لیے ضیافت طبع کا سامان مہیا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ موسم بہار کی ایک حسین صبح ہے۔ باد بہار کے جنون پرور جھونکے ایک طرف تو پانی کی لہروں سے کھیل رہے ہیں اور دوسری طرف ہمارے والہانہ جذبات کو گدگدا رہے ہیں۔ اور ہم اس رومانی ماحول میں ایک خیالی پیکر کی یاد کے کنارے محو گلگشت ہیں۔ پیمانۂ دل جوشِ نشاط سے لبریز ہے، اور طبیعت خدا جانے کیسی کیسی امنگوں سے گلے مل رہی ہے! ارمانوں اور تمناؤں کے اس ہجوم میں ایک بار جو نظر اٹھتی ہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان حسین خوابوں کی حسین تعبیر نگاہوں کے سامنے ہے یعنی ایک فریب نظر، ہوش ربا جمال و رنگین جس کی پشت ہماری طرف ہے۔ ندی کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی نکلتے ہوئے سورج کی کرنوں سے سبزہ کے فرش مخملیں سے۔ اور ندی کی لہروں کے رقصِ پر پیچ و خم سے۔ لطف اندوز تماشا ہے۔ ہلکے نارنجی رنگ کا سادہ سا لباس آئینہ دارِ عالم دوشیزگی ہے۔ اعضا میں دل فریب تناسب ہے۔ اور اندازِ نشست غزل خوانِ شباب ہے۔ پہلے تو حیرت و استعجاب نے قدم روکے۔ مگر دوسرے لمحے وفورِ شوق نے دست گیری کی اور ہم آگے بڑھے۔ سوچا کہ بارگاہِ حسن میں کیا پیش کش لے کر حاضر ہوں۔ دائیں بائیں نظر ڈالی تو پاس ہی کی جھاڑی میں گلاب کا ایک شاداب پھول نظر آیا۔ دل نے کہا تردد کی کیا بات ہے۔ یہی تو وہ موقع ہے جس کے لیے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ "برگ سبز است تحفۂ درویش"۔ چٹان پر پھول توڑ لیا اور دونوں ہتھیلیاں پھیلا کر بیچوں بیچ پھول کو جگہ دی اور دبے پاؤں کچھ اور قریب پہنچے۔

جی چاہا کہ سامنے جا کر اس فقیرانہ تحفہ کو پیش کریں۔ مگر رعبِ حسن نے اس جسارت کی اجازت نہ دی۔ لہٰذا اس جانِ بہار کی نظروں سے اوجھل رہتے ہوئے۔ ہاتھوں کو ایک جانب سے بڑھا کر نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

ہتھیلیوں پر پھول دیکھ کر اس مجسمہ رعنائی کی صراحی دار گردن مڑی۔ نورانی پیشانی اور ستواں ناک کی ایک جھلک کے ساتھ ان شگفتہ لبوں پر لطیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ایک عجیب اندازِ دل ربائی سے ایک صاف باطن جوانِ رعنا کی سیاہ داڑھی تک پھیل گئی۔ خواب محبت کی اس دوسری تعبیر کے بعد کی داستان غیر دلچسپ ہے کیوں کہ زیادہ تر عرقِ انفعال اور احساس ندامت کی داستان ہے۔

اگر اس چھوٹی سی داستانِ حسن و عشق کے تتمہ نے آپ کی طبیعت کو بدمزہ کر دیا ہو تو آپ اسے نہ پڑھیے۔ بلکہ اس کی جگہ یوں پڑھیے کہ ایک صاحب بڑی آن بان اور طمطراق کے ساتھ شاہراہ پر چلے جا رہے ہیں کہ یکبارگی کھلنڈری ہوا کا ایک شرارت پسند جھونکا ان کی ترچھے زاویہ سے زیب سر ٹوپی کے ساتھ خوش فعلیاں کرتا ہوا آنِ واحد میں اُڑا لے جاتا ہے۔ اس سانحہ کے وارد ہونے پر جو گوناگوں اثرات رونما ہوتے ہیں انھیں الفاظ میں قلم بند کرنا ذرا مشکل سی بات ہے۔ چلتا قدم رکتا ہے۔ رک کر بڑھتا ہے اور بڑھ کر پھر رک جاتا ہے۔ حیرت۔ ندامت۔ برہمی۔ برآشفتگی۔ غصہ جھنجھلاہٹ۔ اور نہ جانے کتنے اسی طرح کے جذبات کی متحدہ یورش ہو جاتی ہے۔ تو نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بیچ سڑک پر کھڑا ہوا انسان اپنے آپ کو احمق محسوس کرنے اور تماشائی محظوظ ہوں۔

اس کی ایک نظرِ عتاب تو ٹوپی پر ہوتی ہے اور دوسری مفت کا تماشا دیکھنے والوں پر۔ ہوا کے جھونکوں کی کیا شکایت جب خود اپنی بے مروت ٹوپی جھونکوں کی دم ساز بن جائے اور بدکے ہوئے پالتوں جانور کی طرح نہ دور ہی بھاگ جائے اور نہ مالک کو پاس ہی آنے کا موقع دے۔ غصّہ تو اس پر آتا ہے کم بخت دور سے للچاتی ہے۔ انتظار کرتی ہے اور جونہی گھبرایا ہوا ہاتھ گرفت کے لیے آگے بڑھتا ہے یہ ہرنی ایک نیا طرارہ بھر کر دس ہاتھ آگے نظر آتی ہے۔ اور پھر مزید لطف کی بات یہ ہے کہ اندازِ معشوقانہ محض ہلکی پھلکی ٹوپیوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ اچھے خاصے بھاری بھرکم ٹوپ جن سے متانت اور سلامت روی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جب ان کے سر پر سودا سوار ہوتا ہے۔ یا

یہ کہ ان کے دماغ میں ہوا بھرتی ہے، تو ایسی طفلانہ۔ نازبرداری اور صبر آزما حرکتیں ان سے ظہور میں آتی ہیں جو کسی ایلیلی دولہن کے خواب میں بھی نہ آئی ہوں۔

کہتے ہیں کہ بلالحاظ اس کے کہ گرستی ہے یا عہتگی نئی ہے یا پرانی۔ بھاگی ہوئی لُٹی کے دیوانہ وار تعاقب کی برابری اگر کوئی صورت حال کر سکتی ہے تو وہ بھاگی ہوئی بیوی کا تعاقب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دونوں صورتوں میں بے تحاشہ گھبراہٹ اور دہشت کی بنا تھوڑی سی بچی کھچی عزت کے بچانے کی تمنا، اور بعض راز ہائے سربستہ کے کھل جانے کے خوف سے ہوتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بسا اوقات بھاگی ہوئی ٹوپی قدموں کے نیچے ہوتی ہے، اور بھاگی ہوئی بیوی کے قدموں پر سر ہوتا ہے۔ محرم راز ہونے کی حیثیت سے ٹوپی اور بیوی ہم پلہ ہیں دونوں میں سے کسی ایک کا اڑ جانا سر تاج سلامت کے حق میں نوید حماقت اور تمغۂ ندامت ہے یوں تو کلاہ و نمدے سے لے کر تاجِ زرّیں تک، ٹوپی، سرپوش کی طرح، سدا ستارِ عیوب رہی۔ مگر اس انتخابی دور میں صحیح کاٹ چھانٹ کی ہو، تو قاضی الحاجات بھی ہے اور کلیدِ سرفرازی بھی۔

کچھ اسی طرح کی گوں مگوں حالتِ انسان پر اس وقت طاری ہوتی ہے، جب نقل مکان کے سلسلہ میں اسے اپنی گھر داری کی آنتیں آنے جانے والوں کی دعوتِ نظر کے لیے ٹھیلہ پر لدی نظر آتی ہیں۔ اسے یقین نہیں آتا کہ جس گھر کے ظاہری سلیقہ اور رکھ رکھاؤ پر اسے اتنا فخر و ناز ہے، اس کا عالم باطن ایسے غیر پسندیدہ اور ناگوار خاطر ملغوبے سے بھرا ہوا ہے۔ وہ بڑی بڑی نگاہوں سے ان بدرنگ اور بدنما چارپائیوں کو دیکھتا ہے، جن میں بیشتر عمرِ طبعی سے تجاوز کر چکی ہیں۔ ان ڈھانچوں اور جھلنگوں کو دیکھتا ہے جنہیں اگر موم گورنمنٹ کی منظوری حاصل ہو جاتی، تو کبھی کا نذر آتش ہو جانا چاہیے تھا۔ دو چار میلے کچیلے گھڑے دو ایک آتش خوردہ و زنگ آلود انگیٹھیاں۔ پرانے تیل کے کنستر۔ فنائل کے خالی ٹین۔ خالی بوتلیں۔ ٹاٹ کے چھوٹے بڑے ٹکڑے، جو کبھی پردہ داری کرتے تھے اور آج مجرم افشائے راز ہیں۔ اخباروں کی ردی۔ طوطے کا پنجرہ جس کا طوطا عرصہ ہوا کہانی بن چکا ہے۔ کچھ لوہے کا ٹوٹا پھوٹا سامان۔ کچھ لکڑی کا کاٹھ کباڑ۔ شتے از خروارے۔ یہ ہے وہ گرہستی جو برسوں کی محنت کا سرمایہ اور بہت سی پرانی محبتوں کا مقبرہ ہے۔ ان سب کا بلا شرکت غیرے مالک، ٹھیلے کے پاس کھڑا ہوا احمقانہ نظروں سے اس عجائب خانہ کو دیکھتا بھی ہے اور

نہیں بھی دیکھتا یعنی اس طرح دیکھتا ہے کہ کوئی نہ دیکھے کہ عجائب خانہ کو دیکھتا بھی ہے اور نہیں بھی دیکھتا یعنی اس طرح دیکھتا ہے کہ کوئی نہ دیکھے کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ ایک طرف تو اس کا چاہت بھرا دل ان دیرانہ رفیقانِ حیات سے کسی ایک کے ایثار پر بھی رضامند نہیں ہوتا۔ اس کی وفاشعاری کا تقاضہ ہوتا ہے پرانے از کار رفتہ خدمت گزاروں سے منھ نہ موڑے۔ بلکہ انھیں اپنی جان کے ساتھ گھر گھر لیے پھرے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ شارع عام پر لوگ اس کباڑخانے کی ملکیت اس کی طرف منسوب سمجھیں۔ اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اسے بھی بے تعلق راہ گیروں اور تماشائیوں میں شمار کرلیں۔ لہٰذا وہ پرانی دوٹانگ کی تپائی اور ننھے کے (جواب لفضلہ جوان ہے) نین پالیوں والے پالنے کے بہ حفاظت تمام لادے جانے کی نگرانی امکانی بے توجہی کی آڑ سے کرتا ہے مگر یہ ظاہر کی بے رخی درپردہ محبت کو چھپانے میں حسب دستور بے سود ثابت ہوتی ہے دیکھنے والے بھانپ لیتے ہیں کہ انبارِ حماقت کی ضمیر کس طرف گھومتی ہے، یہ مردہ عجائب خانہ کس کی مساعی جمیلہ کا رہینِ منت ہے۔

اس طرح کے چھوٹے موٹے واقعات تو گھر کے اندر اور گھر سے باہر۔ ہاٹ بازار میں سفر حضر میں آئے دن دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ مثلاً کوئی پرخلوص عقیدت مند، لمبے بال والے شاہ صاحب کے مزار پر چڑھاوے کے لیے بڑے چاؤ سے مٹھائی کا دونہ خریدتا ہے اور فضائے آسمانی سے اتری ہوئی ایک چیل جھپٹا مار کر دونہ کو نذرانہ پیش کرنے والے کی حد نظر سے بھی بالاتر بلندی پر پہنچا دیتی ہے۔ اس وقت کا سماں بھی خالی از دلچسپی نہیں تا مٹھائی بیچنے والا خوش کہ ایک اور دونے کے بکنے کی بات پکی ہوئی۔ دیکھنے والے خوش کہ بلا پیسہ خرچ کیے تماشہ دیکھنے کو ملا چیل خوش چیل کے بچے خوش اور شاید دونہ کی مٹھائی بھی خوش کہ خطاکار انسانوں کے پلے پڑنے کے بجائے معصوم بچوں کا آذوقہ بنی۔ البتہ خوشی سے محروم ہے بیچارا خریدار جو خجالت اور حماقت کی تصویر بنا ہوا کبھی زمین کو دیکھتا ہے۔ کبھی آسمان کو۔ اس کا کھسیانہ پن قابلِ رحم تو ہوتا ہے۔ مگر دیکھنے والے باوجود کوشش کے ہنسے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ناناجان کا چشمہ آنکھوں پر لگا ہوتا ہے اور ناناجان کی آنکھیں چشمے کو ڈھونڈتی ہیں۔ میز کے اوپر۔ میز کے نیچے۔ جیبوں میں۔ کتابوں میں۔ کاغذوں میں۔ یہاں وہاں۔ ناناجان چشمہ کی کھوج میں سرگرداں ہوکر آخر نواسے نواسیوں سے

پوچھتے ہیں ارے کمبختو کبھی چشمہ تو نہیں دیکھا؟ یہ سب حیرت سے نانا جان کے روئے مبارک پر نظر ڈالتے ہیں اور خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے ایسے فہمندانہ انداز میں کہ گویا چشمۂ حیات کی سراغ رسانی کر رہے ہیں۔ نانا جان کو بتاتے ہیں کہ چشمہ تو ناک پر متمکن ہے۔ نانا جان خلائی آنکھوں کو پھیلا کر اپنے چشمہ کو دیکھنے کی نامکمل کوشش کرتے ہیں اور ڈالے ہاں کے ساتھ مسکراہٹ کی تہوں میں احساس حماقت کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ ادھر بچے آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ اب تو بڑھاپے میں نانا جان کو ناک کان تک کی خبر نہیں رہتی۔

جب برسات کے موسم میں بچوں کی بڑی خالہ جان۔ جو نہ صرف بڑی ہیں بلکہ خوب موٹی بھی ہیں۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ باوجود منع کیے جانے کے بیچ صحن سے ہو کر گزرتی ہیں پھسلتی ہیں سنبھلتی ہیں۔ اور پھر سنبھل کر پھسلتی ہیں۔ تو دالان سے دیکھنے والے اس موٹاپے کے باوجود ان کی حیرت خیز پھرتی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیچڑ میں لت پت خالہ جان کی خفت مآب ہنسی۔ اور ان کے غیر ضروری گوشت کی تہوں کا ارتعاش قابل دید ہوتا ہے۔

خیر یہ سب تو معمول کی باتیں ہیں۔ لیکن خود اپنی نسبت احمق پن کا احساس پیدا کرنے والے مواقع میں وہ موقع ایک ممتاز اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے جب گراں بار مادر دلہن کی آبادی میں ایک تازہ اضافہ کی خوشخبری سننے کے لیے انسان کسی زنانہ ہسپتال کے احاطہ میں دیوانہ وار چہل قدمی کرتا نظر آتا ہے۔ اگر احساس حماقت میں کچھ کمی ہوتی ہے تو وہ نرسوں سے احمقانہ سوالات پوچھنے اور بے تکے جوابات سننے سے پوری ہو جاتی ہے۔ چہرہ متوحش۔ باتیں الجھی الجھی۔ تقریر میں بے ربطی۔ حرکات میں بد نظمی۔ اپنی حالیہ مکمل بے بسی کا احساس۔ یہ سب باتیں انسان کو یاد دلاتی ہیں کہ بڑی دھوم دھام سے احمق بنایا گیا تھا۔ احمق بنا تھا۔ اور اس وقت بھی احمق ہے۔ گھر گرہستی والے عجائب خانہ کی ملکیت کسی دوسرے سے منسوب سمجھے جانے کی خواہش مرغوب خاطر ہوتی ہے اور سطحی اظہار بے تعلقی موجب تسلی ہوتی ہے۔ مگر یہاں یہ راہ نجات بھی ممکن نہیں ہوتی۔ یہاں بے تعلقی کا اظہار خطرناک روش ہے۔ ذمہ داری سے پہلو تہی مردانہ ملوے ہمت کی نفی ہے۔ اس موقع پر یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ اس تمام پریشانی کو کسی دوسرے کے سر منڈھ دیا جائے۔ اور یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ دوست احباب اس بدحواسی کے عینی شاہد بنیں۔

مزید لطف کی بات یہ ہے کہ جب جملہ مراحل بخیر و خوبی طے ہو جاتے ہیں اور اسپتال کی کارپردازدیوانہ کو پھر اپنا کر چاروں طرف سے حصار باندھ لیتی ہیں، تو اچھے اچھے عقلمند نہ محض بے وقوف نظر آتے ہیں۔ بلکہ صحیح معنوں میں بے وقوف بنتے ہیں۔ اور پھر جب دوست احباب کا مجمع ہوتا ہے۔ مبارک باد کے تحفے پیش کیے ہیں۔ دعوت کھلائی جاتی ہے۔ تقریریں ہوتی ہیں۔ تعریفیں ہوتی ہیں۔ تو خاصے کہنہ مشق مقرروں کی زبان سے دو چار جوابی جملوں کا نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض منکسر مزاج تو اس درجہ خبط الحواس دیکھے گئے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کی اس دین پر احباب کا شکریہ ادا کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور اس طرح اپنے احمق پن کی سند پر مہر تصدیق مہیا کر دیتے ہیں۔ اور پھر جب تالیاں بجتی ہیں قہقہے بلند ہوتے ہیں تو اپنی تقریر کے برمحل اور مناسب حال ہونے کے تصور سے شاداں و فرحاں نظر آتے ہیں۔ (بشکریہ کتاب الکھنؤ)

شعرائے کہنہ

آرزو

۱۶۸۷ء[۱] ———— ۱۷۵۶ء

سراج الدین علی خاں، نام ۔ آرزو تخلص، معروف بہ خان آرزو۔ والد کا نام حسام الدین، حسام، وطن آگرہ، نسبی سلسلہ شاہ محمد غوث گوالیاری سے ملتا ہے۔ میر تقی میر کے (سوتیلے) ماموں بھی تھے۔ چوبیس برس کے سن میں تعلیم مکمل کرلی تھی اور گوالیار میں ملازم ہو گئے تھے۔ مگر وہاں جی نہ لگا اور ۱۷۱۹ء میں دہلی چلے آئے۔ نادر شاہی حملے کی وجہ سے جب دہلی کی فضا خراب ہونے لگی تو لکھنؤ چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ مگر وصیت کے مطابق لاش کو دہلی لاکر دفن کیا گیا۔

خان آرزو دراصل فارسی کے شاعر تھے اردو میں انھوں نے بہت کم کہا ہے اس کے باوجود اردو کے تمام شعرا ان کی استادی کے قائل ہیں۔ انھیں کے مشورے سے سودا نے اُردو شاعری کی طرف توجہ کی تھی۔ میر نے لکھا ہے کہ اپنے دور کے وہ سب سے بڑے محقق اور شاعر شیریں بیاں تھے۔ گردیزی نے ان کو چراغ محفلِ فصاحت قرار دیا ہے، میر حسن کے نزدیک ہندوستان میں امیر خسرو کے بعد یہی سب سے بڑے شاعر ہیں۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ اُردو کو ان کے ساتھ وہی نسبت ہے جو ارسطو کو فلسفے کے ساتھ۔ غرض معاصرین سے لے کر بعد کی نسل تک کے تمام بڑے شاعروں، تذکرہ نگاروں اور مبصروں نے ان کی علمیت کا اعتراف اور ان کی متعدد صلاحیتوں کا اقرار کیا ہے۔

فارسی پر تو ان کو عبور حاصل تھا ہی اردو میں بھی جو خاص خاص محاورے اور روزمرہ وہ نظم کر گئے ہیں وہ اپنی جگہ آج بھی لطیف اور مستند ہیں۔

تقریباً تیس ہزار فارسی اشعار پر مشتمل ایک ضخیم دیوان کے علاوہ متعدد کتابیں اور

---

[۱] رام بابو سکسینہ نے ولادت کا سن ۱۶۸۹ لکھا ہے۔

رسالے بھی تصنیف و ترتیب دیے۔ جن میں بعض کے نام یہ ہیں۔ رسالۂ تنبیہ الغافلین، جس میں شیخ علی حزیں کے کلام پر اعتراضات ہیں "سراج اللغات" (فارسی) اور ایک لغت اردو موسوم "بہ غرائب اللغات" فن بلاغت و معانی کے بیان میں دو کتابیں، "مجمع النفائس" کے عنوان سے ایک تذکرہ جس میں آغاز سے معاصرین تک (فارسی گو) شعرا کا ذکر ہے۔

انتخاب

کہا یوں صاحب محمل نے سن کر شور مجنوں کا
تکلف کیا جو نالہ بے اثر مثل جرس پہنچا

رہا جوش بہار اللہ اس فصل گریوں ہی، تو بلبل نے
چمن میں دست گلچیں سے عجب رنج اس برس پہنچا

ہر صبح آوتا ہے تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو، خورشید خاوری کو

دل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک
کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیاگری کو

اس تند خو صنم سے ملنے لگا ہوں جب سے
ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو

اب تجھ بن ہیں ہم اس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا، بختوں کی یاوری کو

پروانے کی الفت سی روتے روتے
شمع نے جان دیا صبح کے ہوتے ہوتے

داغ چھوٹا نہیں، یہ کس کا لہو ہے قاتل
ہاتھ بھی دکھ گئے، دامن ترا دھوتے دھوتے

کس پری رو سے ہوئی، شب کو مری چشم دوچار
کہ میں دیوانہ اٹھا، خواب سے سوتے سوتے

عبث دل بے کسی اپنی پہ توں ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دوانے عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے

دریا عرق میں ڈوبا تجھ صاف تن کے آگے
موتی نے کان پکڑے تیرے سخن کے آگے

تجھ زلف میں اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے
بے کار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے

رکھے سی پارۂ گل، کھول آگے عندلیبوں کے
چمن کے بیچ گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

مے خانے آج جا کر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں
زندگانی کا کیا بھروسا ہے

نئی مطبوعات

تاریخ الامت ہشتم (تاریخ اسلام)	مولانا محمد اسلم جیراجپوری		ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵
ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں	ڈاکٹر سید عابد حسین	۸/-	" " " " " "
انجمن آرزو (نظم)	اختر اورینوی	۴/-	" سنگم کتاب گھر، دہلی ۶
کالے دھبے گورے بدن (ناول)	جمنا داس اختر	۴/-	" لاجپت رائے اینڈ سنز دہلی ۶
غیر مسلموں کی نظر میں اسلامی نظریہ	مولوی عبدالصمد رحمانی	۶۵/-	" دینی بک ڈپو، دہلی ۶
عورت (ناول) مصنف سیارام سرن گپت ترجمہ رضیہ سجاد ظہیر		۴/-	" ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی
نامور امریکی خواتین کی داستان حیات ترجمہ ٹی۔ ایس۔ نرالا		۲/-	" خاتون مشرق، دہلی ۶
راجہ صاحب (ناول)	شوکت تھانوی	۲/۵۰	" محمود پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶
علی اور عائشہ (تاریخ و سوانح)	عمر ابو النصر	۳/۵۰	" میر اینڈ کمپنی، دہلی ۶
عزیمت و دعوت (مذہب)	مولانا ابوالکلام آزاد	۲/۷۵	" اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶
غالب (ادبی)	سید عبداللطیف پی ایچ ڈی	۳/۵۰	" کتب خانہ نذیریہ، دہلی ۶
قصہ حسن و دل (ادبی)	پروفیسر جاوید وششٹ	۵/-	" " " " "
فضائل نبوی (مذہب)	سعد حسن	۱/-	" تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶
عکسی جامع اردو لغات	مرتبہ تاج پبلشنگ ہاؤس	۲/-	" " " " "
صاحبزادی (ناول)	شوکت تھانوی	۶/-	" " " " "
برف کی دیوار (")	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰	" کتاب پبلشرز، لکھنؤ ۳
لب و رخسار (نظم)	منظر سلیم	۴/۵۰	" " "
کانچ کی چوڑیاں (ناول)	گلشن نندہ	۳/۵۰	" ستارہ پبلیکیشنز، دہلی ۶
دھوپ چھاؤں (")	عارف مارہروی	۵/-	" " " " "
بہو بیگم (")	عادل رشید	۵/۵۰	" " " " "

زیر طبع کتابیں

سیتا ہرن (ناولٹ)	قرۃ العین حیدر	۲/۲۵	حلقہ ادب، بمبئی
ہمارے مصور (سوانح)	حمید پٹھان	۲/۵۰	" " "

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

بچّوں کی دنیا

از: تلوک چند محروم

(سن طباعت ۱۹۶۴ء)

صفحات: ۱۲۴ سائز: $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$

قیمت: چار روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵

جناب محروم کی ایک کتاب 'بہارِ طفلی' کا ذکر ان صفحوں میں آچکا ہے بچوں کی دنیا ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے اور "عروس جمیل و لباس حریر" کے مصداق بہت اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ جناب محروم ان چند گنے شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے بچوں کی طرف بھی توجہ کی ورنہ ہمارے اونچے درجے کے شاعر بچوں کے لیے کچھ لکھنے میں بڑی دقت محسوس کرتے ہیں۔ مگر جناب محروم نے اس کوچے میں بھی اپنا مقام حاصل کر لیا اور بچوں کی یا بچوں والی شاعری کو بہت اونچے معیار تک پہنچا دیا۔

اس میدان میں جناب محروم کی کامیابی کی ایک خاص وجہ ہے مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی طرح محروم صاحب کی زندگی کا کافی حصہ درس و تدریس میں گزرا ہے انھیں بچوں کی نفسیات سے گہری واقفیت ہو گئی ہے۔ ان سے بات کرنے کا ڈھب آ گیا ہے۔ یہ معلوم ہو گیا ہے کہ کیا بات بچے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کیا بات ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ یہ معلوم ہو گیا ہے کہ کس انداز کی گفتگو بچوں کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ محروم صاحب نے اپنی اس واقفیت اور تجربے سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور بہت سہل انداز سادہ زبان میں انھیں نظموں کی شکل میں ڈھالا ہے۔ اس مجموعے میں زیادہ تر نظمیں اخلاقی نصائح پر مشتمل ہیں کچھ مشاہدۂ فطرت پر ہیں۔ آخر میں چند ترجمے ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ یہ بھی طبع زاد معلوم ہوتی ہیں۔ سب سے آخر میں ایک فرہنگ ہے۔ نظموں میں کہیں کہیں مشکل الفاظ آ گئے ہیں۔ فرہنگ میں ان کے معنی دیے گئے ہیں۔

کتاب کی لکھائی چھپائی بھی بہت اچھی ہے۔ ہر دوسرے تیسرے صفحے پر بلاک کی رنگین تصویریں ہیں۔ ان تصویروں نے کتاب کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ گرد پوش دو رنگا اور بہت دیدہ زیب ہے۔ غرض ناشر نے کتاب کو حسین سے حسین تر بنانے میں پوری ہنرمندی نفاست اور سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔

(محمد حسین حسّان)

مطلع وطن

(حصہ اول)

مصنف: سید علی مہدی صاحب زیدی ایم، اے
ایل ایل بی ایڈوکیٹ

صفحات: ۱۶۰ سائز: $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$

قیمت: پانچ روپے

ملنے کا پتہ: شامی منزل، بلرام پور ضلع گونڈہ (یوپی)

سید علی مہدی صاحب نے اس کتاب میں بھارت کی ابتدائی تاریخ کو نظم کیا ہے، ۱۲ سو سے زیادہ اشعار میں انھوں نے ست جگ سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک کی "ما قبل تاریخ" زمانہ کی منظوم تاریخ رامائن اور مہا بھارت کا سہارا لے کر نظم کی ہے۔ اور سرسری ورق گردانی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کتھا بڑی روانی سے نظم کی ہے، اس بات کے ثبوت میں کچھ اشعار اور مصرعے پیش کرتا ہوں۔

"دیوتاؤں کی حقیقت آج بھی ایک راز ہے"

کوثر و تسنیم سے گنگ و جمن بہنے لگے

جس کے انداز روانی پہ فدا ابر کرم موج کے ہر بل میں ہے شیو کی جٹا کا پیچ و خم

دیوتاؤں کا گماں ہو جائے ایسے تھے بشر

زندگی کے پھول کو کانٹوں سے حاصل تھی نجات ہر بشر کی سانس سے آتی تھی خوشبوئے حیات

رام کو کیا پوچھتے ہو حسن کی تصویر تھے

پیار کو بھی ناز تھا آنکھوں میں ایسا پیار تھا حسن اپنے حسن کا خود طالب دیدار تھا

باپ کی خاطر لٹا دی اپنی پیاری زندگی

آرزوؤں کا چمن نذر بیاباں کر دیا باپ کے وعدے کا دامن موتیوں سے بھر دیا

کرتی تھیں پیڑوں کی شاخیں جھک کے سیتا کو سلام
پتّے پتّے سے جب آتی تھی صدائے رام رام

آبرو کی جستجو میں ملک کے باہر چلے　　عزم کا پل باندھنے والے سمندر پر چلے
وار دیروں کے نہ تھے پر ماتما کا قہر تھا
چار سوان نیت کا بول بالا ہو گیا　　بزم عالم میں اندھیرا تھا اجالا ہو گیا
اپنے بھارت ورش میں ایسی مہا بھارت ہوئی
خون ناحق کے بہانے کا کچھ ان کو غم نہ تھا　　ہر سپاہی کج ادائی میں کماں سے کم نہ تھا

اس انداز میں یہ پوری تاریخ نظم کی گئی ہے اور یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ اردو کے شاعر اور ادیب بھارت کی پرانی تاریخ اور تہذیب سے کس قدر لگاؤ رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب کی جائز و واجبی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

کیا اچھا ہو اگر اس کا ہندی ایڈیشن بھی شائع کیا جا سکے۔ بہرکیف ہم مصنف کو ان کی محنت و کاوش پر مبارک باد دیتے ہیں۔　　(ظل عباس عباسی)

❀

زندہ دل جواہر
نہرو تصویروں کی زبانی

قیمت فی کتاب: ایک روپیہ
ناشر: سٹار پبلیکیشنز
۲۷۱۵ دریا گنج، دہلی

سورگیہ پنڈت جواہر لعل نہرو کی اور بہت سی خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہمیشہ موقع محل کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا کرتے تھے۔ وہ سیاسی میدان میں ایک عالی دماغ سیاست داں اور حکومت کے معاملوں میں ایک عظیم مدبّر تو تھے ہی لیکن اسی سنجیدہ کردار کے ساتھ دوسری طرف وہ ایک ہنس مکھ اور زندہ دل شخصیت کے بھی مالک تھے۔ وہ اپنی بے اندازہ مصروفیت اور لاتعداد تفکرات میں گھرے رہنے کے باوجود تفریح یا ہنسی مذاق کا وقت بھی نکال لیتے جو اپنی جگہ خود ایک بہت بڑی بات تھی۔ کتاب "زندہ دل جواہر" میں ان کی زندگی کے ایسے ہی تقریباً ۱۰۰ واقعات لطیفوں کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں جنہیں پڑھ کر ہمارے دلوں میں اس عظیم ہستی کی عظمت اور عقیدت سوا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کتاب میں مختلف دور اور مختلف زمانوں کی تقریباً دو درجن

تصاویر شامل کرکے اس کی افادیت میں اور اضافہ کردیا ہے۔

دوسری کتاب "نہرو تصویروں کی زبانی" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، پنڈت نہرو کی زندگی کی کہانی تصویروں کےذریعے پیش کرتی ہے۔ پنڈت جی کے جائے پیدائش آنند بھون" سے لے کر ان کے انتقال کی آخری رسومات تک تقریباً ۶۶ تصاویر دیکھ کر ان کی زندگی کی کسی حد تک مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے مختلف عنوانات کے تحت دلچسپ انداز میں مزید تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ ان کے انتقال پر دنیا کی عظیم شخصیتوں کے جو تعزیتی پیغام آئے تھے وہ بھی کتاب میں شامل ہیں کتاب کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے نہرو جی کے کچھ اقوال اور کچھ یادیں کچھ مذاق" کے عنوان سے بھی کچھ صفحات کتاب میں شامل کیے ہیں اتنی اچھی اور سستی کتابیں شائع کرنے کے لیے ناشر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (ریحان احمد عباسی)

(بقیہ صـ۲۲ کا)

کالماتِ افلاطون		مجلد ۵/-	معدنی وباغت	مجلد	۲/۵۰
صرف ونحو			**معاشیات**		
سباق النحو	اول	غیر مجلد ۳۷/-	معاشیات کی ماہیت اہمیت	غیر مجلد	۲/-
″ ″	دوم	″ ۲۵/-	بابائے بینک	″	۷۵/-
یلائے لطافت		″ ۲/۵۰	″ مزدور		۵۶/-
تعلیم ، سائنس			**مذہب**		
ریئے تعلیم	اول	مجلد ۳/-	تہذیب اسلامی	غیر مجلد	۱/۵۰
″ ″	دوم	غیر مجلد ۳/۱۲	حقیقت اسلام	″	۷۵/-
ی اور مشین		″ ۵/-	**لغات**		
لی سے کرشمے		″ ۱/۵۰	**فرہنگ اصطلاحات مجلد**		
ے انسان کی زندگی		″ ۱/۷۵	انگریزی پیشہ وران	غیر مجلد	۱۸/۵۰
ستان ریاضی		″ ۲/۵۰	اول تا ہشتم ایک سٹ		

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

انجمن ترقی اردو کی وہ مطبوعات جو ۱۹۴۷ء سے پہلے شائع ہوئی تھیں

اور

اب کم یاب ہیں !!

ادب

الف لیلہ سوم	″	۴/-
″ ″ چہارم	مجلد	۵/-
″ ″ پنجم	غیر مجلد	۴/۵۰
″ ″ ششم	″	۴/۵۰
″ ″ ہفتم	″	۳/۲۵
انشائے داغ	″	۱/۷۵
ادب الجاہلی	مجلد	۶/-
آرائش محفل	″	۴/۵۰
اخوان الصفا	غیر مجلد	-/۷۵
جوامع الحکایات اول	″	۲/۲۵
″ دوم	مجلد	۴/-
جائزہ زبان اردو	″	۲/۵۰
حکایات آغانی	″	۵/-
خمسہ کیفی	غیر مجلد	-/۲۵
دفتر فرعون اول	″	۲/-
″ ″ دوم	″	۲/-
طربیہ خداوندی	مجلد	۴/-
فن صحافت	غیر مجلد	۲/۲۵
معمار اعظم	غیر مجلد	۱/۲۵
ہمارا رسم الخط	″	-/۲۵
ہماری قومی زبان	″	-/۵۰

نظم

انتخاب وحید	غیر مجلد	۱/-
″ داغ	″	۱/۷۵
″ ذوق و ظفر	مجلد	۳/-
جگ بیتی	غیر مجلد	-/۵۰
حفظ اللسان خالق باری	″	۱/۲۵
دیوان فائز	مجلد	۳/۵۰
″ آثر	″	۱/۵۰
″ تاباں	″	۳/-
″ یقین	غیر مجلد	۱/۵۰
″ جوشش	″	۱/۱۳
″ نظیر اکبرآبادی	مجلد	۳/۵۰
″ بہرام	″	۲/۲۵
سر نظم ہاشمی	غیر مجلد	-/۲۵
مثنوی قطب مشتری	″	۱/۵۰

تاریخ ادب

ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ مجلد ۴/-

ترکوں کی اسلامی خدمات اور ان کی زبان وادبیات غیر مجلد ۱/۵۰
خطبات گارساں دتاسی مجلد ۵/۵۰
مقالات گارساں تاسی اول غیر مجلد ۴/-
" " " دوم " ۴/-
مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر " -/۵۰

تنقید

پرتھوی راج راسا مجلد ۴/۷۵
چند تنقیدات عبدالحق غیر مجلد -/۵۰
خطبات عبدالحق دوم " ۱/۵۰
فردوسی پر چار مقالے " ۲/۵۰
نصرتی مجلد ۴/-

تذکرے

تذکرہ ہندی غیر مجلد ۱/۶۲
" ریختہ گویاں " ۱/۵۰
" شعرائے اردو مجلد ۲/-
" گلزار ابراہیم گلشن ہند غیر مجلد ۳/-
ریاض الصفا مجلد ۳/-
رند پارسا (تذکرہ ریاض) " ۵/۲۵
گل عجائب " ۲/۱۲

تاریخ وسیاسیات

اخبار مجموعہ مجلد ۳/۵۰
بزم اکبر " ۴/۷۵
تاریخ اخلاق یورپ اول غیر مجلد ۲/۵۰
" " " دوم " ۲/-

تاریخ دستور ہند غیر مجلد ۲/۲۵
" تمدن اول " ۱/۵۰
" " دوم " ۱/۵۰
" مگدھ مجلد ۴/۷۵
" الحکماء " ۴/۵۰
" تاریخ بہمینہ منظوم اول مجلد ۷/۳
" " " دوم " ۴/-
سفرنامہ حکیم ناصر خسرو مجلد ۳/-
سراج الدولہ " ۴/-
علم الاقوام اول " ۳/۲۵
" دوم " ۳/۲۵
گوتم بدھ اور اس کا مت غیر مجلد ۱/۵۰
ملک محمد جائسی مجلد ۲/-
مختصر تاریخ تمدن غیر مجلد ۲/۵۰
مشاہیر یونان و روما اول مجلد ۴/۵۰
" " دوم " ۵/۲۵
" " سوم غیر مجلد ۴/۵۰
" " چہارم " ۴/۵۰
مانڈو شادی آباد مجلد ۳/-
مرحوم دہلی کالج " ۲/۵۰
نسل اور سلطنت غیر مجلد ۱/۶۲

فلسفہ

بقول زردشت غیر مجلد ۲/-
تنقید عقل محض مجلد ۹/۵۰
داستان دانش " ۴/-

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

ادبی خبریں

خواجہ عبدالحیٔ فاروقی کا انتقال

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قدیم استاد دینیات مولانا خواجہ عبدالحیٔ فاروقی کا ۸ر جنوری ۶۵ء کو لاہور میں انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم نے ۱۹۴۸ء سے پاکستان میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی تھیں جن میں سے کئی قابل ذکر کتابیں مکتبہ جامعہ سے ہی شائع ہوئیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) ریاستی شاخ مہاراشٹر کے نئے انتخابات

بمبئی۔ ۳۱ دسمبر۔ جناب مومن یوسف حسن صاحب (جائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو علاقہ (مہاراشٹر) نے اطلاع دی ہے کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۴ء کو مذکورہ بالا ریاستی شاخ کا سالانہ اجلاس صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں زیر صدارت جناب شہاب الدین دسنوی صاحب منعقد ہوا۔ حسب ذیل عہدے داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر: جناب سکندر علی وجد۔ جنرل سکریٹری: جناب شاہد علی خاں (انچارج مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شاخ بمبئی) خازن: جناب سید شہاب الدین دسنوی۔ نیز علاقہ جات انتخابات بھی عمل میں آئے۔

ساہتیہ اکیڈمی کا انعام

ساہتیہ اکیڈمی نے جناب آنند نرائن ملا کے شعری مجموعے "میری حدیث عمر گریزاں" کو ۱۹۶۳ء کی اردو کی بہترین تصنیف قرار دیتے ہوئے مصنف کو پانچ ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا۔

ایک چادر میلی سی ملیالم زبان میں

راجندر سنگھ بیدی کا مشہور ناولٹ "ایک چادر میلی سی" جو اردو زبان

میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوا تھا اب ملیالم زبان میں بھی شائع ہو گیا ہے ملیالم ترجمہ ایم۔ این۔ ستیارتھی (کالی کٹ) نے کیا ہے۔

رومانی گیت اردو میں لکھے گئے رومانی گیتوں کا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے، شعراء حضرات سے التماس ہے کہ اس مجموعہ کے لیے اپنے منتخب گیت ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔ (معصوم شیر گھاٹوی، بہادت ٹولی بتیا ۲، چمپارن (بہار)

اردو میڈیم میں تعلیم لینے والے بچوں کی فیس معاف!

جمشید پور۔ پتہ چلا ہے کہ کریمیہ ٹرسٹ جمشید پور کے ٹرسٹی جناب ایس ایم شفیق نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ بچے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے اگر وہ اردو میڈیم میں سرکاری نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ان کی کل فیس معاف کر دی جائے گی۔ ایسے بچوں کے سرپرست سنٹرل کریمیہ پرائمری اسکول، سنٹرل کریمیہ مڈل اسکول یا سنٹرل کریمیہ ہائی اسکول میں اپنے بچوں کا داخلہ کرائیں۔ شفیق صاحب نے جو اسکول بڑا کے سکریٹری بھی ہیں، مزید بتایا کہ اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے والے غیر اردو داں طبقہ کی ہمت افزائی کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔ ایسے بچوں کی فیس معافی کے علاوہ ان کو کتابوں کی سہولت بھی دی جائے گی۔

پیرس میں قدیم ہندوستانی تصاویر اور مسودات کی نمائش!

پیرس۔ یہاں آج کل ایک نمائش ہو رہی ہے۔ جس میں ہندوستانی تصاویر اور قلمی نسخے رکھے گئے ہیں۔ یہ نوادرات بارہویں صدی سے سترھویں صدی تک کے ہیں۔ ان نوادرات میں "اتر دھایا سوترا"، کا قلمی نسخہ جو ۱۴۹۲ء کی یادگار ہے۔ اس کے علاوہ کالی داس کے میگھ دوت کا قلمی نسخہ جو ۱۶۶۹ء میں لکھا گیا، شامل کیا گیا ہے۔

ہمیں افسوس ہے چند مجبوریوں کی وجہ سے یہ شمارہ ۲۴ صفحات کا ہی شائع کیا جا رہا ہے (ادارہ)

سالانہ [illegible]	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵	فی پرچہ [illegible]

[illegible] لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ [illegible]

کچھ اچھی کتابیں

نظم

اردو شاعری کا انتخاب	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۷/۵
آتش گل	جگر مرادآبادی	۶/-
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	۴/۵
رم خیال	سیدہ فرحت	۱/-
جوئے شیر	آنند نرائن مُلّا	۵/-
حدیث دل	غلام ربّانی تاباں	۲/۲۵
حرفِ تمنا	میکش اکبرآبادی	۲/-
دو نیم	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۲/۲۵
شہر آرزو	باقر مہدی	۲/۵
صدائے دل	ساحر بھوپالی	۲/-
فروزاں	جذبی	۲/۲۵
متاعِ تسکیں	تسکین قریشی	۲/-

Regd. No. D. 58 February, 1965

Kitab Numa

JAMIA NAGAR, NEW DELHI. 25.

کتاب نما

ماہنامہ

نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

مینیجنگ ایڈیٹر
غلام ربانی تاباں

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

شمارہ نمبر ۳	مارچ ۱۹۶۵ء	جلد نمبر ۶

اشاریہ

ہمیں خوشی ہے کہ کتاب نما، جون ۶۴ء کے شمارے سے جب سے یہ آزادی کے بعد سے دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا، اب تک نہایت باقاعدگی اور پابندی سے شائع ہو رہا ہے اور اب اس کی اشاعت بھی بڑھا کر پہلے سے پانچ گنا کر دی گئی ہے۔ ہماری برابر یہ کوشش ہے کہ یہ نہ صرف اسی طرح زیادہ سے زیادہ شائع ہوتا رہے بلکہ اس میں کچھ صفحات وغیرہ کا بھی اضافہ کر کے اسے زیادہ مفید اور زیادہ موثر بنا دیا جائے۔ ہمیں اُمید ہے اگر آپ کی ہمدردی اور پرخلوص تعاون اسی طرح ہمارے شاملِ حال رہا تو ہم جلد ہی اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جائیں گے۔

پچھلے دنوں ہم نے نئی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ کچھ پرانی کتابوں کے نئے اڈیشن بھی شائع کیے ہیں۔ ان میں جناب پروفیسر محمد مجیب کی کتاب "آزمائش"، جناب مالک رام کی کتاب "ذکر غالب" جس میں کافی ترمیم و اضافہ بھی ہوا ہے اور محترمہ سلطانہ آصف فیضی کی کتاب "عروس نیل" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ منشی پریم چند کے ناول "گئودان" اور پروفیسر محمد مجیب صاحب کی تصانیف "خانہ جنگی" اور "دنیا کی کہانی" کے بھی جو کچھ عرصے سے ختم ہیں، اب نئے اڈیشن بہت جلد تیار ہو رہے ہیں۔

گزشتہ مہینے کا کتاب نما کسی مجبوری کی وجہ سے صرف ۲۴ صفحات کا ہی شائع کیا گیا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہم موجودہ شمارہ ۴۰ صفحات کا شائع کر رہے ہیں۔ اس کے بعد آئندہ فی الحال حسبِ سابق یہ ۳۲ صفحات پر ہی شائع ہوتا رہے گا۔

ڈاکٹر سید عابد حسین

ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں

(کتاب "ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" کے مقدمے سے اقتباس)

نیا ہندوستان آج یک جہتی اور انتشار کا ایک عجیب ملا جلا منظر پیش کرتا ہے — ایک طرف وہ سیاسی اتحاد جس کی مثال نہ صرف ہمارے ملک کی بلکہ کسی ایشیائی ملک کی تاریخ میں بھی مشکل سے نظر آئے گی۔ دوسری طرف وہ تہذیبی اور معاشرتی اختلافات اور رنگا رنگی کہ شاید ہی کسی خطۂ ارض میں جو ایک ملک کہلاتا ہے پائی جاتی ہو۔

سیاسی اتحاد سے ہماری مراد سیاسی مقاصد اور تنظیم کی وہ یک جہتی ہے جو حکمراں جماعت کے جبر سے نہیں بلکہ لوگوں کی اپنی مرضی سے پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی وحدت کا پیدا ہونا صرف عہدِ جدید کی جمہوری ریاستوں میں ممکن ہے جن میں حکومت کی بنیاد رائے عامہ کی قبولیت پر رکھی جاتی ہے۔ عہد قدیم کی جمہوریتیں مثلاً یونانی ریاستیں یا رومی سلطنت جدید معیار کے مطابق دراصل پوری جمہوری نہ تھیں اس لیے کہ وہ اپنے کل باشندوں کی (جن میں لاکھوں غلام بھی شامل تھے) مرضی کی نمائندگی نہیں کرتی تھیں بلکہ صرف آزاد شہریوں کی مرضی کی۔ عہدِ جدید کے یورپ میں ایسی کئی ریاستیں جنھیں ہم حقیقی معنی میں جمہوری کہہ سکتے ہیں صدیوں سے چلی آ رہی ہیں مگر ایشیا میں انیسویں صدی کے آخر تک صرف جاپان میں نمائندہ حکومت کا طریقہ شروع ہوا تھا۔ بیسویں صدی کے شروع سے اور جمہوری ریاستیں وجود میں آنے لگیں اور آزاد جمہوریۂ ہند کے قیام کے بعد تو ایشیا اور افریقہ میں چھوٹے بڑے ملکوں کے مغربی سامراج کے تسلط سے آزاد ہونے اور جمہوری ریاستیں بننے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر ان سب ملکوں میں صرف ایک ہندوستان ہے جس میں سیاسی مقاصد اور تنظیم کی یک جہتی اس حد تک موجود ہے کہ اس کے سہارے ایک مستحکم حکومت قائم ہے ورنہ جہاں دیکھیے ملک کے باشندوں

یں اندرونی سیاسی اور معاشی نقشے، اور بیرونی پالیسی کے بارے میں اتنے زبردست اختلافات ہیں کہ آئے دن حریف طاقتوں میں شدید ٹکر ہوتی رہتی ہے اور فوجی یا عوامی انقلابات کے ذریعے حکومت بدلتی رہتی ہے۔ ہندوستان میں سیاسی پارٹیوں کی باہمی کش مکش اور آبادی کے بعض ٹکڑوں کا علیحدہ ریاست کا مطالبہ دیکھ کر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے سیاسی اتحاد کی بنیادیں بہت کمزور ہیں۔ لیکن جب ہم اپنے ملک کا مقابلہ دوسرے ایشیائی ملکوں کے حالات سے کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں سیاسی اور معاشی پالیسی کے بارے میں اختلافات ہیں تو ضرور مگر اتنے گہرے نہیں کہ ان میں مصالحت پیدا کرنا یا کم سے کم انھیں ایک معقول حد کے اندر رکھنا ممکن ہو۔ ہمارے اتحاد کو بلکہ ہمارے امن و عافیت اور ہماری آزادی اور سلامتی کو جو خطرہ ہے وہ ان سیاسی اختلافات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان تہذیبی اور معاشرتی اختلافات کی وجہ سے ہے جو کسی اور ملک میں اس حد تک اور اس شدت کے ساتھ موجود نہیں ہیں جتنے ہمارے ملک میں۔

جب ہم اپنے آس پاس کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ان ملکوں کو چھوڑ کر جن میں ابھی تک قبائلی نظام کا دور دورہ ہے، عام طور پر افریقہ اور ایشیا کی نئی جمہوری ریاستوں میں سے ہر ایک کے اندر تہذیب و معاشرت کم و بیش یکساں ہے۔ ان میں الگ الگ نسلی گروہ، علاقائی گروہ اور مذہبی جماعتیں تو ضرور ہیں اور ان کی زندگی اور تہذیب بھی کسی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے مگر اس اختلاف کا احساس اتنا شدید نہیں ہے۔

اب اپنے ملک کی طرف آیئے تو یہاں تین طرح کی جماعتیں نظر آتی ہیں ——— ذاتیں، لسانی جماعتیں، مذہبی جماعتیں ——— جن میں تفریق و اختلاف کے احساس نے فرقہ پروری کی شکل اختیار کرلی ہے یعنی ان کو اپنے جداگانہ وجود اور جداگانہ مفاد کا حد سے زیادہ شعور ہے اور اس نے مشترک قومیت اور قومی مفاد کے شعور کو دبالیا ہے اور قومی یک جہتی کی راہ میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ آج ہماری زندگی کا سب سے اہم اور فوری توجہ کا محتاج مسئلہ یہی ہے کہ ہم فرقہ پروری کی ان تینوں قسموں سے کس طرح نبٹیں۔ ان میں سے پہلی قسم یعنی ذاتوں کا وجود ہندوستان کے ساتھ مخصوص ہے اس طرح کی مستقل اور کڑی سماجی درجہ بندی جو دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں پائی جاتی، غالباً ہندوستان میں اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ یہاں رواداری کا تصور دنیا کے اور

ملکوں سے زیادہ اور مساوات کا تصور ان سے کم تھا۔ اس زمانے میں جب فاتح نسلیں یا تو مفتوح نسلوں کا قلع قمع کر دیتی تھیں یا ان کو ان کے وطن سے نکال باہر کرتی تھیں یا انھیں غلام بنا کر رکھتی تھیں۔ ہندوستان میں آنے والی آریہ قوموں نے یہ رواداری برتی کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کو آزاد انسانوں کی حیثیت سے اپنی سماج میں شامل کر لیا اگرچہ ان کو سماجی درجہ بندی میں اتنا نیچا درجہ دیا جو دراصل بعض لحاظ سے غلاموں سے بھی بدتر تھا۔ اس عدم مساوات کی روح نے بہت جلد خود آریوں میں بھی اونچی نیچی ذاتیں بنا دیں۔ بدھ سے لے کر گاندھی تک بہت سے مہاتماؤں نے ذات پات پر مبنی سماجی تفریق کو مذہب کی سچی روح کے خلاف سمجھ کر اس کی دل و جان سے مخالفت کی۔ آج جمہوریت اور ہیومانزم کی قوتیں ذات پروری کو ختم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں اور انھوں نے اس کی جڑ کو ہلا دیا ہے لیکن ابھی اسے گرا نہیں سکی ہیں۔ بیچ میں قومی آزادی کی تحریک نے بظاہر ذات پات کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا تھا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت محض عارضی تھی۔ جب سے ملک آزاد ہوا ہے اور بالغوں کے حق رائے دہندگی کی بنا پر انتخابات شروع ہوئے ہیں ذات پروری کا زور پھر بڑھ گیا ہے اور ذات پات سے وفاداری کا جذبہ اتنا قوی ہے کہ ملک اور قوم سے وفاداری کے لیے بہت کم گنجائش رہ گئی ہے۔ آج بلاشبہ سب سے بڑی انتشار پیدا کرنے والی قوت ذات پروری ہے۔ پھر بھی غور سے دیکھنے والے کو صاف نظر آتا ہے کہ ذات پات کے قدرتی یا الٰہی ہونے کا تصور جو ذات پروری کی روحانی اور اخلاقی بنیاد ہے کمزور ہو چکا ہے اور یہ عمارت کتنے ہی مضبوط مسالے سے کیوں نہ بنی ہو، نیو کے کھوکھلے ہونے کے بعد زیادہ دن نہیں ٹک سکتی۔

لسانی فرقہ پروری دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں مگر ہمارے ملک کی تاریخ میں نسبتاً نئی چیز ہے۔ زبانوں کا اختلاف تو یہاں ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے مگر یہ صورت حال کہ ایک زبان کے بولنے والے کو اپنے کو ایک الگ جماعت یا ذیلی قوم سمجھیں اور اپنے لیے جداگانہ ریاست یا انتظامی یونٹ کا مطالبہ کریں، ابھی پچھلے چالیس پچاس سال سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جب انڈین نیشنل کانگریس

گاندھی جی کی رہنمائی میں سچے معنی میں عوامی سیاسی تحریک بنی تو اسے ملک کے مختلف علاقوں میں عوام تک پہنچنے کے لیے وہاں کی مقامی زبانوں سے کام لینا پڑا۔ اس طرح قدرتی طور پر ہر لسانی علاقہ کانگریس کا ایک تنظیمی یونٹ یا پردیش بن گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ کانگریس نے کچھ زیادہ سوچے سمجھے بغیر ان سیاسی مطالبوں میں جو وہ حکومت سے کر رہی تھی اس مطالبے کو بھی شامل کر لیا کہ ہر لسانی علاقے کو ایک خود اختیاری ریاست بنا دیا جائے۔ اس مطالبے کو دُہراتے دُہراتے لوگ لسانی ریاست کے تصور کے اس قدر عادی ہو گئے کہ جیسے ہی ملک آزاد ہوا کانگریس سے جواب حکومت بن گئی تھی، لسانی ریاستوں کے مطالبے شروع ہو گئے۔ اب کانگریسی حکومت کو یہ اندازہ ہوا کہ لسانی ریاستیں بنانے میں کیا کیا دشواریاں اور پیچیدگیاں ہیں اور وہ ہچر مچر کرنے لگی۔ اگر شروع ہی میں مضبوطی سے اِدھر یا اُدھر کوئی فیصلہ ہو جاتا تو شاید لسانی تفریق کا شعور اتنا زور نہ پکڑتا۔ لیکن ایک عرصے تک حکومت کی پالیسی اس قدر ڈانوا ڈول رہی کہ لسانی ریاستوں کے لیے ایجیٹیشن بڑھتا گیا اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہوتے گئے۔ آخر ریاستوں کی نئی تنظیم لسانی بنیاد پر جہاں تک قابل عمل تھی کر دی گئی۔ لیکن اس عرصے میں لسانی فرقہ پروری کا جوش اتنا بڑھ گیا کہ اب ایک دوسری لسانی ریاستیں بنانے، پرانی ریاستوں کے حدود میں ترمیم کرنے اور ان کی لسانی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کے مطالبے بڑی شدت سے ہو رہے ہیں اور ان سے نبٹنا خاصا مشکل ہو گیا ہے۔

ایک اور چیز جس نے لسانی فرقہ پروری کو شہہ دی ہندوستان کے آئین کی وہ دفعہ بھی ہے جس کی رو سے ہندی کو مرکزی حکومت کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ اس کی وجہ سے علاقائی زبانوں کے بولنے والوں کو یہ اندیشے پیدا ہو گئے کہ ایک تو ہندی کی ترقی ان کی اپنی زبانوں کے نشوونما کو روک دے گی دوسرے ہندی کو مرکز کی زبان بنانے کی وجہ سے انھیں مرکزی ملازمتوں کے لیے ہندی بولنے والوں سے مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے ہر لسانی جماعت کو اپنے جداگانہ اور مستقل وجود کو منوانے کی ضد پیدا ہو گئی۔

پچھلے دو تین برسوں میں لسانی فرقہ پروری کے محرکات کو سمجھنے، لسانی اقلیتوں

کی جائز شکایات کو دور کرنے اور سرکاری زبان کے مسئلے کو قابل اطمینان طریقے پر حل کرنے کی انتہائی کوشش ہو رہی ہے۔ غیر ہندی علاقے کے باشندوں میں سے ان سیاست کاروں کو چھوڑ کر جنھیں واقعات سے سروکار نہیں بلکہ طاقت حاصل کرنے کی مہم میں کسی نہ کسی بہانے ایجیٹیشن کرنا ضروری ہے، اور لوگوں کو رفتہ رفتہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ لسانی فرقہ پروری نہ ضروری ہے نہ مناسب ہے، کیوں کہ ان کی زبانیں اپنے اپنے دائرے میں بے روک ٹوک ترقی کر رہی ہیں اور کرتی رہیں گی، اور ہندی کو مرکزی حکومت کی سرکاری زبان بنانے کا عمل ایسے تدریجی طریقے سے کیا جائے گا کہ ان کے مفاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

غرض دو طرح کی فرقہ پروری یعنی ذات پروری اور لسانی فرقہ پروری بعض وجوہ سے اس وقت بہت شدت پکڑ گئی ہے لیکن آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شدت عارضی ہے اس لیے کہ جن سیاسی وجوہ سے یہ پیدا ہوئی ہے وہ خود عارضی ہیں۔

مگر مذہبی فرقہ پروری کی صورت حال بالکل مختلف ہے۔ وہ لسانی فرقہ پروری کی طرح نئی نہیں بلکہ اپنے پیچھے ایک خاصی طویل تاریخ رکھتی ہے جو اب گئی گزری ہوئی مگر ابھی تک بہت سے لوگوں کے ذہنوں پر جیتی جاگتی یاد کی صورت میں مسلط ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ذات پروری کی طرح اپنا روحانی ا[illegible]لاقی بھرم نہیں کھویا بہت سے لوگ جن کی بصارت زمانے کی بدلتی ہوئی روشنی سے عدم مطابقت کی وجہ سے دھندلی ہو گئی ہے اس کے اندر اخلاق و مذہب کا پرتو دیکھتے ہیں۔ اس لیے دراصل یہی قومی یکجہتی کی راہ میں سب سے بڑی اور زبردست رکاوٹ ہے جس سے ٹکر لینے کے لیے سچے محبان وطن کو ایمان، فکر اور عمل کی ساری قوتیں اکٹھی کرنی ہوں گی۔ مذہبی فرقہ پروری کے یوں تو مختلف مظاہر ہیں لیکن اس کا سب سے نمایاں، سب سے اہم اور سب سے خطرناک مظہر یہ ہے کہ ہندو فرقہ پروری اور مسلم فرقہ پروری کے مقاصد بظاہر مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل دونوں قوتیں ایک ہی سمت کام کر رہی ہیں۔ ایک مسلمانوں کو پیچھے سے علیحدگی کی طرف ڈھکیل رہی ہے دوسری آگے سے کھینچ رہی ہے تاکہ انھیں ہندوستانی قومیت کا ایک لازمی جز نہ بننے دے بلکہ مشترک قومی زندگی سے الگ کر کے ایک سیاسی اقلیت بنا دے۔ فرق صرف اتنا

ہے کہ ایک انھیں غیر محفوظ اقلیت اور دوسری محفوظ اقلیت بنانا چاہتی ہے۔ یہ بحث کہ موجودہ زمانے میں ایک سیاسی اقلیت بن کر رہنا خود ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کس قدر مہلک ثابت ہوگا ہم آگے چل کر کریں گے۔ یہاں تو ہمیں قومی اتحاد اور عام خوشحالی کے نقطۂ نظر سے یہ دیکھنا ہے کہ تقریباً پانچ چھ کروڑ آدمیوں کے اس طرح الگ تھلگ رہنے کا ان عظیم الشان مقاصد پر کتنا تباہ کن اثر پڑے گا جن کو سامنے رکھ کر آزاد ہندوستان نے اپنی اندرونی اور بیرونی پالیسی کی تشکیل کی ہے۔ ہماری اندرونی پالیسی کا خاص مقصد یہ ہے کہ منصوبہ بندی کے ذریعے خوش حالی حاصل کی جائے یعنی ایک ایسی معتدل صنعتی سماج تعمیر کی جائے جو سب لوگوں کے آرام سے بسر کرنے کے لیے کافی دولت پیدا کرے اور اسے انصاف سے تقسیم کرے اور بیرونی پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ سب ملکوں سے دوستانہ تعلقات رکھے جائیں اور ان کی رائے عامہ کو ہموار کر کے امن عالم کو جس کے سر پر تیسری جنگ عظیم کا خطرہ منڈلا رہا ہے قائم رکھنے کی کوشش کی جائے۔

جہاں تک منصوبہ بندی اور صنعت کاری کا تعلق ہے، ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے یہ اتنا عظیم الشان کام ہے اور اس کے لیے اتنی زبردست کوشش کی ضرورت ہے کہ جب تک ساری قوم ــــــ ملک کی آبادی کا ہر ایک ٹکڑا، اس میں سرگرمی سے حصّہ نہ لے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ مگر سیاسی اقلیتوں کی نفسیات کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہندوستان میں مسلمان ایک اقلیت بن کر رہے تو ان میں کبھی وہ جوش، وہ لگن پیدا نہیں ہو سکتی جو ملکی ترقی کے کاموں میں دل و جان سے لگ جانے کے لیے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ملک کی آبادی کا کم و بیش آٹھواں حصّہ جو جغرافی حیثیت سے الگ نہیں بلکہ ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے، اگر بے حسی اور بے دلی کی وجہ سے ملک کے معاشی تعمیر نو میں کام نہ کرے تو ہمارا معاشی نظام کم سے کم جزوی طور پر اسی طرح معطل ہو جائے گا جیسے اعصابی نسیج کے ایک حصے کے بے کار ہو جانے سے جسمانی نظام جزوی طور پر مفلوج ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑا نقصان مسلمانوں کے قومی پالیسی کے نفاذ میں سرگرمی سے حصّہ نہ لینے سے یہ ہوگا کہ ملک دو ایسے قابل قدر مقاصد کے حاصل کرنے میں ان کے تعاون سے محروم ہو جائے گا جن کے حصول میں وہ خاص طور پر مدد دے سکتے ہیں یعنی سماج

کا اشتراکی ڈھانچہ بنانا، اور علاقائی تفریق پسندی کے رجحان کو دبا کر قومی یکجہتی کی روح کو ابھارنا۔

سماج کے اشتراکی ڈھانچے کی تجویز دولت کی منصفانہ تقسیم کے تصور پر مبنی ہے جو اسلام کے معاشی تصورات کی روح ہے اور پھر اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشی مشکلات کے حل ہونے کی امید ہے۔ اس لیے اگر ان کو وضاحت سے سمجھایا جائے کہ اسے مارکسزم یا کسی اور مخالف مذہب ازم سے کوئی سروکار نہیں بلکہ اس کی تہ میں محض معاشی انصاف کا جذبہ ہے تو ان کے دل کو ضرور لگے گا اور وہ اس کو عملی جامہ پہنانے میں جوش اور خلوص سے مدد کریں گے۔ اس بات پر ہم آگے چل کر کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آج بھی جب ہندوستانی مسلمان اپنے مستقبل کے بارے میں ایک ذہنی تاریکی کے عالم میں ہیں، وہ چیز جو کبھی کبھی اندھیرے میں روشنی کی جھلک دکھاتی ہے۔ یہی اشتراکی ڈھانچے کا خیال ہے۔ اس لیے یہ توقع کرنا بیجا نہیں کہ جب وہ "چہ کنم" کی حالت سے نکل کر یکسوئی سے سوچنے کے قابل ہوں گے تو اس عام تصور کے سرگرم حامی بن جائیں گے اور سماج کے اشتراکی ڈھانچے کی تحریک کو صحیح رخ دینے اور آگے بڑھانے میں ایک موثر قوت ثابت ہوں گے بشرطیکہ وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیئے جائیں کہ وہ باہر کے آدمی ہیں جن کا قومی زندگی کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں۔

اسی طرح علاقائی تفریق پسندی کے مقابلے میں قومی یکجہتی کا جھنڈا بلند کرنے کی مسلمانوں میں بالقوۃ بڑی صلاحیت ہے جس کا قوت سے فعل میں آنا اس پر موقوف ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہندوستانی قوم کا ایک لازمی جز سمجھیں۔ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ مسلمان جس علاقے میں رہتے ہیں اس سے انھیں لگاؤ نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ سیاسی شعور رکھنے والے مسلمان خواہ ملک کے کسی حصے کے باشندے ہوں مجموعی طور پر ایک کل ہند اندازِ نظر رکھتے ہیں جو تاریخی قوتوں نے ان میں پیدا کیا ہے۔ یہ اب تک قومی اندازِ نظر نہیں ہے مگر اس میں قدرتی طور پر قومی بننے کا رجحان موجود ہے۔ اس لیے کہ جب مسلمان کسی مسئلے کو سارے ملک کے مسلمانوں کا مفاد سامنے رکھ کر سوچیں گے تو انھیں یہی معلوم ہوگا کہ پوری مسلم جماعت کا مفاد

پوری ہندوستانی قوم کے مفاد سے الگ نہیں ہے۔ غرض مسلمانوں کا اضافی حیثیت سے وسیع انداز نظر مکمل اتحاد کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے اگر ان کے دلوں کو قومی مقصد کی حمایت کے لیے جیت لیا جائے۔

اسی طرح ہماری قومی بیرونی پالیسی یعنی سب ملکوں سے دوستانہ تعلقات رکھنا اور سب کی رائے عامہ کو امن عالم کے حق میں ہموار کرنا ہندوستانی مسلمانوں کے تعاون کے بغیر پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اس کو کامیاب بنانے کے لیے ہندوستان کو خاص طور پر ایشیائی اور افریقی ملکوں کی مدد پر بھروسہ کرنا ہے اور وہ انڈونیشیا سے لے کر مغربی ایشیا تک اور مصر سے لے کر مراکو تک زیادہ تر مسلمان ہیں۔ ان میں شک نہیں کہ اب ان سب ملکوں میں قومیت کا دور دورہ ہے مسلمانان عالم کے سیاسی اتحاد (یعنی پین اسلازم) کی تحریک بالکل مردہ ہو چکی ہے اور کچھ مغربی طاقتوں کی یہ کوشش کہ اسے نئے سرے سے زندہ کریں، کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس لیے ان میں سے کسی ریاست کے مسلمان اپنی قومی سیاست کی تشکیل میں کسی دوسری ریاست کے مسلمانوں کی رائے سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔ پھر بھی ان سب میں اسلامی اخوت کا جذبہ باقی ہے اور انھیں ہندوستانی مسلمانوں سے اتنی ہی دلچسپی اور اتنا ہی انس ہے جتنا دنیا کے کسی اور حصے کے مسلمانوں سے۔

یہاں سے عام دوستانہ تعلقات اور تہذیبی داد وستد رکھنے کے لیے جو سیاسی ہم آہنگی کی ناگزیر بنیاد ہے، ہندوستانی مسلمانوں کا توسط بہت ضروری ہے۔ مگر یہ بھی حاصل ہو سکتا ہے جب ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے اندرونی مسائل کی طرف سے معقول حد تک اطمینان حاصل ہو، وہ قومی معاملات میں پورے خلوص سے دلچسپی لیں اور دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے تہذیبی تعلقات کی تجدید کریں۔

جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ قومی یکجہتی کے سلسلے میں جو مسائل اس وقت ہمارے ملک کو درپیش ہیں ان میں فوری طور پر سب سے ضروری اور ملک کے مفاد کے لیے سب سے اہم یہ مسئلہ ہے کہ کس طرح ہندوستانی مسلمانوں کو قومی زندگی کے اصل دھارے سے الگ ہو جانے سے روکا جائے کیوں کہ اس سے ملک کی اندرونی ترقی اور خوشحالی اور بیرونی قوت اور وقار کو نقصان پہنچے گا۔

●●

پریم شنکر فرحت

غزل

نصیب عظمتِ آدم کو لامکاں بھی نہیں
اور آج اس اُسے پستیٔ جہاں بھی نہیں

مزاجِ عشق کو مرغوب امتحاں بھی نہیں
مگر یہ بات محبت پہ کچھ گراں بھی نہیں

یہ جانتا ہوں کہ عنوان کچھ نہاں بھی نہیں
کسی پہ نوعِ فسانہ مگر عیاں بھی نہیں

دکھا رہا ہوں نئی راہ اک زمانے کو
جو کامگار نہیں سعیٔ رائیگاں بھی نہیں

حریمِ قدس کے پردوں پہ ناز ہے ان کو
نگاہِ شوق سے مستور وہ جہاں بھی نہیں

وفورِ شوق میں تعمیر خود کیا جس کو
سرِ نیاز کی قسمت وہ آستاں بھی نہیں

حیاتِ عشق کی اس سادگی پہ اے فرحت
یقیں اگرچہ نہیں ہے تو کچھ گماں بھی نہیں

("سازِ حیات" مطبوعہ جنوری ۱۹۹۵ء صفحہ ۳۶)

"سازِ حیات" جناب پریم شنکر گوئل فرحت کے کلام کا مختصر مجموعہ ہے جس میں شاعر کی متفکرانہ روح کا اضطراب کارفرما نظر آتا ہے۔ جناب فرحت کی شاعری صرف مظاہرِ حسن اور کیفیاتِ عشق تک ہی محدود نہیں بلکہ زندگی کے لطیف پہلوؤں پر ایک ایسا دل فریب عکس ڈالتی ہے جس سے زندگی میں نئی تازگی کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔

آرٹ پیپر کے ۱۴۴ صفحات۔ سائز ۱۸x۲۲/۸۔ عمدہ جلد۔ طباعت فوٹو آفسٹ۔

قیمت: ۶/-

مغربی بنگال کا ایک اہم مراسلہ

مکرمی سلام علیک۔ مزاج شریف۔

رسالہ "کتاب نما" کا پرانا مداح و خریدار ہوں۔ اس قیمت میں ایسا ستھرا سا رسالہ قاری کے لیے ایک نعمت ہے۔ نئی مطبوعات کی بابت اہم اطلاعات ان پر مفید تبصرے، ادبی خبرنامے، مفید و مختصر اداریے، مصنفوں کی تصاویر اور متوازن تعارف اور دیگر مطبوعات سے اہم اقتباسات غرض یہ اور اس نوع کے دیگر مندرجات نے اس رسالہ کو کافی دلچسپ بنا دیا ہے اکثر اصحابِ ذوق "کتاب نما" میں شائع شدہ تبصروں سے واقف نظر آتے ہیں۔ یہ بات علامت ہے اس امر کی کہ رسالہ عام قارئین میں خاصا مقبول ہو رہا ہے۔ مجھے بھی اس باب میں اپنی مسرت کا اظہار کرنا ہے کہ میری ناچیز کتاب —— چند ادبی مسائل —— پر بھی اس رسالہ میں تبصرہ ہوا ہے۔ تبصرہ میں ذاتی رائے کو دخل ہوتا ہے جس حق کو تحسین صدیقی صاحب نے استعمال بھی کیا ہے۔

سردست میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ادارہ کے نزدیک اردو کی وسعت اور ترویج کی بابت کیا تصورات ہیں۔ اگر اردو کے اس دعوے کو صحیح سمجھا جاتا ہے کہ اس کا اثر و نفوذ اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور آندھرا پردیش کی سرحدوں تک جاری و ساری ہے تو پھر ادبی کارناموں اور خادمانِ ادب کے ذکر میں دیگر علاقوں سے دامن بچانے میں کیا مصلحت ہے؟ شوکت کہنہ کے [illegible] شعرا کا ذکر ہو رہا ہے وہ نہایت محدود ذہنیت کا غماز ہے۔ حیرت ہے کہ اس پورے سلسلے میں ایک بھی شاعر دکھائی نہیں دیتا جس کا تعلق ریاست ہائے بہار و بنگال سے ہو۔ انیسویں صدی میں جو تنگ دائرہ عام طریقہ کار بن گیا تھا [illegible] وہ اور معرفت رساں اصول پر موجود [illegible] کسی طرح بھی مناسب نہیں [illegible]

تاریخ ادب اردو، مختصر تاریخ ادب اردو جیسی کتابیں پڑھ کر لوگ اس گمراہی کے مرتکب ہو رہے ہیں کہ اردو کا کوئی حق بہار پر نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آب حیات جیسی ضخیم کتاب شعرائے عظیم آباد کے ذکر سے یکسر خالی ہوگی یا تاریخ ادب اردو سکسینہ و عسکری میں شاد جیسے شاعر تک نظر انداز ہو جائیں گے تو اردو والے کس منہ سے بہار میں اردو کا حق مانگیں گے۔ ہندی والے یہی کہتے ہیں کہ "بہار میں اردو کا کوئی مہتو (اہمیت) نہیں" اس رائے کے قائم کرنے میں آب حیات، تاریخ ادب اردو جیسی کتابوں کا کتنا ہاتھ ہے ان کتابوں کے مطالعے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اردو کے عام رواج کے مدعی ہونے میں ارباب ہندی سے زیادہ خود اہل اردو مانع ثابت ہوئے ہیں۔ جب دلی اور لکھنؤ کی ٹکسال ہی سے یہ اعلان ہو کہ اردو کا سکہ دلی اور لکھنؤ کے سوا کہیں رائج نہیں تو پھر اہل بہار کا یہ دعویٰ کہ اردو کا حق بہار پر بھی ہے از خود کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس لئے عرض یہ ہے کہ اگر آپ کا موقف یہ ہے کہ اردو اتر پردیش، بہار، مدھ پردیش، راجستھان اور اندھرا پردیش میں رائج زبان ہے اور ان مقامات میں اردو کے قدیم مراکز رہے ہیں تو پھر اپنے رویّہ میں تبدیلی فرمائیں اور ہر علاقہ کی نمائندگی کریں کیونکہ اسی میں اردو کا بھلا ہے۔ یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اب "خاصان ادب" کا دور ختم ہو گیا اور موجودہ دور جمہوری اور عوامی ہے۔ اس دور میں نظر میں ایسی ہی وسعت ہونی چاہیے جس کے پھیلاؤ میں سارے جمہوری تقاضے پورے طور پر سموئے جا سکیں امید ہے کہ میری عرض آپ پر واضح ہو گئی ہوگی۔ اور آپ اس کا بُرا نہ مانیں گے۔ والسلام۔

خیر طلب

شاہ مقبول احمد کلکتہ

(ہمیں شاہ صاحب کی رائے سے اتفاق ہے ہم آئندہ اس طرف ضرور توجہ دیں گے۔ امید کرتے ہیں کہ اہل قلم حضرات بھی ان سے اتفاق فرمائیں گے۔) (ادارہ)

مصنف :۔ ٹالسٹائی
ترجمہ :۔ صابرہ زیدی

رقص کے بعد

"تو آپ لوگوں کا کہنا ہے کہ آدمی اپنے طور پر اچھے برُے میں تمیز نہیں کر سکتا، آپ کہتے ہیں کہ سب کچھ ماحول کا کرشمہ ہے اور ماحول ہی انسان کی تخلیق کرتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں سب کچھ اتفاق کا کھیل ہے ـــــ کم سے کم اپنے بارے میں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں..."

ہم لوگ اس موضوع پر بات چیت کر رہے تھے کہ فرد کی شخصیت کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے پہلے اس ماحول کو، ان حالات کو بدلنا ضروری ہے جن میں انسان اپنی زندگی گزارتے ہیں ـــ سو اس بات چیت کے خاتمے پر ایوان واسی لیئوچ نے جن کی سب لوگ بہت عزت کرتے ہیں، یہ بات کہی ـــ سچ تو یہ ہے کہ ہم میں سے کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ بطور خود اچھے برُے میں امتیاز کرنا ناممکن ہے ـــ لیکن ایوان واسی لیئوچ کی عادت ہے کہ وہ خود اپنے خیالات کا جواب دینے لگتے ہیں جو کسی گفتگو یا بحث مباحثے کے دوران ان کے ذہن میں ابھرتے ہیں اور پھر یہ خیالات ان کی زندگی کے جن تجربوں کی یاد تازہ کرتے ہیں وہ انہیں بیان کرنے لگتے ہیں ـــ اکثر اوقات وہ اپنی داستان میں اس بری طرح محو ہو جاتے ہیں کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ انھوں نے وہ داستان کیوں سنانی شروع کی تھی ـــ وہ بڑے جوش و خروش، لگن اور خلوص سے ہر قصّہ سناتے ہیں، اس لیے وہ اور بھی کھو جاتے ہیں ـــ

اس دفعہ بھی بالکل یہی ہوا ـــ

"کم از کم اپنے متعلق تو میں یہی کہہ سکتا ہوں ـــ میری زندگی کی تشکیل تو اسی طرح ہوئی اور کسی طرح نہیں، اس میں جو کچھ تبدیلی پیدا ہوئی وہ ماحول کی دین نہیں ہے بلکہ کسی اور ہی چیز کی دین ہے ـــ"

"کس چیز کی؟" ہم نے پوچھا ـــ

"یہ ایک لمبا قصہ ہے ۔ اور جب تک میں الف سے یے تک سب کچھ نہیں سناؤں آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا ۔"

"تو سُنائیے نا!"

ایوان واسی لیئوچ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئے، پھر سر ہلا کر بولے:

"ہاں ۔ بس ایک رات نے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک صبح نے میری زندگی کی کایا پلٹ کر دی ۔"

"بتائیے تو سہی کیا ہوا؟"

"ہوا یہ کہ میں بری طرح عشق میں مبتلا ہو گیا ۔ میں اس سے پہلے بھی چند بار گرفتارِ عشق رہ چکا تھا لیکن یہ کچھ اور ہی چیز تھی، یہ سب سے زیادہ گہری محبت تھی ۔ اب اس واقعے کو مدتیں گزر گئیں ۔ اب تو میری محبوبہ کی بیٹیاں بھی گھربار والی ہو چکیں ۔ اس کا نام تھا وارنکا ۔ وہ پچاس سال کی عمر میں بھی غیر معمولی حسین تھی ۔ لیکن چڑھتی جوانی میں سترہ اٹھارہ برس کے سن میں تو قیامت تھی قیامت: سرو قد، سیم تن اور نازک بدن، چھبیلی اور پُرشکوہ ۔ ہاں ہاں پُرشکوہ ۔ اور چال جیسے کڑی کمان کا تیر!" معلوم ہوتا تھا جھکنا تو اس کے جسم نے سیکھا ہی نہ تھا ۔ اس کا سر ہمیشہ خفیف سا پیچھے جھکا رہتا تھا ۔ حالانکہ وہ ہڈیالے پن کی حد تک دبلی تھی مگر اس کی اس ادا، اس کے حسن و رعنائی اور اس کی سرو قامتی نے مل کر اس میں کچھ ایسا شاہانہ وقار پیدا کر دیا تھا کہ اگر وہ اتنی شوخ و شنگ نہ ہوتی، اگر اس کی مسکراہٹ اس قدر من موہنی اور اس کی آنکھیں اتنی قیامت خیز نہ ہوتیں اور اس قدر تجلیاں نہ بکھیرتیں، اگر اس کا پورا وجود اتنا پیارا، اتنا نوخیز اور اتنا دل فریب نہ ہوتا تو اس کے رعبِ حسن سے آدمی نظریں تھوڑا ہی اٹھا سکتا!"

"ایوان واسی لیئوچ تو شاعری کر رہے ہیں، شاعری!"

"میں چاہے جتنی شاعری کروں، چاہے جتنا زورِ بیان صرف کر دوں، مگر آپ لوگوں کے سامنے اس کی جیتی جاگتی تصویر نہیں پیش کر سکتا ۔ لیکن خیر اس بات کا اصل قصے سے کوئی تعلق نہیں ۔ میں جو واقعہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں، وہ اس صدی کے وسط میں پیش آیا تھا ۔

اس وقت میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا ۔ میں نہیں جانتا یہ بات اچھی تھی یا بُری، بہرحال اس زمانے میں ہماری یونیورسٹی میں یہ طرح طرح کے اشٹائلش کی اور دنیا بھر کی فلسفہ بازیاں، یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا ۔ ہم جوان تھے اور وہی زندگی بسر کرتے تھے جو جوانی کا تقاضا ہے ۔ ہم پڑھتے لکھتے تھے، کھیل اور تفریح میں حصّہ لیتے تھے ۔ میں بڑا خوش باش، تفریح پسند اور زندہ دل نوجوان تھا اور اس پر طرہ یہ کہ مالدار بھی تھا ۔ میرے پاس گھوڑا تھا بڑا برق رفتار اور جان دار ۔ سو میں اکثر لڑکیوں کو گاڑی میں گھمانے پھرانے لے جایا کرتا تھا ۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہر قسم کی محفلوں میں شریک ہوتا تھا، لیکن سب سے زیادہ لطف تو مجھے دعوتوں، پارٹیوں اور رقص کی محفلوں میں آتا تھا ۔ مجھے ناچنا خوب آتا تھا اور میں شکل صورت میں بھی بُرا نہیں تھا ۔ "

" ارے خواہ مخواہ خاکساری نہ کیجیے " سننے والی عورتوں میں سے کسی ایک نے لقمہ دیا ۔ " ہم سب نے آپ کا اس زمانے کا فوٹو دیکھ رکھا ہے ۔ آپ تو بہت خوب رو اور رعنا جوان تھے کبھی ۔ "

" خیر ہوں گا مگر اس کا اصل قصّے سے کوئی تعلق نہیں ۔ ہاں تو جس زمانے میں میرا عشق اپنے پورے شباب پر تھا میں ایک دفعہ ایسٹر کے دنوں میں رقص کی ایک محفل میں شریک ہوا ۔ یہ محفل رقص گورنر کی طرف سے ہوئی تھی، وہ بہت نیک اور خوش مزاج بڑے میاں تھے اور مہمان داری کے بے حد شائق ۔ ان کی بیوی جو انہیں کی طرح خوش مزاج اور مشفق تھیں، اپنے شوہر کے پہلو بہ پہلو مہمانوں کے استقبال کے لیے کھڑی تھیں ۔ وہ مخملی گاؤن زیب تن کیے ہوئے تھیں اور ان کے سر پر ایک مرصع کلغی تھی جس میں ہیرا جگمگا رہا تھا، ان کی سفید براق اور گداز گردن اور شانے، جس پر بڑھاپے نے اپنی پرچھائیں ڈال دی تھی، اس طرح عریاں تھے جیسے ملکہ الیزا ویتا پیترو وناکی تصویروں میں ہوتے ہیں ۔ محفل رقص بہت ہی شاندار رہی ۔ رقص کا کمرہ بڑا سجا سجایا اور نظر فریب تھا ۔ محفل میں بڑے مشہور و معروف مغنّی اور موسیقار موجود تھے جو ایک سنگیت پریمی زمین دار کے خانہ زاد تھے ۔ کھانے پینے کی چیزیں بہ افراط تھیں اور شامپین کے تو دریا بہہ رہے

تھے۔ میں شامپین کا خاصا رسیا تھا مگر میں نے اسے چھوا بھی نہیں کیونکہ مجھ پر تو محبت کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ مگر جہاں تک ناچنے کا سوال ہے میں اتنا ناچا کہ تھک کر چور ہو گیا۔ کون سا ایسا رقص تھا جسے میں نے چھوڑ دیا ہو، والز میں نے کیا، اکوادریل ناچ میں ناچا اور پولکا رقص میں نے کیا۔ ظاہر ہے کہ میں نے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ رقص وارنکا کے ساتھ کیے۔ وہ سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس تھی، صرف اس کی کمر پر گلابی پیٹی بندھی تھی، اس کے سفید چمڑے کے دستانے اس کی نکیلی اور دبلی کہنیوں سے نیچے تک تھے، اور وہ پاؤں میں سفید ساٹن کی جوتیاں پہنے ہوئے تھی۔ ایک نامعقول انجینیر انیسموف اس کے ساتھ مازورکا رقص کرنے بیچ میں کود پڑا۔ اس کی اس حرکت کو میں نے آج تک معاف نہیں کیا۔ جوں ہی وارنکا نے رقص گاہ میں قدم رکھا اس انجینیر نے اسے رقص کی دعوت دے ڈالی۔ میں اس وقت اپنے دستانے لینے گیا ہوا تھا اسی لیے مجھے کچھ دیر لگ گئی۔ سو اس کے ساتھ مازورکا ناچنے کے بجائے میں ایک جرمن لڑکی کے ساتھ ناچا جس سے ایک زمانے میں مجھے خاصی دلچسپی رہ چکی تھی۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس شام میں اس کے ساتھ خاصی ناشائستگی سے پیش آیا، میں نے اس سے دو بول بھی نہیں کہے اور نہ ہی اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ میری نگاہوں کا مرکز تو ایک سفید کپڑوں اور گلابی پیٹی والی وہ سرو قامت، لچکیلی نازنین تھی جس کے گالوں میں گڑھے پڑتے تھے، چہرہ تابناک اور گلنار رہتا۔ اور آنکھوں سے ملائمت اور محبت ٹپکی پڑتی تھی۔ اور میں ہی کیا وہ تو ہر شخص کی نگاہوں کا مرکز تھی، ہر ایک ہی اس پر مرمٹا تھا، یہاں تک کہ عورتیں بھی اسے تعریفی نظروں سے دیکھ رہی تھیں حالانکہ اس کے حسن کے سامنے وہ سب ماند پڑ گئی تھیں۔ اصل میں اس کی بارگاہِ حسن میں خراجِ عقیدت پیش نہ کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

نام کو تو میں مازورکا میں اس کا ساتھی نہیں تھا لیکن دراصل تقریباً تمام وقت میں اسی کے ساتھ ناچتا رہا۔ بلا کسی قسم کی جھجک یا شرم کے وہ کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ناچتی ہوئی میرے پاس آئی اور جب میں اس کی دعوت کا انتظار کیے بغیر ہی اس کی طرف لپکا تو اس نے اپنی ان کہی خواہش کو سمجھ لینے پر ایک تبسم ناز سے میرا شکریہ ادا کیا۔ جب ہم لوگ اس کے پاس لائے گئے تھے اور اسے میری

طبیعت کا اندازہ نہیں ہوا تھا تو اس نے اپنے دبلے پتلے کندھے جھٹک کر کسی دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا اور اظہار افسوس اور ہمدردی کے طور پر میری طرف دیکھ کے مسکرادی تھی۔ ساز وروں کا رقص والز میں تبدیل ہوا تو میں گھنٹوں اس کے ساتھ والز کرتا رہا۔ اس کا سانس پھول گیا لیکن وہ مسکرا مسکرا کے مجھ سے کہتی رہی "مکرر" اور میں اس کے ساتھ ناچتا ہی چلا گیا۔ اس وقت مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا گویا میرا جسم ہوا کا بنا ہوا ہو ۔۔۔"

"کیا کہا، تن بدن کا ہوش نہ تھا؟ مجھے یقین ہے کہ جس وقت آپ کا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل تھا اس وقت آپ کو نہ صرف اپنے بلکہ اس کے بدن کا بھی خوب اچھی طرح احساس ہوگا۔" ایک مہمان بول اٹھا۔

ایوان واسی لیوچ کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا اور وہ غصے میں تقریباً چیخ کر کہنے لگے:

"یہ بات تو تم نئی پود کے نوجوانوں پر صادق آتی ہے۔ تم لوگوں کو جسم کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارے زمانے میں یہ بات نہیں تھی ۔۔ مجھے جس لڑکی سے جتنی زیادہ گہری محبت ہوتی تھی میرے نزدیک وہ اتنی ہی زیادہ آسمانی مخلوق بن جاتی تھی۔ تم لوگوں کو بس ٹانگوں اور پنڈلیوں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا احساس ہے، تم تو تخیل میں اپنی محبوباؤں کے جسم سے کپڑے اتار ڈالتے ہو۔ لیکن میرے نزدیک تو عظیم ادیب الفونس کار کے الفاظ میں محبوب کا پیکر گویا آہنی جامے میں ملبوس رہتا تھا۔ ہم لوگ تو حضرت نوح کے نیک بیٹے کی طرح عریانی کو نمایاں کرنے کے بجائے اس کی پردہ پوشی کی کوشش کرتے تھے لیکن تم بھلا یہ بات کیسے سمجھ سکتے ہو!"

"اس کی پروا نہ کیجیے، آپ تو اپنا قصہ بیان کئے جایئے"، ایک اور سننے والے نے کہا۔

"ہاں تو میں زیادہ تر اسی کے ساتھ ناچتا رہا اور مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ سازندے تھک کر چور ہو چکے تھے۔ آپ جانتے ہی ہیں ہر محفل رقص کے آخر میں کیا حال ہوتا ہے ۔۔۔ وہ مسلسل مازورکا کی دھن بجاتے رہے ۔۔ اماں اور ابا تاش کی میزیں چھوڑ چھوڑ کر کھانے پینے کی امید میں ملاقاتی کمرے سے نکلنے لگے، وردی پوش ملازم کھانے کر ادھر سے ادھر دوڑنے بھاگنے لگے ۔۔ تین بجا چاہتے تھے۔ ہمیں ان چند آخری

لوں کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا تھا ۔ میں نے ایک بار پھر سے کلچے کی دعوت دی اور ہم سویں بار پھر کرنے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ناچتے چلے گئے ۔

"کھانے کے بعد کیا دوبارہ ناچ تو میرے ہی ساتھ ہوگا نا؟" میں نے اپنی محبوبہ کو واپس اس کی جگہ پر پہنچاتے ہوئے پوچھا ۔

"ہاں ضرور ، بشرطیکہ میرے والدین مجھے گھر نہ لے گئے اس وقت تک" اس نے مسکرا کر جواب دیا ۔

"میں انہیں لے جانے ہی کب دوں گا!" میں بولا ۔

"میری پنکھیا تو دینا ذرا" اس نے حکم دیا ۔

"اسے واپس کرتے ہوئے مجھے افسوس ہو رہا ہے" میں نے اس کی معمولی سفید پنکھیا اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا ۔

"اچھا تو تم بھی کیا یاد کرو گے! تمہیں افسوس نہ ہو اس لیے دے رہی ہوں" اس نے پنکھیا سے ایک پر نوچ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔

"میں نے پر لے لیا اور صرف نگاہوں ہی نگاہوں میں اپنے بے پایاں وجد مسرت اور تشکر کا اظہار کیا ۔ میں صرف مسرور اور مگن ہی نہیں تھا مجھ پر تو کمال بے خودی ، گہری مسرت ، سچی سرخوشی اور انبساط کی کیفیت طاری تھی ، میں اس وقت بڑا وسیع القلب ہو رہا تھا ، میں میں نہیں تھا بلکہ کوئی ایسی مخلوق تھا جو اس دھرتی کی نہیں تھی ، جو برائی سے کوسوں دور تھی ، جو صرف نیکی ہی نیکی کرنا جانتی تھی ۔

میں نے پر اپنے دستانے میں ٹھونس لیا اور اسی جگہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا گویا زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہوں ۔ مجھ میں اس سے دور جانے کی طاقت نہیں تھی ۔

"دیکھو لوگ پاپا سے رقص کے لیے اصرار کر رہے ہیں" اس نے ایک دراز قد اور شاندار شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ یہ اس کے باپ تھے وہ فوج میں کرنل تھے اور ان کی وردی میں نقرئی بجے لگے ہوئے تھے ۔ وہ دروازے میں کھڑے ہوئے خاتون خانہ اور چند دوسری عورتوں سے بات چیت کر رہے تھے ۔

"دارنکا، یہاں آنا ذرا،" ہیرے کی کلغی والی خاتون خانہ نے اسے آواز دی۔ دارنکا دروازے کی طرف بڑھی اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

"ذرا اپنے پاپا کو اپنے ساتھ رقص کرنے پر راضی تو کرو۔" اور پھر کرنل کی طرف مڑ کر خاتون خانہ نے کہا "پیوتر ولادی سلاوچ کر لیجیے نا ایک رقص۔"

دارنکا کے باپ بڑے وجیہ، بلند قامت، خوبصورت اور شاندار بوڑھے تھے اور ان میں ابھی جوانی کا دم خم باقی تھا۔ ان کے چہرے پر سرخی رہتی تھی اور سفید مونچھیں نکولائی اول کے انداز میں مڑی رہتی تھیں، ان کے گل مچھے کنپٹیوں کی طرف مڑے ہوئے تھے اور ان کی چمک دار آنکھوں میں اور ہونٹوں پر وہی جاندار مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی جو ان کی بیٹی کی خاص چیز تھی۔ ان کی کاٹھی بڑی اچھی تھی، سینہ خوب فراخ تھا اور فوجی انداز میں تنا رہتا تھا، اس پر چند فوجی تمغے جگمگاتے رہتے تھے، ان کے شانے مضبوط تھے اور ٹانگیں لمبی اور خوبصورت۔ وہ نکولائی اول کے سے فوجی انداز کے پرانی وضع کے افسر تھے۔

جب ہم دروازے کے قریب پہنچے تو سنا کہ کرنل یہ کہہ کر ناچنے سے انکار سا کر رہے ہیں کہ وہ تو سب کچھ بھول بھال گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسکرائے، اپنی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے نیام سے نکالا اور قریب کھڑے ہوئے ایک نوجوان کو پکڑا دیا جو اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ پھر انہوں نے سوئیڈ کا ایک دستانہ اپنے دائیں ہاتھ پر چڑھایا۔ "ہر چیز قاعدے کے مطابق ہونی چاہیے،" انہوں نے مسکرا کر کہا اور اپنی بیٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ناچنے والے کا انداز اختیار کیا اور تال کا انتظار کرنے لگے۔

"مازورکا ناچ کی تال پڑتے ہی انھوں نے اپنا ایک پاؤں بہت جان دار اور پھرتیلے انداز سے زمین پر مارا اور دوسرے پاؤں پر تیزی سے گھوم گئے اور پھر ان کا لمبا چوڑا جسم پوری رقص گاہ میں تھرکنے لگا۔ وہ بار بار اپنا ایک پاؤں دوسرے سے ٹکراتے، کبھی دھیرے دھیرے اور بڑی خوش ادائی اور لطافت کے ساتھ ناچتے تو کبھی بہت پھرتی، توانائی اور تڑاپ کے ساتھ۔ دارنکا کا کومل اور رعنا پیکر اپنے باپ کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ وہ غیر محسوس طریقے سے لیکن بالکل وقت پر اپنے سفید ساٹن میں چھپے ہوئے چھوٹے چھوٹے پیروں کو اپنے باپ کے قدموں کی حرکت سے ہم آہنگ کر رہی تھی۔

سارے مہمان ٹکٹکی باندھے اس جوڑے کی ہر ہر ادا اور ہر جنبش کو دیکھ رہے تھے۔ اور میں ان دونوں کو محض تعریف کی نگاہوں سے نہیں دیکھ رہا تھا، مجھ پر تو اس وقت ایک نشاط و بے خودی کی کیفیت طاری تھی۔ خاص طور پر کرنل کے بوٹوں کو دیکھ دیکھ کر مجھ پر بہت اثر ہو رہا تھا۔ وہ عمدہ چمڑے کے بوٹ تھے لیکن بالکل بے ایڑی کے اور ان کے پنجے اس وقت کے فیشن کے مطابق نکیلے ہونے کے بجائے چوڑے چوڑے تھے۔ غالباً وہ نپالین کے مرچی کے بنائے ہوئے تھے۔ "ہمارے بڑے بڑے میاں فیشن ایبل بوٹوں کے بجائے یہ چپٹے پنجوں کے جوتے پہنتے ہیں تاکہ اپنی لاڈلی بیٹی کو اچھے اچھے کپڑے زیور سے سجا کر سوسائٹی میں لاسکیں" میں نے دل ہی دل میں سوچا اور اسی لیے مجھے ان کے چپٹے پنجے والے بوٹوں نے اتنا متاثر بھی کیا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ کبھی بہت اچھی طرح ناچتے ہوں گے لیکن اب ان کا جسم خاصا بھاری پڑ گیا تھا اور ٹانگوں میں اتنی لچک نہیں رہی تھی کہ وہ ان تمام خوبصورت اور پھر تیلی جنبشوں اور چکروں سے عہدہ برآ ہوسکیں جن کی وہ کوشش کر رہے تھے۔ پھر بھی دو دفعہ تو انھوں نے بڑی عمدگی سے کمرے کے چکر لگائے۔ اور جس وقت انہوں نے پہلے تو پھرتی سے دونوں ٹانگیں پھیلائیں، پھر انہیں ایک دوسرے سے ٹکرایا اور ذرا بوجھل سے انداز میں ایک گھٹنے کے بل بیٹھ گئے، اور لوگوں نے خوب خوب تحسین و آفرین کی۔ وہ کوشش کر کے کھڑے ہوئے اور بیٹی کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں نرمی سے لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر وہ اسے میرے پاس لے آئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس کا رقص کا ساتھی میں ہی ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ بات نہیں ہے تو انہوں نے اپنی تلوار نیام میں رکھتے ہوئے تپاک سے مسکرا کر کہا:

"خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب آپ اس کے ساتھ رقص کریں۔"

"جس طرح ساغر و مینا سے ٹپکا ہوا پہلا قطرہ اپنے پیچھے ایک پوری دھار لے کر آتا ہے، اسی طرح وارنکا سے مجھے جو محبت تھی اس نے میرے دل میں محبت کی ساری خفتہ صلاحیتوں کو جگا دیا، میری آتما میں پریم کے سارے سوتے ابل پڑے۔ میری محبت نے ساری دنیا کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ میں ہیرے سے مرصع کلغی والی خاتون خانہ کے لیے، ان کے شوہر کے لیے، ان کے مہمانوں کے لیے، ان کے وردی

پوسٹ ملازم کے لیے، یہاں تک کہ اس کمبخت انیسیوف کے لیے بھی جو مجھ سے یقیناً خفا تھا محبت محسوس کر رہا تھا۔ اور رہے میری محبوبہ کے باپ جن کی مسکراہٹ خود اس کی مسکراہٹ سے اس قدر مشابہ تھی اور جو چوڑے پنجے کے جوتے پہنے تھے، سوان کے لیے تو اس وقت میرے دل میں ایک عجیب وجد آفریں محبت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔
مازورکا ختم ہوا تو ہمارے میزبانوں نے سب کو کھانے کی دعوت دی۔ لیکن کرنل نے کھانے سے انکار کر دیا، انہوں نے کہا کہ انہیں صبح سویرے اٹھنا ہے اور میزبان سے اجازت چاہی۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں وارنکا کو بھی وہ اپنے ساتھ نہ لے جائیں لیکن وہ اور اس کی ماں رہ گئیں۔

کھانے کے بعد میں نے اس کے ساتھ وہ کوادریل رقص کیا جس کا اس سے وعدہ لے چکا تھا اور حالانکہ مجھے خیال تھا کہ میری مسرت نے اب اپنی آخری حدوں کو چھو لیا ہے لیکن وہ تھی کہ ہر لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ہم دونوں نے پریم کے چرچے نہیں کیے، میں نے نہ اس سے پوچھا، نہ خود اپنے دل سے سوال کیا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔ میرے لیے یہ کافی تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے اگر کوئی اندیشہ تھا تو یہ کہ کہیں کوئی چیز میری مسرت کو خاک میں نہ ملا دے۔

"جب میں گھر پہنچا اور کپڑے وغیرہ اتار کے سونے کا ارادہ کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ نیند کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے ہاتھ میں اس کا ایک دستانہ جو اس وقت اس نے مجھے دیا تھا جب میں اسے اور اس کی ماں کو گاڑی میں سوار کرا رہا تھا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے اس کی وہ تصویر آ گئی جب اس نے ہم دو میں سے ناچ کے ساتھی کا انتخاب کرنے کے کھیل میں میرا فرضی نام بھانپ لیا تھا اور بڑی پیاری اور رسیلی آواز میں پوچھا تھا "خود دار؟ ٹھیک ہے نا؟" اور خوش ہو کر میری طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا، پھر میری چشم تصور نے اسے کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے دیکھا جب وہ نزاکت سے شامپین کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی اور مجھ پر محبت بھری نگاہیں ڈال رہی تھی۔ لیکن میرے تخیل میں اس کی سب سے زیادہ صاف اور روشن تصویر تو اس وقت کی ابھرتی تھی جب وہ اپنے باپ کے ساتھ اس قدر لطافت اور نازک ادائی کے ساتھ رقص کر رہی تھی اور فخر و مسرت کے جذبات سے پُر

سارے سراہنے والے اور تعریفی نگاہیں ڈالنے والے تماشائیوں کو دیکھ رہی تھی ۔۔ وہ خود اپنی وجہ سے بھی خوش اور نازاں تھی اور اپنے باپ کی وجہ سے بھی ۔۔ اور اس وقت غیر ارادی طور پر میں نے اس کے اور اس کے باپ دونوں کے لیے ایک ہی سا گہرا اور نرم و لطیف جذبہ محسوس کیا تھا ۔

اس زمانے میں میرے مرحوم بھائی اور میں ایک ساتھ ہی رہتے تھے ۔ میرے بھائی کو سوسائٹی سے قطعی کوئی دل چسپی نہیں تھی اور وہ کبھی رقص کی محفلوں میں نہیں جاتے تھے ۔ وہ ایم، اے کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے اور بڑی مثالی زندگی گزارتے تھے ۔ اس وقت وہ سوئے پڑے تھے ۔ ان کا سر تکیے میں دھنسا ہوا تھا اور آدھا سر کمبل سے ڈھکا تھا ۔ میں نے جب اس حالت میں انہیں دیکھا تو مجھے ان پر بڑا ترس آیا ۔ مجھے اس لیے ترس آیا کہ وہ اس خوشی سے محروم ہیں جو مجھے میسر ہے ۔ ہمارا خانہ زاد ملازم پیترو شا شمع لیے ہوئے آیا اور کپڑے وغیرہ اتارنے میں میری مدد کرنا چاہی ۔ مگر میں نے اسے چلتا کر دیا ۔ مجھے اس کا نیند سے ماتا چہرہ اور بکھرے بال دیکھ کر بڑا ترس آیا ۔ اس خیال سے کہ کہیں کوئی آواز نہ ہو میں پنجوں کے بل چلتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا ، میرا پورا وجود سرشار و مست تھا ، ایسے میں بھلا نیند کہاں ! اوپر سے کمرے میں گرمی بھی بہت ہو رہی تھی سو میں اپنی وردی اتارے بغیر ہی خاموشی سے دالان میں آگیا اور اوورکوٹ پہن ، باہر کا دروازہ کھول ، سڑک پر نکل آیا ۔

میں کوئی پانچ بجے تو رقص ہی سے لوٹا تھا اور اب اسے بھی دو گھنٹے ہو چکے تھے ، سو جس وقت میں باہر نکلا تو پو پھٹ رہی تھی ۔ یہ ایسٹر کا خاص موسم تھا ۔ ہر طرف دھندلکا چھایا ہوا تھا ، سڑکوں پر گیلا گیلا برف پگھل رہا تھا اور چھتوں سے پانی ٹپ ٹپ گر رہا تھا ۔ ان دنوں کرنل مضافات شہر میں رہتے تھے ۔ ان کا مکان ایک کھلے میدان کے اس پار تھا جس کے ایک طرف لڑکیوں کا اسکول تھا اور دوسری طرف جہل قدمی کے واسطے جگہ تھی ۔ میں اپنی چھوٹی سی سنسان گلی سے گذر کر بڑی سڑک پر آیا ۔ وہاں اب راہ گیر بھی نظر آ رہے تھے اور وہ گاڑی بان بھی جو برف گاڑیوں میں ایندھن لاد کر لیے جا رہے تھے ۔ گاڑیوں کے دُھرے برف کو چیر کر سڑک کے پتھروں تک پہنچ رہے

تھا جیسے ہر چیز ــــ روغن کیے ہوئے جوتوں کے نیچے برف آہنگ سے پسینے سے تر سرہلاتے ہوئے گھوڑے، کاندھوں پر بوریاں ڈالے اور لمبے لمبے جوتے پہنے گاڑی بان جلدی گاڑیوں کے ساتھ ساتھ پھسلتے ہوئے برف پر چل رہے تھے، سڑک کے دونوں طرف ایستادہ مکان جو دھند میں بہت لمبے لمبے معلوم ہو رہے تھے ــــ غرض ہر چیز مجھے اس وقت خاص طور پر پیاری، دلکش اور پرمعنی معلوم ہو رہی تھی ـ

جب میں اس میدان کے قریب پہنچا جہاں ان لوگوں کا مکان تھا تو میں نے دیکھا کہ چہل قدمی کے لیے جو جگہ بنی ہے وہاں کوئی کالی کالی اور بڑی سی چیز متحرک ہے اور ساتھ ہی مجھے طبل کی گمک اور بانسری کی فریاد بھی سنائی دی ـ میرا من تو پورے وقت گا ہی رہا تھا اور لگا ہے لگا ہے مازورکا کی موسیقی بھی میرے کانوں میں گونج جاتی تھی ـ مگر یہ تو کسی اور ہی قسم کا سنگیت تھا ــــ بڑا ہی ناخوشگوار اور سمع خراش ـ

"یہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟" میں نے دل ہی دل میں سوچا ـ پھر میں اس پھسلواں سڑک پر ہو لیا جو گاڑیوں کے گذرنے کے لیے میدان کے آرپار بنائی گئی تھی اور انہیں آوازوں کی سمت چلنے لگا ـ کوئی سو قدم چلنے کے بعد مجھے دھند کے پیچھے لوگوں کا ایک مجمع سا نظر آنے لگا ـ غالباً سپاہی ہوں گے ـ "شاید قواعد کر رہے ہیں" میں نے سوچا اور آگے بڑھتا گیا ـ میرے سامنے ایک لوہار بھی چل رہا تھا جس کی جیکٹ اور پیش بند پر چکنائی کے داغ دھبے پڑے ہوئے تھے اور ہاتھ میں ایک بڑا سا بنڈل تھا ـ ہم دونوں سپاہیوں کے قریب پہنچ گئے ــــ سیاہ کوٹوں میں ملبوس سپاہی دو قطاروں میں آمنے سامنے بے حس و حرکت کھڑے تھے ــــ وہ اپنی بندوقیں زمین پر ٹکائے ہوئے تھے ـ ان کے پیچھے ایک بانسری نواز اور نقارچی کھڑے تھے اور وہ مسلسل یہی جھنجھناتی ہوئی اور تیز دھن بجائے جا رہے تھے ـ

"یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" میں نے اپنے پہلو میں کھڑے ہوئے لوہار سے سوال کیا ـ

"کسی تاتاری کو بھاگنے کی سزا دے رہے ہیں" لوہار نے اس دوہری قطار کے سب سے دور والے حصے کی طرف دیکھتے ہوئے خفگی سے جواب دیا ـ

"میں بھی ادھر ہی دیکھنے لگا اور مجھے دونوں صفوں کے درمیان کوئی خوفناک چیز

اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی — یہ ایک آدمی تھا جو کمر تک ننگا تھا — وہ بندوقوں سے بندھا ہوا تھا جن کو دو سپاہی کھینچ رہے تھے — اس کے برابر ایک دراز قد افسر فوجی کوٹ اور ٹوپی پہنے چل رہا تھا — اس کا قد و قامت اور چال ڈھال مجھے کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوئی — قیدی کا پورا جسم تشنجی انداز سے پھڑک رہا تھا، اس کے پاؤں پگھلتے ہوئے برف پر بڑی بری طرح گھسٹ رہے تھے اور وہ دو طرفہ ضربوں کے درمیان آگے بڑھ رہا تھا — وہ کبھی تو دبک کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتا، جس پر وہ دونوں سپاہی جو بندوقوں کے دونوں سرے پکڑے ہوئے تھے اس کو جھٹکے سے آگے کھینچ لیتے تھے اور کبھی تیزی سے آگے جھپٹتا تو وہی سپاہی جھٹکے سے اس کو پیچھے کھینچ لیتے تھے کہ کہیں یکبارگی وہ گر نہ پڑے — قیدی کے ساتھ ساتھ وہی دراز قد افسر مضبوط قدموں سے چلتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا — وہ کبھی ایک منٹ کے لیے بھی پیچھے نہیں رہا — یہ لال گالوں اور سفید مونچھوں اور گل مچھوں والا شخص وارنکا کا باپ تھا —

اور میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے مضبوط ہاتھ سے جس پر سوئیڈ کا دستانہ چڑھا ہوا تھا اس کمزور اور منحنی سے سپاہی کے منہ پر زور کے کئی تھپڑ رسید کیے کیونکہ ایک سپاہی کا ڈنڈا تاتاری کی سرخ کمر پر کافی سختی سے نہیں پڑا تھا —

"نیا ڈنڈا لاؤ!" کرنل نے حکم دیا — یہ کہہ کر وہ مڑا اور اسی لمحے اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی — لیکن اس نے یہ ظاہر کیا گویا اس نے مجھے پہچانا ہی نہ ہو اور بے انتہا سختی، بدمزاجی اور خفگی سے تیوری پر بل ڈال کر دوسری طرف مڑ گیا — میں اس قدر شرمندہ ہوا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کدھر دیکھوں گویا میں کوئی بہت ہی شرمناک حرکت کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں — میں سر جھکائے تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا — پورے راستے میرے کانوں میں طبل کی گمک اور بانسری کی گریہ و زاری، تاتاری کے الفاظ "دیا کرو، بھائیو، دیا" اور کرنل کی خود اعتمادی سے لبریز غضبناک آواز "لے، اور لے!" —— یہ سب کچھ گونجتا رہا — میرا دل اس بری طرح دکھ رہا تھا جیسے سچ مچ اس میں درد ہو رہا ہو، اس روحانی کرب کی شدت سے مجھے متلی ہونے لگی تھی اور اسی وجہ سے راستے میں کئی بار رکنا پڑا — مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس ہولناک نظارے نے میرے رگ و پے میں جو مسموم سی

پر مجبور ہے اس نے مجھے اب الٹی ہوئی آ رہی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کس طرح گھر پہنچا اور کیسے پلنگ پر لیٹا۔ لیکن جوں ہی میری آنکھ ذرا سی لگی پھر وہی سب کچھ سنائی اور دکھائی دینے لگا اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"یقیناً اسے کوئی ایسی بات معلوم ہے جو مجھے نہیں معلوم" میں نے دل ہی دل میں کرنل کے بارے میں سوچا۔ "اگر وہی بات جس سے وہ واقف ہے مجھے بھی معلوم ہو جائے تو میری سمجھ میں سب کچھ آ جائے گا اور میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس سے مجھے اس قدر روحانی اذیت اور کرب نہیں ہوگا۔" میں نے اپنے دماغ پر خوب زور دیا لیکن ہزار کوشش پر بھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو کرنل کو معلوم ہے۔ مجھے کسی صورت نیند نہیں آئی، میں صرف شام ہوتے سو سکا اور وہ بھی اس وجہ سے کہ ایک دوست کے پاس جا کر خوب پی پلا کر نشے میں چور گھر لوٹا تھا۔

"آپ سمجھتے ہوں گے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جو چیز میں نے دیکھی تھی وہ بری تھی؟ قطعی نہیں۔ اگر میں نے جو کچھ دیکھا اسے لوگ اس قدر خود اعتمادی کے ساتھ کرتے ہیں اور سب اس چیز کو ضروری سمجھتے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کو کوئی ایسی بات معلوم ہے جو مجھے نہیں معلوم" یہ تھا وہ نتیجہ جس پر میں پہنچا اور میں نے جاننے کی کوشش کی کہ آخر وہ کیا بات تھی۔ لیکن کبھی نہ جان سکا۔ اور چونکہ میں وہ بات جان نہیں سکا اس لیے میں نے کبھی فوج میں نوکری بھی نہیں کی۔ حالانکہ شروع میں میرا یہی ارادہ تھا۔ اور فوج ہی میں کیا، میں نے کبھی کہیں اور کسی قسم کی ملازمت نہیں کی اور نتیجہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے ایک نکما اور بے کار محض آدمی بیٹھا ہے۔"

"ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کس قسم کے نکمے اور بیکار محض آدمی ہیں" ایک مہمان نے کہا۔

"اگر یہ کہا جائے تو کہیں زیادہ صحیح ہوگا کہ آپ نے نہ جانے کتنوں کو نکما اور بیکار محض ہونے سے بچا لیا۔"

"یہ کیا حماقت کی بات کہتے ہو!" ایوان واسی لیوچ نے واقعی جھنجھلا کر کہا۔

"اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ کے عشق کا کیا انجام ہوا؟" ہم لوگوں نے پوچھا۔

میرا عشق؟ اس دن سے میرے عشق پر اوس سی پڑ گئی۔ جب کبھی ہم دونوں ساتھ ٹہلنے لگتے اور وہ اپنے خاص انداز اور اسی انداز میں مسکراتی تو فوراً ترنل کی میدان والی تصویر میرے حافظے میں ابھر آتی اور اس کی وجہ سے مجھ پر ایک عجیب سی گھبراہٹ اور بے چینی کی کیفیت طاری ہو جاتی اور طبیعت مکدر ہو جاتی۔ سو رفتہ رفتہ میں نے اس سے ملنا ہی بند کر دیا۔ اور اس طرح ہمارے عشق کے سوتے سوکھ گئے۔

تو جناب ایسے ایسے واقعات ہوتے ہیں دنیا میں! اور اسی قسم کے واقعات انسان کی پوری زندگی کو بدل ڈالتے ہیں، اس کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ ماحول ماحول چلاتے ہیں...۔" "(بہترین روسی کہانیاں حصہ اول ص ۲۰۵ تا ۲۰۶)

روسی مطبوعات

(جن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں)

ماں	میکسم گورکی	۲/۵۶	کزاک	ٹالسٹائی	۱/۵۶
انسان کی پیدائش	،،	۱/۱۲	دار ورسن کی آزمائش	نکولائی استروفسکی	۳/-
دشمن	،،	-/۴۴	بے چارے لوگ	فیودر دستوئیفسکی	۱/۳۷
اطالوی کہانیاں	،،	۱/۵۰	تاراس بلبا	نکولائی گوگول	۱/۳۱
ڈرامے	،،	۳/-	سورج کا خزانہ	میخائیل پریشوین	-/۴۴
بچپن	،،	۱/۵۰	وقت کی اڑان	پوستووسکی	-/۳۱
زندگی کی شاہراہ پر	،،	۲/۶۲	اسنیگوتمیس کا ہوٹل	ماتوے تیولیوف	-/۵۰
منزل کی تلاش	،،	۱/۳۷	پائپ	یوری ناگیبین	-/۵۰
ایوان بیلکن کی کہانیاں	پشکن	۱/۱۲	چراغ جلتا رہا	بورس پولیوائی	۲/۶۲
کپتان کی بیٹی	،،	۲/۱۲	داماد	تندریاکوف	-/۵۶
دوبروسکی	،،	۱/۰۶	بہترین روسی کہانیاں	اول	۱/۰۷
جھونکے بہار کے	ترگنیف	۲/۱۹	،، ،، ،،	دوم	۱/۲۵
رودین	،،	۲/۱۲	،، ،، ،،	سوم	۱/۱۹
مومو	،،	-/۲۵	چیل ـــــ ؟ ـــــ	؟	-/۳۱

شراب کہنہ

حاتم

۱۶۹۹ء ——— ۱۷۹۱ء

ظہور الدین نام، پہلا تخلص رمز دوسرا حاتم ۔ شیخ فتح الدین کے بیٹے، مولد و مدفن دہلی۔ سپاہی پیشہ آدمی تھے، اسلاف کا وطن اور تعلیم و تربیت کے معاملے میں تذکروں سے کوئی خاص سراغ نہیں ملتا ہے۔ نواب عمدۃ الملک امیر خاں صوبہ الہ آباد کے مصاحب کی حیثیت سے تھوڑے دنوں تک عیش و فارغ البالی کی زندگی گزاری، اس کے بعد فقیری کی طرف مائل ہوگئے۔ میر بادل علی شاہ کے مرید ہوئے۔ رفتہ رفتہ دنیاوی مشاغل و افکار سے تائب اور کنارہ کش ہوگئے۔ لال قلعے سے متصل شاہ سلیم کا جو تکیہ تھا پچاس برس تک وہاں کے مستقل حاضر باشوں میں رہے۔

جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا، اس کی شہرت اور مقبولیت دیکھ کر انھوں نے بھی 'ریختہ' میں شعر کہنا شروع کر دیا اور تھوڑی ہی مدت میں اپنی استادی کا لوہا منوا لیا۔

میر تقی میر نے اپنے تذکرہ "نکات الشعراء" میں حاتم کو "مردِ جاہل متمکن" ضرور لکھا ہے باقی تذکرہ نویسوں نے ان کی شاعرانہ صلاحیت، خوش طبعی اور وضع داریوں کی تعریف کی ہے۔ ایک موقع پر انھوں نے اپنا یہ شعر سنایا ؎ سر کو ٹپکے ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے ؍ رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے۔ سعادت یار خاں رنگین جو ہر حیثیت سے شاہ صاحب سے کم تھے، بول اٹھے کہ دوسرا مصرع اگر اس طرح ہوتا تو اچھا ہوتا ع ہم نے شبِ ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے۔ حاضرین

مصحفی کے قول کے مطابق ۸۳ برس کی عمر میں ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) میں حاتم نے وفات پائی۔
لالہ سری رام کی تحقیق ہے کہ حاتم نے ۹۴ سال کی عمر میں ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۱ء) میں انتقال کیا۔

کو رنگستانی پسند نہ آئی مگر شاہ صاحب نے نہایت خندہ پیشانی اور فراخ دلی کے ساتھ اس مصرعے کو قبول کر لیا اور کہا "واللہ میں دیوان میں اسی طرح لکھوں گا۔"

شاہ حاتم وہ پہلے بزرگ ہیں جن کو اصلاح زبان کا بھی خیال ہوا، سب سے پہلے اپنے ضخیم سرمایہ شعری سے ایسے اشعار خارج کیے جو معنی و مطلب کے لحاظ سے بے لطف، ایہام سے پُر اور غیر مانوس یا غیر فصیح الفاظ کا مجموعہ تھے۔ (اسی انتخاب کا نام انھوں نے "دیوان زادہ" رکھا تھا اور اس میں پانچ ہزار شعر تھے) ان کا دوسرا قابل لحاظ کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کی درستی کے سلسلے میں کچھ اس قسم کی کوشش بھی کی تھیں جو اُن کے سو برس بعد ذوقؔ اور مومنؔ، ناسخؔ اور آتشؔ کے ذریعے مقبول اور کامیاب ہوئیں۔

حاتمؔ اپنے دور کے ۴۵ شاعروں کے اُستاد تھے، جن میں سوداؔ، رنگینؔ، تاباںؔ اور فائغؔ جیسے لوگ شامل ہیں انھیں کمالات کی وجہ سے وہ "رنگ دہلی" کے موجد بھی کہلاتے ہیں۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ان کا ایک دیوان ہے۔ مجموعی حیثیت سے ان کا کلام صاف عاشقانہ اور کہیں کہیں عارفانہ ہے، شعر آپس میں باتیں، زبان صاف اور سلیس۔ البتہ زبان کی ابتدائی حالت ہونے کی وجہ سے اکثر زائد الفاظ استعمال کرتے ہیں۔" آزاد (محمد حسین) اور سکسینہ کی اس ملی جلی رائے سے دوسرے نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے اختلاف نہیں کیا ہے۔

انتخاب

آبِ حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا — مانندِ خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا
محتاجگی سوں مجھ کو نہیں ایک دم فراغ — حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

نے حسرتِ گُل گشت نہ پرواز کی طاقت — صدقے میں ترے کیا مجھے آزاد کرے گا
کعبہ و دیر میں حاتم بخدا غیر خدا — کوئی کافر نہ کوئی ہم نے مسلماں دیکھا
زندگی دردِ سر ہوئی حاتم — کب ملے گا مجھے پیا میرا
ہجر کی زندگی سے موت بھلی — کر جیسے سب کہیں وصال ہوا
فقیروں سے سُنا ہے ہم نے حاتم — مزا جینے کا مر جانے میں دیکھا...

جس کو دیکھا سو پیاک دشمنِ جاں ہے اپنا — دل کو جانے تھے ہم اپنا سو کہاں ہے اپنا
اس کے قدموں سے لگی رہتی ہے دن رات حنا — خوب دنیا میں بسر کرتی ہے اوقات حنا

ایک دن ہاتھ لگایا تھا ترے دامن کو — اب تلک سر ہے خجالت سے گریباں کے بیچ
ہاتھ مت کھینچ جنوں، تجھ کو مرے سر کی قسم — ایک جب تک بھی ہے تارِ گریباں کے بیچ

حاتم جہاں کو جان کے فانی خدا کو چاہ — اللہ بس ہے اور یہ باقی ہے سب ہوس
جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک — تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک
زلفوں کے بل بتانا، آنکھیں چرا کے چلنا — کیا کج ادائیاں ہیں، کیا کم نگاہیاں ہیں

تم تو بیٹھے ہوئے یہ آفت ہو — اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو
مفلسی اور مزاج، اے حاتم — کیا قیامت کرے جو دولت ہو

اے خرد مندو! مبارک ہو تمھیں فرزانگی — ہم ہوں اور صحرا ہوا اور وحشت ہو اور دیوانگی

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر — سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

میں ناتواں ہوا اس قدر، کہ مدت سے — نہ لب سے نالہ، نہ سینے سے آہ نکلے ہے
زبانِ خلق بھی حاتم، عجب تماشا ہے — جدھر وہ نکلے، اُدھر واہ واہ نکلے ہے

لام نستعلیق کا ہے، اُس بتِ کافر کی زلف — ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

ہر صبح اُٹھ بتوں سے، مجھے رام رام ہے — زاہد تری نماز کو میرا سلام ہے

کہتے ہیں سبھی مہرِ بتاں خواب نہیں ہے — سُنتا ہی نہیں یہ دلِ گم راہ کسی کی

نئی مطبوعات

نام کتاب	مصنف	اشاعت	صفحات	قیمت
عروسِ نیل (سفرنامہ)	سلطانہ آصف فیضی	دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۲۱۶	۳/۲۵
جامعہ کی کہانی	عبدالغفار مدہولی	" " " "	۵۰۰	۶/-
مغل تہذیب	محبوب اللہ مجیب	الہ آباد، کتابستان	۱۳۸	۴/-
طاقت کے پجاری (جاسوسی)	جمیل انجم	مظفر نگر، دائرہ پبلیکیشنز	۳۹۶	۳/۵۰
آتشِ تر (شعری مجموعہ)	خمار بارہ بنکوی	حیدرآباد، نیشنل بک ڈپو	۱۵۲	۴/-
اعتبارِ نظر (تنقید)	احتشام حسین	لکھنؤ، الماس بک ڈپو		۴/۵۰
بوطیقا (ادب)	ارسطو	" " "		۳/-
ایک خواب (شعری مجموعہ)	سردار جعفری	بمبئی، حلقہ ادب		۶/-
رنگِ حنا (" ")	قیصر الجعفری	بمبئی، دورِ حیات پبلیکیشنز		۳/-
فرمودات حضرت مدنیؒ	مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	دیوبند، مکتبہ سعیدیہ		۲/۵۰
ارمانوں کی سیج (ناول)	مہندر ناتھ	دہلی، ایشیا پبلشرز		۲/۷۵
یہ من بڑا چنچل ہے (")	ٹھاکر پونچھی	" " "		۲/۷۵
دھبّے سفید و سُرخ (")	گجندر سنگھ	" " "		۸/-
اُردو کے بدنام افسانے	منٹو، عصمت، عبّاس	دہلی، انڈین اکیڈمی	۱۹۲	۳/-

زیرِ طبع

خزاں (افسانے) پروفیسر رشید احمد صدیقی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

آدمی کا مقدّر (روسی ناول) ترجمہ قرۃ العین حیدر " " " "

زمین کی کہانی چٹانوں کی زبانی محمد امین " " " "

انشائیہ (ادب) ڈاکٹر آدم شیخ بمبئی، رائٹرس ایمپوریم

انتخابِ ذوق سیّد مجید اللہ بمبئی، "

شوخیٔ لب (نامور اور غیر متعارف شعراء کے کلام کا انتخاب)

مرتبہ قیسی رام پوری رام پور، مکتبہ شعرستان

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

فردوس گوش

(سن طباعت ۶۳ء)

شاعر: جوش ملسیانی
صفحات: ۲۳۲ سائز: $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$ مجلد
قیمت: چھ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

"فردوس گوش" پختہ کارانہ فن کاری کا سراسر نمونہ ہے۔ میں نے اور میرے اہلِ نظر احباب نے بار بار اسے پڑھا اور جناب جوش ملسیانی کے کامل فن ہونے کا سب نے اعتراف کیا۔ فرسودگی تو کہیں نام کو نہیں۔ گزشتہ دو تین سال کے اندر نظموں کے جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں کوئی بھی "فردوس گوش" کی گرد کو نہیں پہنچا۔ نہایت حساس ہوتے ہوئے بھی حضرت جوش کی شاعری سنجیدگی اور اعتدال کی مثال پیش کرتی ہے اور تہذیبِ قلب کے لیے وافر سامان بہم پہنچاتی ہے۔ یہ بڑی اعلیٰ قسم کی شاعری ہے۔ میرے ذوق کی صرف اس سے تشفی نہیں ہوئی بلکہ بہت کچھ فائدہ پہنچا۔ "فردوس گوش" انتشارِ جذبات و خیالات کے بجائے توازنِ خیالات و جذبات کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ تہذیب کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

حضرت جوش ملسیانی نے داغ کی فن کاری کا عطر جو اپنے کلام میں کھینچ لیا ہے "استخوان پیش سگان انداختیم" یعنی داغ کی بے اعتدالیوں کے وہ شکار نہیں ہوئے۔ عشقیہ شاعری کو زہریلے عناصر سے بچانا اور اسے مسموم یا معصیت رسان نہ ہونے دینا حضرت جوش ملسیانی کا کارنامہ ہے۔

(فراق گورکھپوری)

تلمیحات

از: محمود نیازی ایم کام
صفحات: ۴۳۱ سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد مع گردپوش
قیمت: چھ روپے
ناشر: نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔
(سن طباعت جون ۱۹۶۴ء)

ترقی یافتہ زبانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ ان کا خزانۂ "تلمیح" سے بھی خالی نہ ہو، اسی لیے قدیم اساتذہ اور اُن کے متبع تلمیحوں کے استعمال سے اپنے کلام کو وقیع اور بلیغ ثابت کرنے میں کوشاں رہا کرتے تھے۔ آج کے شعرا اگرچہ تلمیحات کا کوئی اہتمام یا التزام ضروری نہیں سمجھتے مگر اپنے بزرگوں اور پیش رووں کے اس وصف کے منکر بھی نہیں ہیں۔ تلمیحات کی بدولت زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

چالیس پینتالیس برس ہوئے مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے "تلمیحات" کے عنوان سے ایک نہایت بسیط اور پُراز معلومات مقالہ لکھا تھا اور اہل قلم حضرات کو اس پر کام کرنے کی دعوت بھی دی تھی۔ اُن کی اس عالمانہ کوشش اور مخلصانہ گزارش پر غالباً کوئی قابل لحاظ توجہ نہیں دی گئی۔ لیکن اس زمانے میں محمود نیازی صاحب کی اسی سلسلے کی ایک بالقصد اور منضبط کوشش ہمارے سامنے ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اردو میں جتنی تلمیحیں رائج اور مستعمل ہیں یا ہوئی ہیں ان سب کو تلاش کر کے یک جا کر دیا ہے اور اُن کی تشریح یا وضاحت میں بھی کوئی کمی نہیں رہنے دی ہے اور لطف یہ کہ زیادہ تر تلمیحوں کے لیے اشعار بھی لکھ دیئے ہیں جن میں وہ استعمال ہوئی ہیں اس کتاب میں جو تلمیحیں جمع کی گئی ہیں ان کا تعلق کسی ایک مخصوص جگہ کے واقعات، زبان یا رسم و رواج سے نہیں ہے بلکہ بہت سے ملکوں اور ان کی دیومالا، تاریخ، تہذیب تمدن، مذاہب اور طرح طرح کے طور طریق سے ہے، ان کے بارے میں انتہائی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالے سے چھان بین کر کے معلومات فراہم کرنا کوئی آسان اور معمولی کام نہیں تھا۔

محمود نیازی صاحب اپنی اس ادبی کاوش اور تلاش و تحقیق کے لیے یقیناً بڑی تحسین و توصیف کے مستحق ہیں۔ ۴۳۱ صفحے کی کتاب میں الف سے لے کر ے تک اردو، ہندی، انگریزی، فارسی اور عربی کے حروف تہجی کے لحاظ سے ۴۱۴ تلمیحیں (جن میں تلمیحی محاورے

ہو زلیبی فیلیں بھی آگئی ہیں، مرتب اور مشرح صورت میں جمع کر دینا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے لیے ہر اردو داں کو اُن کا احسان مند ہونا چاہیے۔ یہ کتاب نہ صرف موجودہ نسل کے لیے فائدہ مند اور کار آمد ہے بلکہ مستقبل میں بھی اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے قابل قدر رہے گی کیوں کہ اس میں قرآن، حدیث، انجیل، زبور، توراۃ، وید اور گیتا کے قصص و حکایات یا احکامات و اقتباسات کے علاوہ عوام و خواص کے معتقدات، مفروضات یا سیاسی اصطلاحوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً اگیا بیتال، بالے میاں، جان بُل، انکل سام شیخ سدّو اور لونا چماری وغیرہ تک کے بارے میں اصل اور دلچسپ معلومات درج کر دی گئی ہیں۔

ناانصافی ہوگی اگر مؤلف کے ساتھ ساتھ ناشر کی ہمّت اور اردو نوازی کی داد نہ دی جائے، جو اس کساد بازاری اور اردو فراموشی کے دور میں ایسی مفید کتابیں شائع کر رہے ہیں۔

ایسی کتابوں کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی کتابت و طباعت بھی معیاری اور خوش نما ہو۔ افسوس کہ اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔

(رشید نعمانی)

٭

آتش تر

شاعر: خمار بارہ بنکوی
صفحات: ۲۵۲ سائز: ۲۲×۱۸/۸ مجلد
قیمت: چار روپے (سن طباعت نومبر ۱۹۷۴ء)
ملنے کا پتہ: نیشنل بک ڈپو۔ چار کمان حیدرآباد (دکن)

خمار بارہ بنکوی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن کی بدولت مشاعرے جمتے ہیں اور سر جھومتے ہیں۔ یہ مشہور شعر اُن ہی کا ہے۔

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

خمار کا کلام کسی مسلک یا مقصد کے تقدس و تبرک سے بے نیاز اپنی ہی شگفتگی اور تازگی رکھتا ہے۔ وہ غزل کہتے ہیں اور لطفِ غزل کے ساتھ کہتے ہیں۔ اُن کے لہجے میں نرمی اور لوچ ہے۔ آہنگ میں ترنم اور لطافت۔ چند شعر سنیے:

رہتے ہوا تنے بے قرار کس لیے ان دنوں خمار — عشق تو مہرباں نہیں تم پہ نصیب دشمناں
ہم بھی کبھی تھے ہوشیار، اب تو یہ حال ہے خمار — ان کی خبر تو درکنار، اپنی بھی کچھ خبر نہیں
خمار اب یہ زمانہ شوق سے ہم پر ہنسے لیکن — محبت کو خدا بخشے کبھی تھے دن ہمارے بھی
چلا ہوں میں کوچے سے اُن کے بگڑ کر — ہنسی آ رہی ہے کہ آنا پڑے گا

اُن کے یہاں شکوہِ الفاظ کا جادو نہیں جگایا جاتا۔ وہ تراکیب کے سیلِ رواں میں بھی نہیں بہہ نکلتے۔ اُن کا کلام تشبیہات و استعارات کی فسوں کاری پر بھی تکیہ نہیں کرتا۔ اُن کے یہاں "حسنِ سادگی اور سادگی کا بانکپن نظر آتا ہے:

یہ مانا زندگی فانی ہے لیکن — اگر آجائے جینا، جاوداں ہے
وہ کا نٹا ہے جو چبھ کر ٹوٹ جائے — محبت کی بس اتنی داستاں ہے
حالِ دل اُن سے کہہ چکے سو بار — اب بھی کہنے کی بات باقی ہے
اس طرح بسر ہوتے ہیں دن رات ہمارے — اک تازہ بلا آئی جو اک ٹل گئی سر سے

خمار کے دل میں۔ جگر مرادآبادی کی بڑی قدر ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ غزل بعد جگر اک کشتیٔ بے ناخدا سی ہے۔ خمار کی اس عقیدت مندی نے اُن کے کلام کو بہت کچھ متاثر کیا ہے۔ خمار کا ایک شعر ہے:

اس دورِ ترقی میں سبھی کچھ ہے میسّر — اک چیز محبت ہے کہ پائی نہیں جاتی

اس شعر کے پڑھتے ہی جگر کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے — گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

خمار کے کلام میں حوادثِ زمانہ کا عکس بہت کم دکھائی دیتا ہے لیکن جہاں کہیں انہوں نے حالات سے متاثر ہو کر کچھ کہا ہے "جگر ہی کے انداز میں لوازمات تغزل اور اہتمامِ شاعرانہ کے ساتھ کہا ہے:

نسبت تو چمن سے رکھتے ہیں، ارباب چمن پر بار سہی — پھولوں کو مبارک رعنائی، ہم خار اگر ہیں خار سہی
ہم قفس میری اسیری کا سبب کچھ بھی نہیں — بات یہ تھی آشیاں کو آشیاں سمجھا تھا میں

ذرا دیکھئے کہ یہ دونوں اشعار جگر کے ان اشعار سے کتنے قریب ہیں اور کتنے دور:

پھولوں کو نازِ حسن اگر ہے تو ہو جگر — کانٹے بھی ہیں غرورِ گلستاں لیے ہوئے
کیا بتاؤں کس قدر زنجیرِ پا ثابت ہوئے — چند تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

آتشِ تر کا "حرفِ آغاز" سردار جعفری نے تحریر فرمایا ہے۔ اور ان کے یہ آخری الفاظ بڑا وزن رکھتے ہیں: "یہ مجموعہ جتنا مختصر ہے اتنا ہی دلفریب۔ یہ ایک خوبصورت سوغات اور حسین تحفہ ہے۔ مختار کی طرف سے۔ کون ہے جو اسے ہاتھوں ہاتھ نہیں لے گا"

(عبداللہ ولی بخش قادری)

پھول اور کانٹے

(سنِ طباعت ستمبر ۱۹۶۴ء)

شاعر: موہنی زتشی
صفحات: ۱۱۹ سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے
ناشر: موہنی پرکاشن ۱۱ وزیر حسن روڈ لکھنؤ

محترمہ موہنی زتشی ایک ممتاز کشمیری بزرگ پنڈت کرتا کشن تکو کی صاحبزادی ہیں۔ پنڈت جی غالب و حافظ کے شیدائی تھے۔ دیوان حافظ تو ہمیشہ ان کے پلنگ پر تکیہ کے پاس رکھا رہتا تھا۔ ان کے یہاں پابندی سے ادبی نشست ہوتی تھی ــــ اس ماحول میں موہنی کا بچپن پروان چڑھا۔ اردو کے ساتھ فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ کم سنی ہی میں غالب ذوق۔ دیاشنکر نسیم اور انیس کے کلام کا مطالعہ کیا۔ شعرگوئی کا ملکہ خداداد تھا۔ پھر علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی کے فیضانِ اصلاح نے اس کو تابناکی عطا کی۔

موہنی نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "پھول اور کانٹے" رکھا ہے۔ اس کی معنویت ان کی رقم کردہ چند سطور سے واضح ہو جاتی ہے۔

"زندگی کے چند خوشگوار لمحوں کے ساتھ زندگی کی تلخیاں ٹھیک اسی طرح وابستہ ہیں جیسے پھولوں کے ساتھ کانٹے" (موہنی زتشی)

کتاب کا پیش لفظ حبیب احمد صدیقی نے لکھا ہے نظموں کا دائرہ وسیع ہے زندگی، وطن اور ممتاز شخصیات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ غزلیہ شاعری کا انداز چند اشعار سے واضح ہو سکے گا۔

کاشانۂ دل کو بھی سمجھیں گے بس اب زیست کا حاصل	توبہ ہے کہ کچھ ترکِ تمنا نہ کریں گے
پوری ہوئی کاشانے جنت کوئی دل کی آرزو	امید و بیم تجھ سے ہی کہ ہم بہل سکے

یا خدا منزل کا اپنی کچھ پتہ ملتا نہیں   عمر بھر بندہ ترا چلتا رہا چلتا رہا

"دو تنکے" شاعرہ کی بہترین نظم ہے جو قدرت مشاہدہ۔ فلسفۂ زندگی اور محاسن شعری کی آئینہ دار ہے۔

شاعرہ کی تصویر بھی شامل اشاعت ہے۔ غلافی آنکھوں کی گہرائی خمیدہ ابرو۔ اور گھنی زلفوں کی وارستگی سے شاعرہ کی ذہانت اور تجسس کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب سلیقے سے چھپی ہے۔ اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

(سیفی پرمی)

❁

دیمک

از: محمد حسین حسان

صفحات: ۶۴   سائز: ۲۰×۳۰/۱۶

(سن طباعت دسمبر ۱۹۶۴ء)   قیمت: ۸۵ پیسے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

یہ کتاب ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ کی طرف سے بالغوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس میں اس ننھے مگر انتہائی خطرناک کیڑے کا حال بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کہاں کہاں پایا جاتا ہے۔ اس سے کیا کیا نقصان پہنچتا ہے۔ اس نقصان سے بچنے کی کیا تدبیریں ہیں۔ مگر سب سے اہم سب سے دلچسپ حصّہ وہ ہے جس میں دیمک کے رہن سہن بستی کا انتظام اور ترقی کے لئے اس کی مسلسل جدوجہد اور دشمن سے بچاؤ کے لئے اس کی بہادری اور قربانی کا حال لکھا گیا ہے۔

پوری کتاب مکالمے کی شکل میں ہے۔ پس منظر یا ماحول دیہاتی ہے۔ اس لئے پڑھنے والے کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ کتاب کی زبان بہت صاف ستھری اور رواں دواں ہے۔ انداز بیان بھی بہت دلچسپ ہے۔ پوری کتاب بلاک سے چھپی ہے۔ جگہ جگہ تشریحی تصاویر نے کتاب کی خوبصورتی اور افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ عام قارئین خصوصاً ثانوی کے طالب علموں کے لئے بھی اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

(ردولی شاہ جہاں پوری)

مکتبہ جامعہ کی شائع کردہ کچھ ہندی کتابیں

سبق آموز کہانیاں ڈرامے

ایمان داری ڈاکٹر ذاکر حسین -/۵۰
بونے کی کھیتی حامد علی خاں ۱/۰
پرم پرا جبیب تنویر -/۶۲
ٹیپو سلطان " " -/۵۰
چاندی کا چمچہ " " -/۲۵
چپا کا لال حامد علی خاں -/۲۵
چور لڑکا عبدالغفار مدہولی -/۵۰
ساہس کے پھول عبدالواسع عصری -/۵
کیمپ فائر کی نقلیں اول عبدالغفار مدہولی -/۸۷
" " " دوم " " -/۷۵
گلستاں کی کہانیاں مرتبہ محمد حفیظ الدین -/۵
مولانا روم " " " " " -/۵۰
موسموں کا کھیل مرزا فرحت اللہ بیگ -/۶۲

نظمیں پہیلیاں

ڈھول بجے رے سید نواب علی رضوی -/۴۰
منور نجک پہیلیاں -/۷۵

معلومات

ایورسٹ کی کہانی پروفیسر آل احمد سرور -/۵۰
امریکہ -/۵۰
اپنا گھر -/۵۰
بجلی کی کہانی علی احمد خاں -/۵۰
چیونٹی بیگم قدسیہ زیدی -/۶۲

دلی -/۵۰
سمندر کے کنارے آصف فیضی ۱/۲۵
گاندھی بابا بیگم قدسیہ زیدی ۲/۰
مدھومکھی " " " -/۶۲
منور نجن اور کام -/۵۰
ہمارا راج مدن موہن گپت -/۶۲

مذہب

(ان کتابوں کا صرف رسم الخط ہندی ہے
لیکن زبان آسان اردو استعمال کی گئی ہے)

حضرت محمدؐ الیاس احمد مجیبی -/۶۰
ہمارے نبی سید نواب علی رضوی -/۴۰

طریقۂ تعلیم

جامعہ ودھی عبدالغفار مدہولی ۲/۷۵
کھیل دوارہ سکشا اول " " ۲/۰
" " " دوم " " ۲/۰
ہندی پڑھانے کا رُچیکر ڈھنگ " ۱/۷۵

ڈرامے

آزمائش پروفیسر محمد مجیب ۱/۲۵
خالد کی خالہ بیگم قدسیہ زیدی ۱/۷۵
مٹی کی گاڑی " " " ۲/۵۰

متفرق

آپ کا بالک اس کا سواستھ اور پالن پوشن ۲/۰
بھارت نئے سمودھان تک (نیا آئین) ۳/۰

●●

ادبی خبریں

پٹیالہ میں اردو کالج یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ انجمن ترقی اُردو، پٹیالہ کی کوششوں سے پٹیالہ (پنجاب) میں بھی ایک اردو کالج کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ انجمن ترقی اُردو، پٹیالہ اس کامیابی کے لیے قابلِ مبارک باد اور لائقِ صد تحسین ہے۔

"اُردو سنسکرتی" کا رسمِ افتتاح رسول اکرم صلعم کی مبارک زندگی پر مراٹھی کے نامور ادیب اور تحریک آزادی کے لیڈر شری سانے گروجی کی مراٹھی تصنیف "اسلامی سنسکرتی" کا افتتاح سعید ۷ر فروری ۱۹۶۵ء کو بمبئی کے "انجمن اسلامی ہائی اسکول" ہال میں عمل میں آیا۔ اس موقع پر بمبئی کے علم دوست اصحاب و خواتین کا ایک اچھا اجتماع ہوا جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے شرکت کی۔

یعقوب بیگ ہائی اسکول نیو یل ایجوکیشن سوسائٹی بمبئی کی طرف سے جناب بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے کی صدارت میں یعقوب بیگ ہائی اسکول کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے سلسلے میں ۳ر فروری ۶۵ء کو ایک شاندار تقریب منائی گئی۔ اس موقع پر جناب یحییٰ بھائی جسدن والا، جناب مہر جسلائی، جناب پی، کے لیمئے، جناب اے ' اے راوت اور جناب شاہد علی خاں (منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شاخ بمبئی) نے بصیرت افروز تقریریں کیں اور تعلیم کے موضوع پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی۔

یادِ غالب ۱۴ر فروری ۶۵ء کو غالب مرحوم کی ۹۶ ویں برسی منائی گئی۔ اس دن دہلی میں مرزا غالب کے مزار پر ۳ بجے سہ پہر فاتحہ خوانی اور گل پاشی کے بعد جناب بیرسٹر نورالدین احمد صاحب کی صدارت میں ایک بزمِ مقالات منعقد ہوئی۔ جس کا افتتاح جناب پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب مرکزی وزیر تیل و معدنیات نے فرمایا۔

اس کے بعد اسی شب مزار غالب کے متصل "چونسٹھ کھمبا" میں مشاعرہ ہوا جس میں مختلف شعراء نے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مشاعرہ کی صدارت جناب آنند نرائن ملا صاحب نے فرمائی۔

فارم IV حسب قاعدہ ۸ بابت کتاب نما نئی دہلی

- مقام اشاعت: جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

۱۔ وقفہ اشاعت: ماہنامہ

۲۔ پرنٹر کا نام: سید احمد ولی قومیت: ہندوستانی پتہ: جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

۴۔ پبلشر کا نام: سید احمد ولی قومیت: ہندوستانی پتہ: جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

۵۔ ایڈیٹر کا نام: ریحان احمد عباسی قومیت: ہندوستانی پتہ: بستی نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

۶۔ مالکان کے نام پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی

چیرمین: پروفیسر محمد مجیب جامعہ نگر، نئی دہلی

ڈائرکٹر: ۱۔ سید مجتبیٰ حسین زیدی، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

۲۔ ڈاکٹر عبدالعلیم، ۳ یونی ورسٹی روڈ، علی گڑھ

۳۔ مسٹر ایم، آر چنائے۔ مہر بلڈنگ، چوپاٹی، بمبئی ۷

۴۔ مسٹر ایم ایچ ہاشم پریم جی، ۵ گھوگا اسٹریٹ، بمبئی ۱

۵۔ ہزہائی نس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور۔ کف پریڈ کولابہ بمبئی

۶۔ کرنل بشیر حسین زیدی ایم پی۔ ۱۱/۱۲ جن پتھ لین، نئی دہلی

۷۔ کمپنی کے سرمایہ کے ۱ فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

اسلام جیم خانہ، کینیڈی سی فیس، بمبئی

شری مالک رام بویجہ، وزارت خارجہ حکومت ہند، نئی دہلی

میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

۲۵ر فروری ۱۹۶۵ء

دستخط احمد ولی (پبلشر)

کتاب نما

سالانہ چندہ ایک روپیہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵	فی پرچہ ۱۰ پیسے

پرنٹر و پبلشر سید احمد ولی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

کچھ اچھی کتابیں

ڈرامے

اوپر کی منزل	کرتار سنگھ دگل	۴/-
آزمایش	پروفیسر محمد مجیب	۱/-
آئینۂ ایام	پرسٹلے	۲/۵۰
آذر کا خواب	بیگم قدسیہ زیدی	۱/۵۰
بند لفافہ	اشتیاق حسین قریشی	-/۲۱
جان ہار	بیگم قدسیہ زیدی	۱/۳۷
خالد کی خالہ	بیگم قدسیہ زیدی	۱/۷۵
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۲/۵۰
دل سے قریب	انتصار حسین	۱/۷۵
سراج الدولہ	سچین سین گپتا	۱/۵۰
کھیتی	پروفیسر محمد مجیب	-/۷۵
موت پر فتح	جیالال ساز	۱/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

Regd. No. D. 58 March, 19

Kitab Numa

JAMIA NAGAR, NEW DELHI. 25.

کتاب نما

ماہنامہ نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

مجلس ادارت
غلام ربانی تاباں

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۶ | اپریل ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۴

اشاریہ

مارچ کا مہینہ کتابوں کی دنیا میں بھی "سیزن" کا مہینہ کہلاتا ہے۔ گورنمنٹ کے مالی سال کا آخری مہینہ ہونے کی وجہ سے اس مہینے میں عموماً لائبریری وغیرہ کی کتابوں کی خریداری کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ اس سال اردو کتابوں کی دکانوں پر پچھلے چند برسوں کے مقابلے میں نسبتاً کچھ کم مصروفیت دیکھنے کو ملی۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اُردو کو نظر انداز کرنے کا رجحان اور تحریک اپنا اثر کر رہی ہے لیکن ہمیں ان باتوں سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ بعض جگہ اگر اُردو سے بے اعتنائی کی جا رہی ہے تو دوسری طرف اردو دوستوں کی کوششیں بھی بہت سی جگہوں پر اسے اس کا جائز حق دلانے میں سرگرم ہیں اور یہ ایک نیک شگون ہے۔ بہر حال یہ کشمکش برابر جاری ہے اور پتہ نہیں کب تک اور جاری رہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسی طرح کی کشمکش ہمیشہ حیات کی ضامن ہوا کرتی ہے اور ہمیں کامل یقین ہے کہ بالآخر ہماری اس کشمکش اور جد و جہد کا نتیجہ ضرور اچھا نکلے گا۔

ہمیں خوشی ہے کہ مکتبہ جامعہ سے معیاری کتابوں کی سستے ایڈیشن شائع کرنے کے سلسلے کی پہلی کتاب، میر امن کی معرکتہ الآرا تصنیف "باغ و بہار" جس کا ذکر ہم اس سے پہلے کے شماروں میں کر چکے ہیں، تیار ہو گئی ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس کتاب کی اشاعت میں ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ تاخیر ہوئی اور صاحبانِ ذوق کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ مگر ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ اب جب کہ یہ کتاب ان کے مطالعے میں آئے گی تو انھیں اندازہ ہو جائے گا کہ اس کی اشاعت میں: ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

پروفیسر محمد مجیب صاحب کے ڈرامے "خانہ جنگی" کا بھی جو کچھ عرصے سے ختم تھا اب نیا ایڈیشن تیار ہو گیا ہے۔

رشید حسن خاں

اُردو مثنویوں میں
ہندوستانی تہذیب کی جھلک

تہذیب کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے، جہاں مختلف قوموں کے میل ملاپ سے، نئی روایتوں کے خاکے بنتے رہتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد، وہ ملی جلی روایتیں، قومی اور ملکی تہذیب کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ عمارتوں کے خاموش در و دیوار ہوں یا میلوں ٹھیلوں کے پرشور میدان، شادی بیاہ کی رسمیں ہوں یا ٹونے ٹوٹکے، محبت کی کہانیاں ہوں، بہادری کی داستانیں ہوں یا جنوں پریوں کے قصّے۔ ان سب میں اس میل ملاپ اور تہذیبی لین دین کے ہلکے گہرے رنگ دیکھے جاسکتے ہیں۔

اردو ادب کی [illegible]مان، فارسی ادب کی روایتوں کے سایے میں ہوئی، لیکن اس کی رگوں میں ہندوستانی تہذیب کا خون دوڑتا رہا۔ قصّے کہانیوں کی بنیاد نیم مذہبی روایتوں پر ہو یا نیم تاریخی واقعات پر، تفصیلات میں مقامی آب و رنگ کا شامل ہونا، لازمی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر کی جلوہ گری سب سے زیادہ ہے۔ ان مثنویوں میں ہندوستان کے موسموں کی رنگینیاں، یہاں کی مذہبی و غیر مذہبی رسموں کی تفصیلات اور خالص مذہبی تلمیحیں بھی ملتی ہیں اور اس ملے جلے کلچر کی رنگا رنگ ترجمانی بھی ملتی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں ساتھ رہنے سے عالم وجود میں آیا۔

اردو میں بڑا ذخیرہ ان مثنویوں کا ہے جن میں قصّے کے بعض اجزا ہندوستانی ہیں، بعض ایرانی۔ لیکن رسم و رواج اور مناظر، ہندوستانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ قصّہ کسی دوسرے ملک کا ہے، لیکن اس کے بازار، قلعہ اور چوک، ہندوستانی شہروں کی یاد دلاتے ہیں۔ شادی پرستان میں ہو رہی ہے، رسمیں ساری ہندوستانی ہیں۔ بچّے کی پیدائش کے بعد، نجومی پوتھیاں کھولے ہوئے، مستقبل کا حال بتاتے ہوئے ملتے ہیں۔ باغوں میں ہندوستانی پھل کھلے ہوئے ہیں۔ ٹونے اور ٹوٹکے اور شگون، ہندوستانی روایتوں کی داستان

کہہ رہے ہیں۔ برات پرستان سے آئی ہے، مہمانوں کے سامنے چکنی ڈلی، الائچی، پان پیش کیے جا رہے ہیں، جلوے کی رسم ادا ہو رہی ہے، شہانے گائے جاتے ہیں، ڈومنیوں کو نیگ دیا جاتا ہے، ہر طرف ہریلے بنے کا شور ہے۔

میر حسن نے مثنوی سحرالبیان میں بے نظیر اور بدر منیر کی برات کی تفصیلات اس طرح لکھی ہیں کہ اس زمانے کی ہندوستانی معاشرت کے اس پہلو کی ایک ایک تفصیل سامنے آجاتی ہے۔ سمدھنوں کے اترنے کا ایک منظر دیکھیے:

اترنے کی واں سمدھنوں کے پھبن — کھلیں پھول جیسے چمن در چمن
گلے میں پہنانا وہ ہنس ہنس کے ہار — سٹاسٹ وہ پھولوں کی چھڑیوں کی مار
قہقہے، ہنسی، شور و غل، تالیاں — سہانی سہانی نئی گالیاں

نکاح کے بعد ہار پان بٹتے ہیں اور دولھا کو اندر بلایا جاتا ہے۔ دُلھن سُرخ جوڑا پہنے، عطر سہاگ لگائے بیٹھی ہے:

عروسی وہ گہنا، وہ سوہا لباس — وہ مہندی سہانی، وہ پھولوں کی باس
ملا سرخ جوڑے پہ عطرِ سہاگ — کھلے دل کے دونوں کے آپس میں بھاگ

اب رسمیں شروع ہوتی ہیں جو سراسر ہندوستانی تہذیب کی یادگار ہیں۔ شگون کے لیے کوئی دولھا کے کان سے سہاگا لگا جاتی ہے، کوئی دُلھن کی جوتی چھوا جاتی ہے، نوشہ سے نبات چنوائی جاتی ہے:

وہ جلوے کا ہونا، وہ شادی کی دھوم — وہ آپس میں دولھا دُلھن کی رسوم
سہاگا، گئی کان کوئی لگا — گئی کوئی دُلھن کی جوتی چھُوا
چُنائی نبات اس کو اس گھات سے — کہ ڈھکا دیا ہر گھڑی ہاتھ سے

مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی کی مثنوی میں برات کی ساری رسموں کا ایسا مفصل بیان ہے کہ اُس زمانے کی معاشرت کی قدِ آدم تصویر سامنے آجاتی ہے۔ سمدھنیں سواریوں سے اتر رہی ہیں:

کچھ کشتیاں ساتھ لے کے اک بار — اُتریں سب سمدھنیں طرح دار
اک ناز سے شرم کھائے اُتری — اک پانچوں کو اُٹھائے اُتری
یاں بھی پریوں کا تھا اکھاڑا — تیار کھڑا تھا سارا دھاڑا

ڈالا جس کے گلے میں ایک ہار ساتھ ہی اس کے چھڑی لگی دی مار

نوشہ، مانجھے کا زعفرانی جوڑا پہنے، کنگنا باندھے ہوئے، ہندوستانی روایت کا پتلا بنا بیٹھا ہے:

جوڑا مانجھے کا زعفرانی رنگِ عاشق کی تھا نشانی
کنگنا جو بندھا، کُھلا یہ اسرار ہاتھ آگیا نجم بختِ بیدار
دولھا کو محل میں جب بُلایا دیکھا جس نے، یہی سُنایا
بھولا، بنّو کا یہ بنا ہے دولھا لاڈو کا لاڈلا ہے

سانچق روانہ ہو رہی ہے، سامان کی تفصیلات، ہندوستان کی مشترک تہذیب کی آئینہ دار ہے:

چاندی کے ہزار چوگھڑے تھے سونے کے آٹھ سو گھڑے تھے
مٹکے، صندوقچے طلا کار چھکڑوں پہ نقل و قرص کے بار

رسم و رواج کے ساتھ ساتھ، کرداروں کا لباس، اور رہن سہن بھی ہندوستانی معاشرت کا ترجمان ہے۔ لباس، زیور اور سامانِ آرایش وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی جاتی ہے، اس کی روشنی میں، وہ کردار سر سے پیر تک ہندوستانی سماج کا ایک فرد معلوم ہوتا ہے۔ میرحسن نے ایک پری کا سراپا لکھا ہے، جس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا ہے، مسّی کے ساتھ پانوں کا لکھوٹا جما ہوا ہے، چمپا کلی، نَو رتن، پہنچی، بند، دُھگدگی پہنے ہوئے، ہندوستانی سہاگن معلوم ہوتی ہے۔

کسی کی تلاش میں جوگن بن کر نکلنا، ہندوستان کی پرانی روایت ہے۔ مثنوی 'سحرالبیان' میں نجم النسا اسی طرح بے نظیر کو ڈھونڈھنے نکلی ہے۔ ابن نشاطی کی مثنوی 'پھولبن' میں ایک ایرانی شہزادی جوگن بنی ہوئی، تلاش محبوب میں سرگرداں ملتی ہے:

بھبھوتی اپنے موں کو پھر لگائی پنم کا چاند بادل میں چھپائی
برہ کے درد دکھ سوں پدمنی وو چلی بیراگ سے بیراگنی وو

مثنوی 'سراپا سوز' میں ایک رئیس زادہ جوگی بن کر آتا ہے:

لوگ تھے گرد ماتمی سج سے بیچ میں وہ جواں تھا اس دھج سے
تن کی اس کے بھبوت سے یہ نمود جیسے دُرِ یتیم گرد آلود

سر پہ یوں زر کے اینڈوے کی چھبن | ہو وے سورج کے گرد جیسے کرن
کُنڈل اُن کانوں میں آفتِ ہوش | مہر و مہ حسن کی چھب کے حلقہ بگوش

مثنویوں میں ملازمین، اہلِ حرفہ اور دوسرے لوگوں کی جو تصویریں کھینچی گئی ہیں، وہ سر سے پیر تک ہندوستانی معلوم ہوتی ہیں۔ کنیزوں کے نام، زیور، گفتگو، غرض ہر چیز ہندوستانی معاشرت کی عکاسی ہے۔ میرحسن پرستانی کنیزوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کنیزانِ مہ رو کی ہر طرف ریل | چمیلی کوئی، اور کوئی لئے بیل
رنگیلی کوئی، اور کوئی شام روپ | کوئی من لگن، اور کوئی کام روپ
بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے | کہیں واہ وا، اور کہیں واچھڑے

مثنویوں میں تلمیحات کی بہتات ہے، جن کے فیض سے بے شمار پرانی روایتیں سامنے آجاتی ہیں۔ بیسیوں ہندوستانی روایتوں کا پیوند غیر ہندوستانی قصے میں اس طرح لگایا گیا ہے کہ وہ اصل قصے کے حقیقی اجزا معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً مثنوی گلزارِ نسیم" میں سونبر کا ہونا اور راجہ اندر کے دربار کا ذکر، قدیم ہندوستانی روایتوں کا عکس ہے۔ راجہ اندر کا بکاؤلی کو بددعا دینا، ہندوستانی کہانیوں کے شراپ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اور بکاؤلی کا دوبارہ پیدا ہونا، آواگون کے عقیدے کی ترجمانی ہے۔

اُردو میں ایسی مثنویوں کی خاصی تعداد ہے جن میں ہندوستان کے موسموں، شہروں اور تیوہاروں کا نہایت مفصل بیان ہے۔ ایک ایک تفصیل پر ہندوستانی فضا کی اور یہاں کے رسم و رواج کی مُہر لگی ہوئی ہے۔ مثلاً قائم چاندپوری کی مثنوی "دربیان ہولی" کے یہ شعر دیکھیے:

زبس ہر گلی میں ہے لڑکوں کا شور | ہے کیچڑ میں ہر راہ رو شور بشور
کسی پر کوئی چھپکے پھینکے ہے رنگ | کوئی قمقموں سے ہے سرگرم جنگ
کسی نے لگائی ہے کونے میں گھات | کہ بازی میں خلوت کی ہو لاگ ہاتھ
ہے ڈوبا کوئی رنگ میں سر بسر | فقط آب میں ہے کوئی تر بتر

برسات کا موسم، ہندوستان کا خاص موسم ہے۔ ساون کا ذکر آتے ہی، نہ معلوم کتنے رومانی تصورات گھٹا بن کر چھا جاتے ہیں۔ کالی گھٹائیں، جھنکارتے ہوئے مور،

باغوں میں پڑے ہوئے جھولے، رومان سے لبریز گیت، غرض معلوم نہیں کتنی داستانیں یاد آجاتی ہیں۔ حالی کی مثنوی "برکھارت" کا یہ اقتباس دیکھیے:

پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پی ہو پی ہو اور مور جھنکارتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
جاتا ہے کوئی ملہار گاتا ہے دیس میں کوئی گنگناتا
کم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا

بے نظیر شاہ وارثی نے اپنی طویل صوفیانہ مثنوی میں ہندوستان کے موسموں کی بے مثال قدرتی تصویریں کھینچی ہیں۔ بہار کے موسم کا مرقع دیکھیے، نام کو بھی ایرانی اثر نہیں ملے گا:

وہ پھولا ہوا ڈھاک بھی ہر طرف لگائے ہوئے آگ سی ہر طرف
وہ سرسے کے پھولوں کی خوشبو تند جیسے سونگھتے ہی کھلے ذہن کُند
کدھر سے یہ آئی ہوا یا مجیب مگر ہے کروندے کا جنگل قریب
کہیں نیم کے پھول عطر آفریں کہیں گچھے کچنار کے نازنیں
وہ سہجن کے، وہ سرخ گھنگچی کے پھول املتاس اور مال کنگنی کے پھول

صبح بنارس کا ایک منظر دیکھنے کے قابل ہے، بنارس، ہندوستان کی قدیم روایتوں کا گہوارہ بھی ہے اور حسن و نور کے رومانی تصورات کا خزانہ بھی، کیسی سچی اور واضح عکاسی ہے:

بچھائے ہوئے مرگ چھالے فقیر لب نہر تڑکے سے ہیں جائے گیر
وہ جوگی بھی دھونی رمائے ہوئے ہیں پوجا میں آسن جمائے ہوئے
وہ سیلے، وہ جوڑے چمکتے ہوئے وہ کانوں میں مندرے ڈھلکتے ہوئے
نہانے کو وہ نازنینانِ شہر چلی آتی ہیں کس طرح سوئے نہر
وہ تھالی میں سیندور چندن لیے کوئی آرہا ہے عجب آن سے
بنارس کی وہ ریشمی ساڑیاں وہ گھونگھٹ ڈھلکتا ہوا الاماں

کٹوری میں کوئی لیے پھول، پان — کھڑی ہے وہ مندر میں مندر کی جان
مہادیو کو جل چڑھا کر تمام — چلی جاتی ہیں اپنے گھر شاد کام

اُردو کی مثنویاں، قدیم ہندوستانی روایتوں کی بھی سرمایہ دار ہیں اور مشترک تہذیب کی بھی ترجمان ہیں۔ ان میں ہندوستان کے موسموں، منظروں، شہروں اور ہندوستان کی روایتوں کے خزانے محفوظ ہیں، رسم ورواج کے افسانے درج ہیں، ان میں بہادری کی داستانیں بھی ہیں اور محبت کی کہانیاں بھی ہیں۔ ان داستانوں میں رنگ ونسل کے امتیاز کی حدیں ٹوٹ گئی ہیں۔ سماجی سطح پر سیکڑوں برس تک ہندوستان میں جس ہم رنگی و یک رنگی کی روایت پروان چڑھتی رہی، اس کی تفصیلات بکھری ہوئی ہیں۔

ہندوستان کی یہ خصوصیت بیان کی جاتی ہے کہ یہاں بے شمار لوگ باہر سے آئے اور مقامی خصوصیات میں رنگتے چلے گئے، ان مثنویوں میں بھی یہی خصوصیت صاف صاف نظر آتی ہے کہ ایرانی شہزادے ہوں یا پرستان کی پریاں، یہ سب ہندوستانی لباس پہنے ہوئے اور ہندوستان کے رسم ورواج کی روشنی میں نہائے ہوئے ہیں۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

شاد عارفی

قطعات

بستے بغلوں میں ہاتھ میں انٹے   راہ میں کھیلتے ہوئے لڑکے
ان کے تیور بتا رہے ہیں شاد   یہ بنیں گے وطن کے ایم ایل اے

ستم جب مدحِ محفل کے لیے اصرار کرتا ہے   زباں اقرار کر لیتی ہے دل انکار کرتا ہے
جو اپنی بات منواتا ہے طاقت سے درپردہ   غریبوں کو بغاوت کے لیے تیار کرتا ہے

اب نہ بت خانے سے مطلب ہے نہ کعبے سے لگاؤ   کفر سے بھی ہاتھ دھویا کھو دیا
آشیاں بجلی قفس صیاد گلچیں الغرض   نذرِ آتش کر رہا ہوں میرا دیوان بھی

سامنے رکھا ہے اُلٹا آئینہ   عقلِ اربابِ مسائل ایک ہے
کس سے بدنظمی پہ کیجے گفتگو   یہ تو سب محفل کی محفل ایک ہے

اجتماعیت ہے معراجِ چمن   مختلف پھولوں کا حاصل ایک ہے
ایک وطن سو فرقہ بازانِ وطن   سیکڑوں قاتل ہیں بسمل ایک ہے

ناخداؤں نے ڈبویا ہے ہمیں   ورنہ کشتی ایک ساحل ایک ہے
راہزن کترا کے جائیں گے نکل   قافلے والو اگر دل ایک ہے

نت نئی منصوبہ بندی کے لیے مغموم ہیں   یعنی اربابِ حکومت پاک ہیں معصوم ہیں
ہر خرابی کے مگر مجرم ٹھہرتے ہیں عوام   بکریاں گویا ہیں ظالم، بھیڑیے مظلوم ہیں

("سفینہ چاہیے" طبع فروری ۱۹۶۵ء قیمت -/۳ حوالہ صفحات ۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱)

سلطانہ آصف فیضی

حرم شیخ رجب

...... تمام بلاد مصر کے اطراف و جوانب میں " ج " کی آواز گ ہے۔ اسی لیے "شیخ رجب" کو "شیخ رگب" پڑھیے۔ اب ان کی تعریف بھی سن لیجیے۔ یہ شیخ صاحب مغرب یعنی طرابلس سے زمانہ ہوا یہاں آکے بس گئے تھے۔ اور اطراف واکناف کے جس قدر بدو عرب ہیں وہ شیخ صاحب کو اپنا سردار مانتے ہیں اور ان کے حکم پر اپنا سر جھکاتے ہیں۔

یہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر حکومت بدوؤں سے کوئی حکم منوانا چاہتی ہے تو شیخ رگب کے توسط سے یہ کام آسانی سے انجام پاجاتا ہے۔ مگر سرداری کے علاوہ شیخ صاحب مختلف قسم کا بیوپار بھی کرتے ہیں اور بہت سے اونٹ بکریوں کے مالک بھی ہیں۔ گزشتہ جنگ کے خاتمہ کے بعد سے ان کے پاس دو لاریاں بھی موجود ہیں۔ جو مرسیٰ مطروح سے اسکندریہ تک مختلف قسم کے اسباب کرایہ پرلے کر دوڑتی رہتی ہیں۔ اس قسم کا چھوٹا موٹا بیوپار کرکے وہ اس قصبے کے اچھے خاصے رئیس بن گئے ہیں۔ مگر رہتے اب تک اس قدیم مکان میں ہیں جو نہ گھر کہلایا جاسکتا ہے نہ بدو کا خیمہ اس کا حال آگے سنیے :-

دوسرے روز ہم شیخ صاحب کے گھر مدعو تھے نہ صرف ہم بلکہ ہمارے ڈرائیور حسین اور نوکر علیم خاں کو بھی شیخ صاحب نے مدعو کیا تھا۔ ان کو اپنے گھر میں اپنے برابر بٹھا کر کھانا کھلایا۔ مہمانوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے ساڑھے بارہ بجے خود ہوٹل پر آموجود ہوئے۔ آج بھی وہی کل والا لباس پہنے ہوئے تھے صرف کرتے پر آج ایک کالا واسکٹ تھا جس پر سوئی سے سفید ریشم کڑھا ہوا خوب صورت و ہین کام تھا۔ سر پر وہی کل والی چھوٹی سی ٹوپی تھی جس کا پھندنا ان کے زیب گوش تھا اور ہر بار مسکراہٹ کے ساتھ ان کے بے حد چیلے دانت چمک اٹھتے تھے۔

بدوؤں کی دعوت کا بہت احوال پڑھا اور سنا تھا مگر آج اس کا لطف اٹھانے کا خوش قسمتی سے موقع مل گیا۔ بہت سے بدوؤں کے خیموں اور شکستہ ٹین کی جھونپڑیوں

سے گزر کر موٹر ایک پکے مکان کے سامنے رکی۔ جیسے ہی موٹر سے اترے شیخ نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور میں اور میری لڑکیاں ان کے پیچھے پیچھے چلے۔ دروازے سے اتر کے ایک گلی سے گزرتے ہوئے ہم ایک چھوٹے صحن تک پہنچ گئے جس میں دو تین بکریاں بے تکلفانہ سیر کر رہی تھیں اور جس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ اتنے میں سامنے ایک کمرے سے ایک ادھیڑ عمر کی دبلی پتلی بی بی نکل کے ہماری طرف بڑھیں۔ شیخ رگب نے کچھ عربی میں ان سے کہا اور گویا مجھے اور میری دونوں لڑکیوں کو ان کے حوالے کر کے خود باہر چلے گئے میں نے بڑھ کے "السلام علیک" کہا مصافحہ کر کے ہم دونوں نے اپنے اپنے ہاتھ چوم لیے اور پھر ان کے ہمراہ ایک چھوٹے سے کمرے میں لائے گئے جس میں صرف ایک ہی داخلے کا دروازہ تھا اور کھڑکی وغیرہ کچھ نہ تھی۔ کمرہ معلوم ہوتا تھا کسی نے ابھی ابھی ٹھیک ٹھاک کر دیا ہے، کھونٹی پر جو کپڑے لٹک رہے تھے ان پر ایک رنگین چھپا ہوا کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ ایک بڑی میز دیوار سے لگی ہوئی بچھی تھی اور اس کے اوپر ایک صندوق رکھا تھا۔ اس پر بھی چھینٹ کا کپڑا پڑا ہوا تھا جس کے کناروں پر کروشیا کی چوڑی لیس لگی ہوئی تھی۔ دیوار پر ایک طرف مصری اور امریکن ایکٹریسوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ زمین پر تونس کا رنگ برنگا قالیچہ بچھا ہوا تھا۔ غرض کمرہ ایک نمونہ تھا قدیم مذاق کا جس میں کچھ جدید ہوا بھی کہیں سے گھس گئی تھی۔

یہ ادھیڑ عمر کی بی بی شیخ رگب علی کی اہلیہ تھیں۔ ان کا لباس بدوی تھا۔ ایک لمبا سا کرتا گھیرے پھول دار ریشم کا۔ اس پر مصنوعی ریشم کی رنگین دھاری دار چادر ایک عجیب انداز سے آدھی لپیٹ لی تھی اور آدھی سر پر اوڑھ لی تھی۔ سر پر کالا ریشم کا رومال بندھا تھا۔ گلے میں بڑے بڑے سونے کے سکوں کا ہار تھا۔ کانوں کی لو تکی میں پتلی سی سونے کی چاندبالی تھی مگر پورے کان کا حلقہ کیے ہوئے۔ دوسرے دو سونے کے بڑے بڑے جالے بھی زیب گوش تھے جو موٹے کالے تاگے سے باندھ کے سہارے کے لیے سر پر بالوں سے اٹکا دیے گئے تھے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کرتے کے کف پر چڑھا لیے تھے۔ مگر یہ کرتا زیب صرف گھٹنوں کے ذرا نیچے تک پہنچتا تھا۔ اس کے بعد پنڈلیاں بالکل کھلی تھیں۔ یہ لباس ذرا عجیب سا معلوم ہوتا تھا کہ از سر تا پا کر تو اس قدر پردہ پوشی کہ بال تک رومال میں احتیاط سے بندھے ہوئے تھے اور گھٹنے کے نیچے سے ستر پوشی بالکل غائب۔

بیگم رگب نے آگے جلدی جلدی دو تین کرسیاں منگوا کے کمرے میں دیوار کے پاس رکھوالیں اور زور سے میرا ہاتھ کھینچ کے بدوی عربی میں بولیں "گود، گود" (بیٹھ، بیٹھ) خیر ہم تینوں کرسی سے بیٹھ لگا کر اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی میوزیم ہیں تھے اور عام نمائش کے لیے بٹھا دی گئی تھیں۔ ہم بھی اس انداز سے کرسی پر جم گئے۔ گویا سراپا انتظار ہیں۔ حرم شیخ ہم کو اس طرح بٹھا کر جلدی جلدی جا کر صحن میں کہیں غائب ہو گئیں اب دروازے کے پاس ایک دوسری صورت نمودار ہوئی۔ بالکل ایسا ہی بدوی لباس تھا مگر جوان صورت، گورا رنگ، کالی کالی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ تھے۔ دروازے میں کھڑی ہم کو شرما شرما کے دیکھ رہی تھی کہ یکا یک حرم شیخ پھر نمودار ہو گئیں اور اس کو ہاتھ کے اشارے سے بولیں "تمشی تمشی" (جا، جا) اور کچھ ایسی زوردار آواز سے کڑک کر کہا کہ وہ نوجوان عورت چپکے سے چلی گئی مگر تھوڑی دیر بعد آ کے وہیں کھڑی ہو گئی اور عجیب عجیب آواز سے نا تمام الفاظ میں بڑبڑانے لگی جس سے پتہ چلا کہ یہ بات چیت کرنے سے معذور ہے مگر انسان میں گفتگو کرنے کا جذبہ اس قدر زبردست ہوتا ہے کہ رو کے نہیں رکتا۔ وہ ہر بار دروازے میں آ کے کھڑی ہو جاتی تھی اور کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی ہی جاتی تھی۔ گویا اپنی دانست میں دوسروں کی طرح وہ بھی ہم سے ہم کلام تھی۔ یہ شیخ صاحب کی بڑی صاحب زادی تھیں۔

حرم شیخ ہمارے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گئیں اور خاطر تواضع کے خیال سے پنکھا جھلنے لگیں۔ زبان نہ جاننے کی وجہ سے وہ بھی خاموش تھیں اور ہم بھی چپ۔ میں نے پنکھا ہاتھ سے لینے کی کوشش کی تو کڑک کر زور سے بولیں "لا، لا، کثیر حار" (نہیں، نہیں گرمی بہت ہے) اور مسکرانے میں ان کے بڑے بڑے آڑے ٹیڑھے پیلے پیلے دانت بے اختیار کھل گئے۔ بڑی بی زرا بھی چتون والی لگتی تھیں اور مشکل سے مسکراتی یا ہنستی تھیں۔ بات خوب اونچی آواز سے کرتیں اور کڑک تحکمانہ لہجے میں بولنے کی عادی معلوم ہوتی تھیں۔ چوں کہ عربی میں ہر ایک کو تو کہہ کر مخاطب کرتے ہیں چاہے بڑا ہو یا چھوٹا ہو اسی لیے حرم شیخ کا ہر فقرہ حکم نادری کا اثر رکھتا تھا اور سننے والے ان کے حکم پر لپک لپک کر دوڑ رہے تھے۔ بڑی بی اس کی عادی معلوم ہوتی تھیں کہ بلالحاظ سب کو سختی سے حکم دیتی جائیں۔

میں نے "تکلیف" کہہ کر پنکھا جب ان کے ہاتھ میں پکڑ لیا تو انھوں نے میرا ہاتھ

جھٹک کر پنکھا چھینتے ہوئے میرا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے ہٹا دیا اور بولیں "مالش، مالش" (کوئی ہرج نہیں، کوئی ہرج نہیں) اتنے میں ایک موٹی سی نوجوان لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ معلوم ہوا یہ بھی شیخ صاحب کی بیٹی ہے۔ اس لڑکی کی عمر شاید بیس یا چوبیس سال کی ہوگی اس کا کھلتا ہوا رنگ اور بڑی بڑی کالی آنکھیں دیکھ کر مجھے عربوں کے وہ قصائد یاد آگئے جن میں ہر معشوق کی آنکھ کو ہرن کی آنکھ سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ جن میں خوف و شرم و حیا ساتھ مل کر اسے دلکش بنا دیتے ہیں۔

یہ لڑکی چوں کہ شادی شدہ تھی اس لیے گلے اور کانوں کو طلائی زیورات سے خوب آراستہ کرکے آئی تھی اس کی گود میں ایک ننھی سی بچی تھی، وہ بھی ماں کی طرح سُرخ وسفید تھی اب ایک ایک کرکے بہت سی بیبیاں کمرے میں بھر گئیں۔ ہر ایک اس طرح چادر میں لپٹی ہوئی آئیں۔ کوئی کھڑی تھی تو کوئی زمین پر بیٹھی ہوئی۔ بعض اپنا چہرہ چادر سے چھپا چھپا کر ہم کو اس طرح دیکھ رہی تھی گویا چڑیا گھر سے کوئی نیا جانور لاکر ان کے سامنے رکھا گیا ہے۔ سب باری باری سے آپس میں کچھ بولتی جا رہی تھیں۔ ان کی عربی ذرا عجیب تھی۔ وہ الفاظ ایک دوسرے سے ملا ملا کر ذرا گولائی سے بولتی تھیں اور اس قدر "مش"، مجھے سنائی دیتا تھا کہ میری فہم کے خزانے میں جو چند عربی کے لفظ محفوظ تھے وہ سب ایک ہیجانی چکر میں گھوم رہے تھے۔ ایک بدو بی بی جن میں برخلاف دوسروں کے غیر معمولی انکساری اور نرمی تھی اور بات بھی آہستگی سے رک رک کر کرتی تھیں میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی بار بار اپنی چادر کو درست کرتی جاتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ حرم شیخ کی بہن ہیں۔ ان کا گفتگو کا انداز بہت رسیلا تھا، اس لیے وہ ہر بات سمجھا کر اور ہر لفظ الگ الگ ادا کرکے مجھے بچوں کی عربی میں سمجھا رہی تھیں۔ دونوں بہنوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک کڑک سختی سے حکم چلانے کی عادی تھیں تو دوسری خاکساری سے نرم و نازک لہجے میں اظہارِ خیال کرنے کی۔ وہ حاضرین میں سے ہر ایک کی رشتہ داری مجھے سمجھاتی جا رہی تھیں کہ فلاں ضعیفہ شیخ کی پھوپی ہیں اور فلاں خالہ کی بیٹی ہیں۔

اسی طرح انھوں نے مجھے سمجھایا کہ آج آس پاس کے مکانوں سے چھوٹے بڑے جوان بوڑھے سب سمٹ سمٹا کر یہاں جمع ہوگئے ہیں۔ اس نئے جانور کا تماشہ دیکھنے کے لیے! ——— یہاں تک کہ شیخ صاحب کی ضعیف پھوپی بھی جن کے

منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت اور جو چلتے چلتے ہانپ جاتی تھیں اور جن کے ہاتھوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ اپنے سر کی پھسلی ہوئی چادر کو بار بار سر پر ڈالتیں وہ بھی اپنے مکان سے یہاں تک چل کے آئی تھیں۔ عموماً یہ بیبیاں نک سک سے درست تھیں اور شکل صورت اچھی پائی تھی۔ اکثروں کے کھلتے ہوئے رنگ اور سیاہ بڑی بڑی آنکھیں تھیں مگر تعلیم سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے ان میں شائستگی نہ تھی۔ ان کی گفتگو کی دنیا بہت محدود تھی۔ ان کی زندگی کے تجربے صرف مکان کی چار دیواری اور اپنے کنبے کی مشکلیں تھیں۔ اس لیے ہمارا گفتگو کا دائرہ بہت ہی محدود ہو کے رہ گیا تھا۔

شیخ کی بہن کے توسط سے میں نے اس نوجوان لڑکی سے پوچھا کہ وہ لوگ کب سے مرسیٰ مطروح میں بسے ہوئے ہیں؟ جواب ملا "ایک زمانے سے"۔ میں نے سوال کیا "یہاں کیسی گزرتی ہے؟"

تو وہ سب مسکرانے لگیں مگر ان کی آنکھوں میں صبر کی وہ تصویر آگئی جو اپنی اخیر حد پر پہنچ کر یاس و بے بسی کا اظہار کرنے لگتی ہے۔ میں نے محض گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے پوچھا "یہاں کا سمندر تو آپ نے دیکھا ہوگا؟" جس پر شیخ کی بہن نے کہا "نہیں میری عمر اتنی ہوگئی ہے مگر میں نے یا حرم شیخ نے یا کسی لڑکی نے آج تک ساحل سمندر نہیں دیکھا" قریب تھا کہ تعجب کی چیخ میرے منھ سے نکل جاتی مگر ان کے حسرت آلود صبر و شکر کو دیکھ کے میرا منھ بند ہوگیا اور میری آنکھیں جھک گئیں۔

یکایک سب سے آخر میں ایک نوعمر لڑکی کمرے کے دروازے میں شرماتی لجاتی اپنی چادر سے سر کو ڈھانپتی ہوئی آکر کھڑی ہوگئی۔ اس کا لانبا کتابی چہرہ، کھڑا نقشہ، کالی بادامی آنکھیں کاجل سے بھری ہوئی تھیں جو اس کے چمپئی رنگ پر بے حد دل کش معلوم ہو رہی تھی اور پتلے ہونٹ پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پیچھے دو کالی چوٹیاں پڑی ہوئی تھیں جن میں سے ایک الھڑپن سے سامنے آگئی تھی۔ اور سامنے رومال میں بندھے ہوئے بال پٹیوں سے لچھے بن کر باہر نکل آئے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے لیلیٰ نجد کا خیال آگیا کہ وہ ایسی ہی کوئی صورت ہوگی جس کے لیے مجنوں آپے سے باہر ہوگیا تھا اور صحرا کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ اس حسینہ کے گلے میں تین طلائی سکوں کے ہار تھے۔ کانوں

میں ایک کے بجائے دو دو بڑے بڑے بالے تھے اور آنکھوں میں ذرا بھولا پن اور شرم کا ایسا حسین امتزاج تھا جس کو دیکھ کر انسان کو بے اختیار اس پر پیار آ جائے۔ وہ کمرے کے دروازے سے بار بار جھانک کر لوٹ جاتی تھی۔ شاید کسی کام میں مصروف تھی۔ اس لیے اندر آنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ لانبی چھریرے بدن والی کم سن اور شرمیلی لڑکی تھی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ شیخ صاحب کے اکلوتے بیٹے کی دلھن اور حرم شیخ کی بہن کی صاحب زادی ہے اس کا نام ارجن تھا جسے سن کر مجھے بے اختیار مہابھارت یاد آ گئی۔ اس لڑکی کو بار بار جھانکتے ہوئے دیکھ کر مجھے خیال آیا نہ معلوم اس کا مجنوں کیسا ہوگا ـــــ یہ کمرہ جس میں ہم بیٹھے تھے۔ شیخ صاحب کے لڑکے کا ہی بیڈ روم تھا۔

خواتین کو ذرا غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ ان سب کے ہاتھ ٹھوڑی اور پیشانی پر گودا ہوا ہے۔ استفسار کرنے پر پتہ چلا کہ سب مغربی عورتوں کے ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر مجھے اس کی اصل وجہ نہ معلوم ہو سکی نہ وہ بتا سکیں اور نہ میں نے تجسس کرنا مناسب سمجھا۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہوا کہ یہ صرف عورتوں کے ہاتھوں اور چہروں پر ہوتا ہے۔ مرد ایسی سجاوٹ سے احتراز کرتے ہیں۔

اب بہت سی بیبیاں میرے ارد گرد جمع ہو چکی تھیں اور باری باری سے کچھ نہ کچھ بولتی جاری تھیں۔ کوئی پنکھا جھل رہی تھی تو کوئی زمین پر بیٹھی تھی اور سب تجسسانہ نظروں سے ہمارا جائزہ لے رہی تھیں۔ شیخ رگب کی پھوپی ضعیف ہونے کی وجہ سے میرے سامنے کرسی پر جلوہ افروز تھیں۔ انھوں نے سر پر خوب لپیٹ کر چادر اوڑھ رکھی تھی۔ جیسے کوئی سردی کے ڈر سے اپنے آپ کو لپیٹ لے اور اپنے پوپلے منہ سے بات کرنے میں کوشاں تھیں۔ بڑی بی نے بتایا کہ وہ لوگ سب مغربی بدوینی تونس کے رہنے والے ہیں اور ایام جنگ میں طرابلس سے ہجرت کر کے یہاں آکر بس گئے ہیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا "کم اولادک؟" (کتنی اولاد ہے تیرے؟) میں نے جواب دیا "فقط ثلث بنت" (صرف تین لڑکیاں) تو حرم شیخ نے منہ بنا کر پوچھا "ولد مفیش؟" (کوئی لڑکا نہیں؟) جب میں نے کہا "لا" (نہیں) تو انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چہرہ آسمان کی طرف اٹھا دیا اور سب اس طرح خاموش ہو گئیں جیسے کوئی غم ناک سانحہ سن کے انسان خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر کسی نے کہا "اب ہوگا" کسی نے

کہا "ہائے افسوس" کسی نے کہا "خدا کی مرضی"۔۔۔۔۔

اب تو ان کی بے جا ہمدردی اور بے محل افسوس پر مجھے بھی جوش آگیا اور میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی کے چار لفظوں کو جمع کر کے جوشیلے انداز میں کہا "رسول اکرم صلعم کے بھی ایک ہی صاحب زادی تھیں!"

رسول اکرم کا نام سنتے ہی سب کے سب اپنے سر کی چادر درست کر کے درود و صلوٰۃ پڑھنے لگیں اور اپنی انگلیوں کو چوم کر آنکھوں سے لگانے لگیں اور اپنے اس مذہبی عقیدے میں اس روح فرسا موضوع کو بھول گئیں جس کے خیال سے ان کو مجھ پر رحم آرہا تھا۔ اس طرح مجھے چھٹکارا نصیب ہوا اور گفتگو کا رُخ پلٹ گیا۔

اب ایک میز میرے سامنے لاکر رکھ دی گئی جس پر ایک بڑے تھال کے بیچ میں شوربے کا ایک پیالہ رکھا ہوا تھا اور آس پاس تشتریوں میں گوشت کی تلی ہوئی بوٹیاں اور کچھ پکی ہوئی ترکاریاں رکھی تھیں۔ اس میز کے سامنے آتے ہی حرم شیخ نے ہاتھ کے اشارے سے زور سے کہا "کل کل یا بنت" (کھا، کھا اے لڑکی) جس پر میری لڑکی ان کا منھ تکنے لگی۔ میں نے ان سے اشارے میں درخواست کی آپ سب بھی تناول طعام میں ہمارے شریک ہوں، تو حرم شیخ نے ایک چمچہ اٹھایا اور شوربے سے بھر کر اپنے منہ میں ڈال کر کہا "کل" گویا اب تیری باری ہے۔ اس کے بعد اسی چمچے سے میں نے بھی آہستہ آہستہ سوپ پینا شروع کر دیا۔ یہ مرغ کا بے حد لذیذ سوپ تھا۔ جس میں لیموڈال کر خوب ترشی دی گئی تھی۔ مگر اس میں گوشت کے باریک باریک ٹکڑے ملے ہوئے تھے۔ لہٰذا اس کو پینے کے ساتھ کھانا بھی پڑتا تھا۔

اس کے بعد بہت سی مہین چپاتیوں کا موٹا سا بنڈل ہمارے سامنے لاکے رکھ دیا گیا۔ معلوم ہوا یہ مغربی قسم کی روٹیاں ہیں۔ ہاتھ سے پکائی جاتی ہیں۔ جن کو دیکھ کر بے اختیار لکھنؤ کی چپاتیوں کا خیال آجاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ صرف میدے کی تھیں اس لیے سفید، بے حد مہین اور چمڑے کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ اب ہر پیالا اور ہر ڈش کو دکھا دکھا کے ہر ایک بی بی بڑے اصرار سے "کل کل" کہہ رہی تھیں۔ مگر حاضرین میں سے کوئی ہمارے ساتھ شریک ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ سب کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے ہمارے محاورے میں گویا "نوالے گن رہے تھے"

اور میری بچیاں اس طرح کھا رہی تھیں گویا بغیر اس کے چھٹکارا مشکل ہے۔

البتہ ہر چیز میں حرم شیخ ایک ایک نوالہ پہلے چکھ لیتیں تب ہم کو "کل" کہتیں۔ اگر

کے بعد یکایک ایک گرما گرم مرغِ مسلم روسٹ کیا ہوا اور بالکل بے مسالے کا ہمارے سامنے لاکے رکھ دیا گیا اور پھر دہی 'کُل' کی گردان شروع ہو گئی۔ ہمارا تکلف دیکھ کے حرم شیخ نے جھٹ ایک چھری اٹھائی اور اس مرغ کے دو ٹکڑے کر ڈالے، پھر ہاتھ سے اس کے ٹکڑے کر کے پہلے مرغ کی ایک ٹانگ اپنے منہ میں رکھ لی اور نوالہ بھرے ہوئے منہ سے کہا 'کُل'۔

یہ قدیم عرب طریقہ ہے کہ میزبان ہر چیز پہلے خود چکھ لیتا ہے۔ تب مہمان کو پیش کرتا ہے۔ اس رواج کا مطلب یہ ہے کہ میزبان پر ظاہر ہو جائے کہ اس کھانے میں زہر نہیں ملایا گیا!!

اب یہ خاطر داری بار خاطر ہو رہی تھی۔ کیوں کہ پھوپی، خالہ، بیٹی، بہو سب ہی ہمارے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور ہر طرف سے 'کُل' کے نعرے مسلسل لگ رہے تھے۔ پھر ہماری خوراک تو اللہ کا فضل ہی تھی سُمیّہ بھی انکار کر رہی تھی اور نازلی بھی۔ اور یہ لوگ برابر اصرار اور زبردستی کیے جا رہے تھے۔ اس مہمان داری کو دیکھ کر بمبئی کے بعض طبقوں کی خاطر داری یاد آنے لگی کہ جب تک آپ اپنی پلیٹ کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ نہ لیں کھانا برابر آپ کی پلیٹوں میں ڈالا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب نمکین برتن سامنے سے اُٹھے تو میٹھا لایا گیا۔ یہ سویوں اور حلوؤں پر مشتمل تھا اور کئی اقسام کا تھا۔ بہت اصرار اور معذرت کے بعد وہ سامنے سے ہٹایا گیا تو میوہ لا کر رکھا گیا۔ خدا خدا کرے کھانوں سے نجات ملی تو پینے کا دور شروع ہوا۔ چائے بڑے اہتمام سے بننا شروع ہوئی اور یہ دور پوری باقاعدگی سے ایک رسم کی طرح ادا ہوا۔

حرم شیخ زمین پر مینڈھے کا چمڑا بچھا آسن جما کر بیٹھ گئیں۔ اب ان کے حکم پر دوڑ دوڑ کر ان کی بہو ارجن ایک ایک چیز ان کے سامنے رکھتی گئی۔ ایک چھوٹا سا اسٹوو (چولھا) اور چھ چھوٹی بڑی چائے دانیاں لے کر آئی اور چائے بننے لگی۔ چائے کیا بن رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی دوا ساز مختلف مرکبات ملا کر جوشاندہ تیار کر رہا ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا، ان گنت اشیا کے ساتھ جب پانی کھولنے لگا تو چھ چائے دانیوں میں مٹھی سے چائے ڈال ڈال کر اس پر کھولتا ہوا پانی ڈال دیا گیا۔ پھر باری باری سے ہر ایک چائے دانی اسٹوو پر چڑھائی اور اتاری گئی۔ پہلی اتاری تو دوسری رکھ دی اور دوسری اتاری تو تیسری رکھ دی۔ حرم شیخ نے اس کے بعد پُر زور آواز میں شکر طلب

کی تو بھورے ڈرسینی میں ایک بڑا سا گڑا مصری کے مانند لے آئی۔ اس کو حرم شیخ نے ہتھوڑی سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چائے دانی میں ڈالنا شروع کیا اور ساتھ ہی چائے دانیوں کو دوبارہ اور سہ بارہ چولھے پر رکھتی گئیں۔ قریب ہی ایک تختے پر ایک گول تھال میں موٹے شیشے کے چھوٹے چھوٹے فنجان رکھے ہوئے تھے۔ جن میں حرم شیخ نے ہاتھ اونچا اٹھا کر فاصلے سے چائے انڈیلنا شروع کر دی۔ انڈیل چکیں تو گلاس اٹھا کے دیکھا، پھر اس کو منھ لگا کے چکھا اور حسب ذائقہ نہ پا کے چائے واپس اسی چائے دانی میں انڈیل دی جس میں سے چائے لی تھی اور چائے دانی پھر چولھے پر چڑھا دی گئی۔ دو تین دفعہ ایسے امتحان کے بعد جب چائے حسب خواہش تیار ہو گئی تو چائے دانی کو بہت اونچا اٹھا کر فنجان میں چائے انڈیلنا شروع کی جو گلاس میں آتے ہی ایک جھین دار جوشاندہ سی بن گئی۔ اب چائے تیار ہو چکی تھی ہر ایک کیتلی کئی بار زیب اسٹو ہو کے اتر چکی تھی اور ہر کیتلی میں کئی دفعہ چکھ چکھ کے چائے واپس ڈالی گئی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے یہ جوشاندہ تیار ہوا اور بڑے شوق سے ہمیں پیش کیا گیا۔ جیسے ہی میں نے منھ سے لگایا معلوم ہوا کوئی کڑوی دوا یا کونین پی رہی ہوں جس میں شکر ملانے کے باوجود کڑواہٹ شیرینی پر غالب تھی۔ چائے میں نہ دودھ تھا نہ خوشبو۔ خیر جوں توں کر کے اس کو حلق کے نیچے اتار ہی لیا تاکہ اصرار سے جان چھوٹے۔ مگر دوسری خواتین نے بڑے لطف سے اور مزے لے لے کر پیا اور دو دو پیالیاں پیں اور بہت دیر تک یہ دور چلتا رہا۔

اب میں بھی کرسی سے اتر کر دوسری بی بیوں کے پاس اس خوب صورت طرابلس کے بنے ہوئے سرخ اونی غالیچے پر بیٹھ چکی تھی جس پر کئی رنگ کی سرخ و سفید چوکڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ آپس میں ذرا بے تکلفی سے بات چیت ہونے لگی۔ تمام حاضرین مجھے یا میری پوشاک کو غور سے دیکھ کر تھک چکی تھیں۔ ان کی متجسسانہ نظریں اب دوسرے راز کو جاننا چاہتی تھیں۔ اس لیے میری ساری کو کئی بار پوچھنے کے بعد مجھ پر سوالوں کی بوچھار ہونے لگی کہ یہ کس طرح پہنی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی کتنی ہے؟ کیا تمھارے دیس میں بنتی ہے اور کیا وہاں ہر ایک کا یہی پہناوا ہے؟ پھر ضعیفہ پھوپی کا ہاتھ آہستہ آہستہ میرے شانے تک پہنچ گیا اور میرے پھسلتے ہوئے پلو کو انھوں نے مٹھی میں پکڑ لیا اور مسکرا اٹھے

میری ریشمی ساڑھی کھینچ کر کھول ڈالی۔ میرے تعجب کو دیکھ کر وہ سب کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز چمک آگئی۔ ان کے چہرے پر وہ خوشی دوڑ گئی جو کسی کا راز کھولتے وقت انسانی چہروں پر آجاتی ہے۔ حرمِ شیخ کی بہن نے ساری کے دو کونے اٹھالیے اور بالکل بدوضع سے آدمی مجھے اڑھادی اور آدھی لپیٹ کر دونوں کونوں کو لے کر میرے شانے پر گرہ باندھ دی۔ جب میں نے کہا "اب میں بھی "بدو" ہوں" تو سبھوں نے ہنس کے اور تالیاں بجا بجا کے خوشی کا اظہار کیا۔ مجھے بدو عورت بنا کے سارے خوشی سے پھول گئیں اور ہنسنے لگیں اور ایک دوسرے سے کچھ عربی میں کہنے لگیں۔ پھر میرا زیور چھو چھو کے دیکھا ہر ایک شہ کو ہاتھ لگا کر پوچھتیں "کیا یہ ہندی ہے؟ کیا یہ سونا ہے؟" اس قسم کے سیکڑوں سوالات کرڈالے۔ میں نے غور کیا تو سب بی بیاں ایک ساتھ چیخ رہی تھیں۔ مگر شیخ رگب کی بہوار حن خاموش دور بیٹھی ہوئی یہ دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ ان سب میں دل کش، نازک اور قبول صورت تھی۔ اس کی پیشانی پر جمے ہوئے بالوں کی پٹیوں سے زلفیں باہر آکر اس طرح چھلا ہو گئی تھیں۔ گویا کالی ناگنیں اس کی جبینِ روشن پر کنڈلی مارے بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور اس کے چہرے کو زیادہ بھولا بنا رہی ہیں وہ بے حد کم سخن تھی۔ معلوم نہیں ساس کی کرخت اور آواز نے اس کی قوتِ گویائی کو ماند کر دیا تھا یا وہ قدرتاً کم گو واقع ہوئی تھی۔ مگر اس کے بے لاگ طریقے اور بھولے انداز نے بے اختیار مجھے بار بار اس کی طرف راغب کر دیا تاہم وہ خاموشی سے میٹھی مسکراتی ہی رہی۔

غنیمت ہوا کہ ساری مرشد آبادی ریشم کی تھی کہ گرہ پڑنے کے بعد بھی اس میں شکن نہ آئی اور پہننے کے قابل رہی۔ اب میں نے اپنی کھلی ہوئی ساری کو خواتین کے پُر اصرار ارشاد کی تکمیل و خوشنودی کی خاطر انھیں کے سامنے پہننا شروع کیا۔ وہ میرے ہر انداز کو ایسی نظروں سے تاک رہی تھیں گویا ساری پہننے کا سبق سیکھ رہی ہیں۔ یہ ان کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ انھوں نے ایک ہندوستانی ساری پہننے کے طریقہ کا مشاہدہ کیا تھا۔ سب خاموشی سے بغور دیکھ رہی تھیں کہ میں نے اپنے ہاتھ پر چنٹ بھلے لی اور ساری کو کس طرح لپیٹا۔ اور پلو کو کیسے درست کیا۔ اور جب میں نے باقاعدہ ساری پلیٹ کر اپنے سر پر پلو ڈالا تو شیخ رگب کی بہن نے ...

جوش سے عربی میں کہا "رسول اللہ صلعم کا سلام پہنچے تمہارے ملک پر جہاں کا پہناوا اتنا خوبصورت ہے۔" ان کے اس جوشیلے اور بے ساختہ پن کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔

اب یہاں آئے دیر ہو چکی تھی اور اس امتحان گراں بارسے میں تھک بھی چکی تھی۔ مگر ہر بار جب جانے کا ارادہ کرتی تو حرم شیخ مجھے کھینچ کر بٹھا دیتی تھیں۔ آخرکار مردانے سے حکم نادری نافذ ہوا اور ہم ان سب سے رخصت ہوئے۔ حرم شیخ نے قدیم مشرقی دستور کے مطابق ہم کو بہت سی دعائیں دیں۔ جو کچھ اس قسم کی تھیں جیسی حیدرآباد کی خالائیں اور پھوپیاں آج سے پچیس سال بیشتر بھانجیوں بھتیجیوں کو دیا کرتی تھیں کہ سلامت رہو، اور اولاد جیتی رہے، خدا کی حفاظت میں رہو وغیرہ ہر ایک نے مصافحہ کرکے اپنا اپنا ہاتھ چوم لیا۔ دروازے تک سب ہمیں رخصت کرنے آئیں۔ بچوں کی مٹھیوں میں بادام اور اخروٹ بھر کر انھوں نے ہم کو الوداع کہا۔

(اقتباس "عروس نیل" صـ ۱۱۳ تا صـ ۱۳۰ طبع ثانی دسمبر ۶۶ء)

شرابِ کہنہ

آزردہ

ـه ۱۷۸۹ء ـــــــ ۱۸۶۸ء

نام، صدرالدین، تخلص آزردہ، ابن مولوی لطف اللہ کشمیری، عربی ادب اور دینیات کی تعلیم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح اور ان کے بھائیوں سے حاصل کی، علوم حکمیہ اور منطق وغیرہ میں مولوی فضل امام (مولانا فضل حق خیرآبادی کے پدر بزرگوار) کے شاگرد تھے، علوم وفنون کے اکتساب ومہارت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ کوئی ادبی نکتہ ہو یا مذہبی مسئلہ، فقہ ہو یا شعر وسخن کا معاملہ مفتی صاحب کی رائے اور ان کا فیصلہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا تھا۔

ابتدا میں چند غزلیں شاہ نصیر کو دکھائیں، پھر مجرم اکبرآبادی سے مشورہ کرنے لگے اور آخر میں میر ممنون کے شاگرد ہوئے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے "صدر الصدور" کے عہدے پر مامور تھے اس زمانے میں کسی ہندوستانی کے لیے یہ ایک غیر معمولی اعزاز اور اعلیٰ ترین منصب تھا۔ ایک طرف اپنے علم وفضل اور فہم ودانش کی بنا پر ہر علمی مجلس اور ادبی محفل کے مربی ورکن رکین تصور کیے جاتے تھے تو دوسری طرف اپنے رسوخ اور دریادلی کی بدولت ہر ضرورت مند کے معین ومددگار نظر آتے تھے۔ سبابِ امارت مہیا ہونے کے باوجود خود نہایت محتاط اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے

شاہ جہاں کے زمانے کا ایک مدرسہ جو امتدادِ زمانہ سے ختم ہو چکا تھا اس کو اپنے صرفِ خاص سے نئی زندگی بخشی۔ درس وتدریس کی سہولتیں بہم پہنچانے میں اپنا قیمتی وقت بھی صرف کرتے تھے۔ کچھ شاگرد ایسے بھی نکلے جو اپنی سخن پروری، علمیت اور ناموری میں ممتاز ہیں مثلاً نواب یوسف علی خاں والیٔ ریاست رام، نواب صدیق حسن خاں، آزاد ، سرسید احمد خاں۔

ـه سنہ ہجری کے مطابق ۱۲۰۴ ـــــ ۱۲۸۵

ذوق، غالب، مومن، صہبائی اور شیفتہ سے تمام عمر مفتی صاحب کے بے حد قریبی مراسم رہے یہ لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور خود مفتی صاحب ان کے سچے قدرداں تھے۔ غالب کے ساتھ مفتی صاحب کے احسانات تو مشہور ہیں۔ غدر کے بعد بہت سے بے گناہ اور عزت مآب بزرگوں کی طرح مفتی صاحب کو بھی ناخوش گوار حالات بلکہ مصائب تک کا سامنا کرنا پڑا۔

شعر و شاعری کا مسلسل شغل رکھنے کے باوجود انھوں نے کبھی نہ اپنا دیوان ترتیب دیا اور نہ آج ان کا کوئی باضابطہ مجموعہ کلام ملتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ عربی فارسی کے آدمی تھے۔ مگر اردو کا کلام ان زبانوں کے الفاظ اور ترکیبوں سے کہیں بھی گراں بار نہیں ہونے دیا۔ وہی صفائی اور سادگی وہی روانی اور روزمرہ جو اس دور کے بلند فکر ریختہ گو شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں بھی دیکھ لیجیے۔

انتخاب

ہوتے ہیں وہ ناقابلوں میں شمار اب — جنھیں مانتے تھے زمانے کے قابل
کروں چاک سینہ تو سو بار لیکن — نہیں داغِ دل یہ دکھانے کے قابل

یارب یہ کس نے چہرے سے الٹا نقاب ہے — سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں
میں اور ذوقِ بادہ کشی، لے گئیں مجھے — یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں
یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم — حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہدِ شباب میں

تیری آنکھوں کے دور میں کیا کیا — سحر رسوا نہیں خراب نہیں
مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے — اس کو آرام، اس کو خواب نہیں

نالوں سے میرے کب تہ و بالا زمیں نہیں — کب آسماں زمین ہو، زمیں آسماں نہیں
افسردہ دل نہ ہو، درِ رحمت نہیں ہے بند — کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اُسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر کہیں پرسشِ دادخواہاں نہیں

دامن اس کا تو بھلا دُور ہے اے دستِ جنوں کیوں ہے بے کار، گریباں تو مرا دُور نہیں

کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

گو اسیری میں ہوں پر مثلِ اسیرِ تصویر نہ غمِ قید، نہ پروائے رہائی مجھ کو

اُس شوخ سے مربوط بہت سہل سمجھتے گر ہم بھی سُبک حرکت و نااہل سمجھتے

مکھڑا یہ غضب، زلفِ سیاہ فام یہ کافر کیا خاک جیئے کوئی، شب ایسی، سحر ایسی
نقشے تو بہت صانعِ قدرت نے بنائے پر بن نہ سکا پھر دہن ایسا، کمر ایسی
بالیں پہ کھڑا روتا ہے، راتوں کو مسیحا کچھ آن بنی ہے ترے بیمار پر ایسی

مرثیۂ دہلی :-

جن کو دنیا میں کسی سے کبھی سروکار نہ تھا اہل نااہل سے خلطہ جنھیں زنہار نہ تھا
ان کی خلوت سے کوئی واقفِ اسرار نہ تھا آدمی کیا ہے، فرشتے کا بھی واں بار نہ تھا
وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں دَر دَر
خاک بھی ان کو نہیں ملتی کہ ڈالیں سر پر

زیور الماس کا سب، جن سے نہ پہنا جاتا بھاری جھومر کبھی کبھی، سر پہ نہ رکھا جاتا
گاج کا جن سے دوپٹہ، نہ سنبھالا جاتا لاکھ حکمت سے اٹھاتے، نہ اٹھایا جاتا
سر پہ وہ بوجھ لئے، چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو گر پڑتے ہیں

لب جو کھنے سے پھولوں کے اذیت پاتی مہندی ہاتھوں میں لگا سوتی تو گھبراتی
شام سے صبح تلک نیند نہ جن کو آتی ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی
ان کو تکیے کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اٹھاتا تو سرا [illegible]

نئی مطبوعات

نام کتاب	مصنف، مرتب	اشاعت	صفحات	قیمت
باغ و بہار	مرتبہ رشید حسن خاں	دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۲۸۴	۲/-
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	" " " "	۸۸	۱/۵
من سمجھاون	مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی	بمبئی، اردو مرکز	۹۶	۲/۲۵
باقیات شبلی	" مشتاق حسین	دہلی، آزاد کتاب گھر	۲۲۴	۳/۷۵
دیدہ و دریافت	نثار احمد فاروقی	" " " "	۲۵۴	۳/۷۵
تذکرہ غوثیہ	مرتبہ: قاضی معزالدین احمد	" " " "	۳۹۲	۷/۵۰
تفسیر مظہری اردو چہارم	قاضی ثناء اللہ پانی پتی	دہلی ندوۃ المصنفین	۵۶۸	۱۴/-
عرب و ہند عہد رسالت میں	قاضی اطہر مبارک پوری	" " "	۲۰۰	۵/-
حضرت عثمان کے سرکاری خطوط	ڈاکٹر فاروقی	" " "	۲۰۰	۵/-
ذکر سعید (سوانح)	محمد حسین خاں زبیری	کراچی، مشتاق بک ڈپو		۲/-
دامن شب (مجموعہ کلام)	اقتدار احمد اکبر حیدرآبادی	" " "		۱/۲۵
حالی کی اردو نثر نگاری	ڈاکٹر عبدالقیوم	" " "		۱۵/-
دیدۂ بیدار (مجموعہ کلام)	قابل اجمیری	" " "		۳/-
آبلہ پا (ناول)	رضیہ فصیح احمد	" " "		۸/-

زیر طبع

۱۸۵۷ء کے اخبارات	محمد عتیق صدیقی	دہلی، مکتبہ شاہراہ	۵/-
دست تہ سنگ	فیض احمد فیض	" ناز پبلشنگ ہاؤس	۲/۵۰
[illegible]	مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی	بمبئی، اردو مرکز	
کوکن کے لوک گیت	" میمونہ عبدالستار دلوی	" " "	
جستجو (مجموعہ کلام)	سید مجاہد حسین حسینی	" " "	

پیام تعلیم حالی نمبر قدردانوں کی نظر میں

شکر ہے کہ حالی نمبر کو ہمارے بہت سے قدردانوں نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ دفتر میں اس طرح کے خط برابر آ رہے ہیں۔ اس وقت ہم گنجائش کی کمی کے سبب چند خطوں کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

ہمارے محترم بزرگ جناب اکبرالدین صاحب صدیقی تحریر فرماتے ہیں:-

"...... کل پیام تعلیم کا حالی نمبر ملا اس مختصر سی مدت میں آپ نے جس سلیقے کا اظہار فرمایا اس کے لیے بے اختیار داد نکل گئی..... بچوں کی زبان میں لکھنا۔ اور انھی کے لیے بہت مشکل ہے۔ حالی کو آپ نے بچوں میں روشناس کرا کے نہ صرف حالی کی بلکہ اردو ادب کی خدمت کی۔ بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ کا مضمون، حالی پر ان کی کتابوں کے باوجود اچھوتا ہے اور کیوں نہ ہو تا وہ کس گھرانے کی فرد ہیں......"

پیام تعلیم کے بہت پرانے مضمون نگار جناب اظہر افسر صاحب (آل انڈیا حیدرآباد) تحریر فرماتے ہیں:-

.... کل صبح دفتر پہنچا تو پہلی ڈاک سے پیام تعلیم کا حالی نمبر ملا۔ کیا خوب صورت اور پیارا نمبر نکالا ہے آپ نے کہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

شاید ۲۰ر فروری تک آپ کو مضمون ملتے رہے ہیں۔ حیرت ہے اتنے تھوڑے دنوں میں آپ نے اس قدر شان دار نمبر کیسے تیار کر لیا اور پھر سبھی عمدہ لکھنے والوں کو آپ نے جمع کیا ہے۔ نظموں میں جناب شفیع الدین نیر کی نظم "یاد حالی"، "فرد عمل" اور "حالی کی یاد" بہت اچھی ہیں۔ وزیر حسن صاحب، ڈاکٹر شجاعت علی، لطیف اعظمی، اکبرالدین صدیقی اور خلیق انجم کے مضامین خوب ہیں۔ اور سب سے بڑھ چڑھ کر ہے محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ کا مضمون..... "کیا زبان ہے کیا بیان ہے"۔ جگہ جگہ حالی کی نظموں کا انتخاب بھی لاجواب ہے۔ بچوں کی کوششیں بھی خوب ہیں۔ واقعی اگر یہی توجہ اور محنت آپ کی پرچے کے ساتھ رہی تو وہ دن دور نہیں جب ہند و پاک کا کوئی پرچہ پیارے پیام تعلیم کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔"

باقی صفحہ ۲۹ پر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی ۲ دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

نغمۂ سرمد

(سرمد کی رباعیوں کا ترجمہ اردو رباعیوں میں)

(سن طباعت ۱۹۶۴ء)

مترجم: عرش ملسیانی

صفحات: ۱۹۴ سائز: ۱۷×۲۷/۸

قیمت: -/۵

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

کسی زمانے میں فارسی اس ملک میں اتنی ہی عام تھی جتنی آج انگریزی ہے اور اب یہ حال ہے کہ اسے کوئی نہیں پڑھتا اور تیل سب بیچ رہے ہیں حالاں کہ مثل ابھی تک جوں کی توں ہے۔

فارسی کے کلاسیکی ادب کی عظمت اور قوت مسلم ہے۔ اس میں تمام اصناف سخن میں اتنا سرمایہ ہے کہ اس سے ہر طرح کے ذوق کی تسکین ہو سکتی ہے۔ لیکن اب ہماری روش یہ ہو گئی ہے کہ اگر ہم کسی کی خوبی کا اعتراف بھی کرتے ہیں تو یہ تحقیقی نہیں بلکہ تقلیدی بات ہوتی ہے۔ یعنی اس لیے نہیں کہ ہم نے اپنے طور پر مطالعہ کیا اور اسے تعریف کے قابل پایا ہو بلکہ اس لیے کہ فلاں ایسا کہہ رہا ہے۔ پورب کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی زیادہ توجہ خیام ہی پر کی اور دوسرے رباعی گو شعرا کو نظر انداز کر دیا حالانکہ سحابی نجفی اور سرمد کاشی کا پایہ کچھ کم بلند نہیں۔ خصوصاً سرمد کی رباعیاں اپنی گہرائی اور گیرائی میں قدر اول کی چیز ہیں اور انھیں بلا تکلف خیام کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ہمیں جناب عرش ملسیانی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے ان رباعیات کا ترجمہ کر کے ہمارے لیے ان سے لطف اندوز ہونے کا سامان مہیا کر دیا۔

ایک زبان سے دوسری میں ترجمہ کرنا کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ کچھ انھیں ہوگا جنھوں نے کبھی اسے کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے صرف دونوں زبانوں پر قدرت ہی کافی نہیں بلکہ ان کے مزاج لفظوں کی ساخت ان کے محل استعمال

اور دروبست پر بھی ماہرانہ نظر درکار ہے۔ اگر نثر میں یہ عالم ہے تو خیال کیجیے کہ نظم کا ترجمہ اور بھی نظم میں کتنا دشوار ہوگا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ عرشؔ نے اس ہفت خواں کو بھی اپنی مہارت اور چابک دستی سے سر کر لیا ہے۔ (مالک رام)

مرتبہ/مولفہ: سید سرفراز حسین رضوی خبیرؔ لکھنوی

رزم نامہ دبیرؔ

صفحات: سائز: $\frac{20 \times 30}{16}$

قیمت: ۵۰/۴

ناشر: نسیم بک ڈپو، لکھنؤ

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے رزم نامہ انیس، مرتب کی تھی۔ جس میں مراثی انیس کے بہترین اقتباسات کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ ترتیب دیا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ خبیرؔ لکھنوی نے بھی اسی انداز سے اردو کے دوسرے عظیم مرثیہ گو مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کا بھی انتخاب کیا ہے، جس میں ان کی رزمیہ اور بیانیہ شاعری کا رس آگیا ہے۔ خبیرؔ صاحب نے اسی کے ساتھ ہی مرزا دبیرؔ کی مختصر سوانح حیات بھی قلم بند کر دی ہے جس کو پڑھ کر ہم مرزا دبیرؔ کو دبیرؔ کی حیثیت سے سمجھتے ہیں نہ کہ میر انیس کے مد مقابل کی حیثیت سے۔

ہماری ادبی تنقید کی ایک روایت سی بن گئی ہے کہ ہم شعرا کو پرکھنے کے لیے ان کو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ کہیں غالبؔ کو مومنؔ سے تو کہیں میرؔ کو سوداؔ سے، اور کبھی انیسؔ کو دبیرؔ سے، اور اس عمل میں کسی ایک کو چکنا چور کر دیتے ہیں۔

چناں چہ سوداؔ اور دبیرؔ آج تک اسی کا شکار رہے اور انھیں اپنا ادبی مقام نہ مل سکا۔ اس لیے میر تقی میرؔ اور میر انیسؔ کے لیے جو معیار مقرر کیے گئے تھے انھیں سے سوداؔ اور دبیرؔ کو جانچا گیا۔ جیسا کہ خبیرؔ صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"اس کتاب (المیزان) میں مرزا دبیرؔ کے کلام سے پاکیزہ سے پاکیزہ مقامات پیش کیے ہیں مگر بظاہر وہ انتخاب مولوی شبلی کے نقطۂ نظر کے موافق کیا گیا یعنی جس قسم کا کلام مولوی شبلی نے

میرانیس کا پیش کیا تھا فوق (مصنف کتاب المیزان) نے اسی رنگ کا کلام مرزا دبیر کے یہاں پیش کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ مرزا دبیر اس رنگ کے قادر تھے۔"

شعر کا عام فہم ہونا ضروری نہیں۔ اس لیے اگر دبیر کے یہاں عام فہم اشعار نظر نہیں آتے تو اس سے اُن کے مرتبہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

خبیر صاحب کے انتخاب کی خصوصیت یہی ہے کہ انھوں نے دبیر کو دبیر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

یوں بھی ایک مدت سے دبیر کے مرثیے نظر نہیں آتے تھے۔ ہر چند ان کے مرثیوں کی ضخیم جلدیں کتب خانوں میں محفوظ ہیں اور بقول خبیر صاحب "اتنا کلام دیکھنے کی کسے فرصت"۔ اس لیے یہ انتخاب دلچسپی اور شوق سے پڑھا جائے گا۔ اس زمانے میں جب کہ ہم اپنے پرانے شعرا کی طرف پھر سے نظر ڈال رہے ہیں خبیر صاحب کا یہ انتخاب وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرے گا۔ (اطہر پرویز)

ؤ

شردھانجلی (سن طباعت ۱۹۶۴ء)

از: کاوش بدری
صفحات: ۴۰ سائز: $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت: ۱/۲۵
ناشر: مدینہ پریس، تل ہل کٹری ہائی روڈ مدراس ۵

"شردھانجلی" ایک مسدس ہے جو پنڈت نہرو کی بارگاہ میں ایک نذرانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو ادیب و شاعر اپنے اس عظیم رہنما کی یاد میں برابر گلہائے محبت و عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ یہ پیش کش دیس کے ہر گوشے سے ہو رہی ہے اور بقدر توفیق مستند اور غیر مستند، معروف اور غیر معروف سب ہی شریک ہیں۔ اسی کارواں میں کاوش بدری صاحب بھی اپنی "شردھانجلی" کے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔ ان کا تعلق یونی ورسٹی لائبریری مدراس سے ہے۔ اس مسدس میں خلوص و ارادت کے ساتھ ساتھ زور بیان بھی موجود ہے۔ آغاز یوں ہوتا ہے:

لیتا ہوں اس کا نام بہت احترام سے
کرتا ہوں جس کا ذکر بڑے اہتمام سے

اک ربط خاص جس کو رہا ہے عوام سے
روئے سخن ہے آج اسی لالہ فام سے
شہرہ کہاں کہاں نہ رہا اس کے نام کا
کس کس کو احترام تھا اس کے پیام کا

پھر تیس بند کے بعد آخری بند یہ آتا ہے۔

اپنی مثال آپ تھا عالم میں فرد تھا
منزل تھا رہگذار تھا خوردہ نورد تھا
کیا خوب آدمی تھا، بالآخرہ سرد تھا
"حق حق ادا کرے"، عجب آزاد مرد تھا
اس امن کے عظیم علمبر کو السلام
ارباب ہند و پاک کے رہبر کو السلام

یہاں چوتھے مصرعے میں تصرف سے کچھ بات بنی نہیں بلکہ بگڑی ہے اور آخری شعر میں السلام کا استعمال کھٹکتا ہے۔ مسدس کے شروع میں 'مستفے چند' کے عنوان سے پنڈت جی کی زندگی کی جھلکیاں غیر ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ ان جزئیات سے قطع نظر مجموعی طور پر یہ مسدس اپنا تاثر ضرور قائم کرتا ہے۔ (عبداللہ ولی بخش قادری)

نازونیاز

مجموعہ کلام: نیاز انصاری
صفحات: ۲۴۰ سائز $\frac{17 \times 27}{16}$
قیمت: ۵۰/۱
(سن طباعت نومبر ۶۴ء)
ملنے کا پتہ: شمع بک ڈپو۔ دہلی

نیاز انصاری ایک خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں۔ 'ناز و نیاز' ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے جس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

نظمیں سیاسی، سماجی اور معاشرتی موضوعات پر کہی ہیں جو اپنے رنگ میں خوب ہیں۔ ان نظموں میں ایک دلکشی اور سحر آفرینی پائی جاتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیاز صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک خاص جذبہ اور اثر کے ماتحت کہا ہے۔ صدر ناصر سے خطاب۔ تاج محل۔ جنگ آزادی۔ ماتم انسانیت۔ انقلاب چمن۔ آہ جواہر لال خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

غزل میں بھی نیاز صاحب نے دیدۂ امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہوس و عشق میں تمیز کرو دیدۂ امتیاز بن جاؤ

ؔ

کیا پوچھتے ہو ضبط اسیری کی لذتیں میں نے قفس سے آگے گلستاں نہیں کیا

ؔ

التجائیں کروا، جام کے واسطے یہ میری تشنگی کو گوارا نہیں

نظم و غزل کے علاوہ نیاز صاحب نے دیگر اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً قصیدہ۔ مرثیہ۔ سلام اور قطعات وغیرہ جس سے ان کی جولانی طبع اور مشاقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں ؎

مخصوص تیرا جلوہ نہیں کوہ طور پر تیری تجلیاں ہیں ہر اک سمت جلوہ گر

امید ہے کہ ان کا کلام قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ضمناً ایک یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ مجموعۂ کلام بہت زیادہ عجلت میں ترتیب دیا گیا ہے جس سے کافی غلطیاں رہ گئیں اور غلط نامہ کا اضافہ کرنا پڑا۔ امید ہے کہ آئندہ اس کمی کو دوسرے اڈیشن میں دور کر دیا جائے گا۔ (سید منیر الحسن منیر)

باقی صفحہ ۲۴ کا

باقی صفحہ ۲۴ کا

جناب محمد عبید اللہ شریف صاحب (لا کالج حیدر آباد) لکھتے ہیں:۔

"پیام تعلیم کا حالی نمبر نظر سے گزرا۔ اتنا معیاری اور خوبصورت نمبر آج تک کسی بڑوں کے رسالے نے نہیں پیش کیا اور پھر اتنی کم مدت میں یہ سب آپ کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔"

جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی نے "انعام لیجیے" میں مبلغ ۵۰ انعام کا اعلان فرمایا ہے۔

"..........میں اس سلسلے میں یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ.......جس طالب علم کو یہ انعام ملے گا میں اس کے نام ایک سال کے لیے پیام تعلیم جاری کرا دوں گا۔"

دوسرے اداروں کی نئی کتابیں

شعری مجموعے

دیوان قائم	مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام	۷/-
فردوس گوش	جوش ملسیانی	۶/-
میری حدیث عمر گریزاں	آنند نرائن ملا	۶/۵۰
لہر لہر ندیا گہری	زبیر رضوی	۳/-
تیشہ	ظفر گورکھپوری	۳/۵۰
خالی مکان	محمد علوی	۴/-
وطن میں اجنبی	جگن ناتھ آزاد	۳/۵۰
نغمۂ سرمد	مترجم: عرش ملسیانی	۵/-
خلش	سیفی پریمی	۲/-
شامت اعمال	دلاور فگار	۳/-
گل و سنگ	خضر برنی	۲/۵۰
آتش تر	خار بارہ بنکوی	۴/-
صہبائے حرم	ساجد صدیقی	۱/-
لعل و جواہر	مرتبہ 〃 〃	۲/۵۰
بچوں کی دنیا	تلوک چند محروم	۴/-
سازِ حیات	پریم شنکر فرحت	۶/-
لمعات افق	مرتبہ: منور لکھنوی	۱۰/-
لمعات انور	سردار انور خاں انور	۹/-
انتخاب کلام جرأت	مرتبہ: ایم حبیب خاں	۱/۲۵
〃 قائم	مرتبہ: عابد رضا بیدار	۱/-
〃 شاد		-/۵۰

ادب / تنقید

ادب کا مطالعہ	اطہر پرویز	۴/۷۵
ادب اور نفسیات	دیویندر اسر	۳/۵۰
ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	۵/-
انتخاب اندھ پنچ		۲/-
اردو زبان اور عورت	وحیدہ نسیم	۳/۲۵
جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری	حمیدہ سلطان	۵/-
خواجہ میر درد	قدیر احمد	۵۰/-
دیدہ و دریافت	نثار احمد فاروقی	۳/۷۵
سرقہ و توارد	نریش کمار شاد	۳/-
لکھنؤ کی پانچ راتیں	سردار جعفری	۳/۵۰
مطالعے	نریش کمار شاد	۳/۵۰
کیف و کم	یوسف ناظم	۳/-
جگر کی غزلیہ شاعری	اشفاق علی خاں	۳/۵۰
مطائبات شبلی	الیس جالب مظہری	۲/۵۰
یادگار جگر	محمد اسلام	۲/-
تاریخ عصر قدیم	عبد الحلیم شرر	۴/۵۰
شبلی نامہ	محمد اکرم	۴/-
افادات سلیم	مولانا وحید الدین سلیم	۴/۵۰
〃 مہدی	ایم۔ مہدی حسن	۴/۵۰
طنزیات آزاد	مولانا آزاد	۳/-
مکتوبات سلیمانی	مولانا سلیمان ندوی	۵/-

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

ادبی خبریں

مرتبہ: مرتضیٰ حسین بلگرامی

انجمن ترقی اُردو کی دتی شاخ سے "صبح" کے نام سے جو ایک سہ ماہی رسالہ شائع ہوتا تھا۔ اُسے اب ریاستی شاخ انجمن ترقی اُردو نے ماہوار شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس میں اردو کی لسانی مہم اور اُردو کی نئی مطبوعات کے متعلق خاص طور پر مضامین اور اطلاعات شائع ہوں گی۔ پہلا شمارہ وسط اپریل تک شائع ہوگا۔ عبداللطیف اعظمی صاحب (جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵) اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ہیں۔

۸ر مارچ ۶۵ء کو شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی میں روس طلبا کو اردو پڑھانے کی اسکیم کے زیر اہتمام علی سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری نے طلبا ایم، اے اور روسی طلبا سے خطاب کیا۔ علی سردار جعفری نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ آج سوویت روس میں منفی اور مثبت کرداروں کی بحث جاری ہے لیکن زندگی میں دونوں قسم کے کردار ملتے ہیں اور کسی ایک کو مکمل طور پر رد کرنا ممکن نہیں منفی کردار کو بے نقاب کرنا ادیب کا کام ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ادیب شاید قوموں کی رہبری نہیں کر سکتے لیکن رہبروں کی نگرانی ضرور کر سکتے ہیں۔

نئی دلی ۲۵ر فروری ۶۵ء کو پارلیمنٹ میں وزیر اعظم ہندلال بہادر شاستری نے کہا کہ جو لوگ اُردو پڑھنا چاہتے ہیں ان کو اردو پڑھنے کے تمام مواقع اور سہولت کا ملنا ضروری ہے۔

جموں۔ اس مرتبہ صدر ریاست کرن سنگھ جموں و کشمیر اسمبلی کے مشترکہ اجلاس کو انگریزی کی جگہ اردو میں مخاطب کریں گے۔ اس سلسلے میں یقین ہے کہ جلد ہی اعلان ہو جائے گا۔

لکھنؤ۔ انجمن ترقی اُردو کی شاخ لکھنؤ کے وفد نے وزیر اعلیٰ مسز سچیتا کرپلانی [illegible] اردو داں استادوں کا تقرر کیا گیا ہے۔

پاکستان رائٹرز گلڈ نے اپنی چھٹی سال گرہ کے اجلاس کے موقع پر جناب جمیل جالبی کی تصنیف "پاکستانی کلچر" کو ۱۹۶۴ء کی اردو کی بہترین نثری تصنیف قرار دیتے ہوئے مصنف کو پانچ ہزار روپے دینے کا اعلان کیا۔ اس کتاب کو مشتاق بک ڈپو کراچی نے شائع کیا ہے۔ دوسری کتاب تحقیق کی روشنی میں مصنفہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کو بھی ۵ ہزار روپے ملے۔

اس سال آدم جی (پاکستان) ادبی انعام مندرجہ ذیل حضرات کو ملا۔

آبلہ پا (ناول)	رضیہ فصیح احمد	۵ ہزار روپے
فارقلیط (شعروشاعری)	عبدالعزیز خالد	۲½ ہزار روپے
مطربہ (")	قتیل شفائی	۲½ ہزار روپے

دو قابل ذکر کتابیں

جامعہ کی کہانی ــــ عبدالغفار مدہولی

جامعہ کے قیام سنہ ۱۹۲۰ء سے ہندوستان کو آزادی ملنے تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی کاموں کی روداد اور اس کے آثار چڑھاؤ کو کہانی کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کتاب میں دو درجن تصویریں بھی ہیں۔

ضخامت ...۵　　قیمت　　-/۶

میر انیس ــــ سید سفارش حسین

سید سفارش حسین صاحب کی اس کتاب میں مرثیہ کی تعریف و تاریخ انیس اور ان کے کلام کی شاعری، کلام کا نمونہ اور انیس و دبیر کا موازنہ آپ کو انیس کے سمجھنے میں بہت مدد دے گا۔

قیمت　　۲/۵۰

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار، دہلی ۶

سالانہ چندہ ایک روپیہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵	فی پرچہ ۱۰ پیسے

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا [illegible]

کچھ اچھی کتابیں

افسانے

بیس غیر مطبوعہ کہانیاں	منٹو	۱/۵۰
خیالستان	سید سجاد حیدر یلدرم	۳/۷۵
دو ہاتھ	عصمت چغتائی	۲/۵۰
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۳/۷۵
دیا جلے ساری رات	خواجہ احمد عباس	۲/۵۰
زندگی کے کھیل	صالحہ عابد حسین	۲/۵۰
سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	۲/-
کیمیاگر	پروفیسر محمد مجیب	۲/-
کالے صاحب	اوپندر ناتھ اشک	۲/۵۰
کائناتِ تبسم	شوکت تھانوی	۳/۵۰
کھوکھلے انبار	م۔م۔ راجندر	۲/-
نروان	جیلانی بانو	۳/۷۵

Regd, No. D. 58

April, 1965.

Kitab Numa

JAMIA NAGAR, NEW DELHI. 25.

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

جوائنٹ ایڈیٹر
غلام ربانی تاباں

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

جلد ۶ | مئی ۱۹۶۵ء | شمارہ ۵

اشاریہ

کُل ہند انجمن ترقی اردو نے اُردو کے حق میں صدر جمہوریہ ہند سے ایک مشترکہ مطالبہ کرنے کے سلسلے میں ادیبوں اور شاعروں سے ایک اپیل کی ہے جسے ہم یہاں انجمن کے ترجمان "ہماری زبان" کی تائید اور شکریے کے ساتھ شائع کر رہے۔ ہمیں اُمید ہے اہل قلم حضرات اس قلمی تحریک میں ہر طرح تعاون فرما کر اسے پوری طرح کامیاب بنائیں گے۔ (ایڈیٹر)

"انجمن نے یہ طے کیا ہے کہ اُردو کے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کی طرف سے صدر جمہوریہ سے اپیل کی جائے کہ وہ دفعہ ۳۴۷ کے تحت اپنے اختیارات سے کام لے کر اتر پردیش، بہار، پنجاب اور دہلی میں اُردو کو سرکاری زبان قرار دیں اور دوسری ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد ہو وہاں اس کی تعلیم کے لیے سہولتیں مہیا کرنے کی ہدایات کریں۔

ہم نے اپیل پر دستخط کے لیے ہر ریاست میں ادیبوں کی کمیٹی کا ایک کنوینر نامزد کر دیا ہے۔ یہ کمیٹی ریاستی شاخوں کی مدد سے کام کرے گی۔ کنوینر کو اختیار ہو گا کہ وہ اپنی سہولت کے مطابق نو یا گیارہ ادیبوں کی ایک کمیٹی بنا لے۔ اس کمیٹی کا کام ادیبوں سے اس اپیل پر دستخط کرانا ہوگا جس کا مسودہ درج ذیل ہے (مسودہ صلا پر ملاحظ فرمایئے)۔ آسام، گجرات، اڑیسہ اور کیرل کے ناموں کا اعلان بعد میں ہوگا۔ کنوینر صاحبان کو علیحدہ خط بھی جاری کیے گئے ہیں۔ دستخطوں کے بعد ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کا ایک وفد صدر جمہوریہ سے ملے گا۔

کنوینر صاحبان کے نام یہ ہیں:-

۱۔ اتر پردیش، آنند نرائن ملّا ۲۔ بہار، غلام سرور ۳۔ بنگال، پرویز شاہدی ۴۔ آندھرا پردیش، مخدوم محی الدین ۵۔ مہاراشٹر، سکندر علی وجد ۶۔ پنجاب، جوش ملسیانی ۷۔ دہلی، گوپی ناتھ امن ۸۔ کشمیر، غلام رسول نازکی ۹۔ راجستھان، احترام الدین شاغل ۱۰۔ میسور، محمود ایاز ۱۱۔ مدراس، عبدالوہاب بخاری ۱۲۔ مدھیہ پردیش، کوثر چاندپوری

مولانا عبدالماجد دریابادی

شبلی ← ایک انسان

پچاس سال! پچاس سال اور وہ بھی ہجری نہیں، عیسوی۔ نصف صدی اور وہ قمری نہیں، شمسی۔ مدت کچھ تھوڑی ہوئی! ــــ اللہ اکبر! عمریں بیت گئیں، ایک نہیں دو دو پشتیں گزر گئیں ــــــــــــــــــ بچے بوڑھے ہو گئے اور جوان بوڑھے پھوس ہو کر رہے! جو کنوارے تھے وہ پوتوں والے ہو گئے ــــ اور جن کے قد تیر کی طرح سیدھے تھے وہ جھک جھکا کر کمان بن گئے۔ تاریخ اور جنتری سے پوچھیے تو یہ جواب پائیے اور یہ حساب سنیے۔ لیکن غفلت کی تھپکیوں میں آ گر آ جائیے اور بھروسہ محض اپنی یادداشت پر رکھیے تو ایسا لگنے لگے کہ جیسے ابھی کل ہی کی بات تو ہے۔ ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۵ء کو دن ابھی کے گزرے ہیں۔ کل رات ہی کا تو خواب ہے! وہ دیکھیے دارالمصنفین کا خاکہ تیار ہو رہا ہے۔ دستور العمل بن رہا ہے۔ مجلس انتظامی کے رکن ملک بھر سے چھانٹ چھانٹ کر لیے جا رہے ہیں۔ ہونہار اور نوعمر رفیق چنے جا رہے ہیں۔ علم و قلم کی بساط پر ایک نئی مجلس مرتب ہو رہی ہے۔ تحقیق و تصنیف کی مسند پر جلوہ آرا ہو رہے ہیں سید سلیمان ندوی یا ایک ہیچمدان کی زبان میں سلیمانِ اعظم اور انتظام عمارت، طبع و اشاعت کے سرِ لشکر بنے ہوئے ہیں۔ انھیں کے رفیق و صدیق، ہمدم و ہمقدم مولوی مسعود علی ندوی یا ایک بے ادب کی زبان میں سالار مسعود غازی! ــــ کیا زمانے تھے، کیا جوش تھا اور کیسے بلند جذبات تھے، کیا کیا حوصلے، کیا کیا ولولے! اور سب سے بڑھ کر ایک عزم صمیم، کام کی دھن، خدمت کی لگن!

اور یہ ساری آگ لگائی ہوئی، اور روشنی پھیلائی ہوئی کس کی تھی! ایک بڑے میاں کی جو ستر اور اسی کیا معنی ابھی ساٹھ برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ "بڑے میاں" بن گئے تھے۔ ابھی اپنی بھرپور جوانی ہی میں تھے کہ ملک بھر میں اپنا سکہ بٹھا چکے تھے اور علامہ کہلانے لگے تھے اور علوم و معارف کی مشعل ہاتھ میں لیے ہوئے ہزاروں

دماغ روشن کر چکے تھے۔ تو زرا بیس پچیس منٹ کا وقت نکال کر اسی مردِ خدا کی داستان حیات کی کچھ سطریں پڑھ ڈالیے۔ داستان کچھ اس کی شخصیت کی اور کچھ اس کی کارگزاری کی، اس کی کاری گری کی کہانی ناتمام سی، ادھوری سی، سرسری سی، بلکہ یوں کہیے کہ اڑی پڑی سی!

شخصیت

اپنے ہوش کی آنکھیں ابھی کھل چلی ہی تھیں اور زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے ختم اور بیسویں صدی کے شروع ہونے ہی کا تھا کہ کانوں میں نام مولانا شبلی کا عظمت و توقیر کی راہ سے پڑنے لگا۔ اکثر حالی کے ساتھ عطف ہو کر اور کبھی ان سے ہٹ کر بلکہ کبھی کٹ کر بھی۔ شہرت یہی سننے میں آئی کہ مولانا علم و فضل کے پیکر ہیں اور ایک فاضل ہمہ داں اور تاریخ کے بحرِ بے کراں، نثر کے تاجدار، تو نظم کے بھی شہسوار۔ کچھ اور تمیز آئی تو الندوہ، باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔

اور اس نے مولانا کے علم و فضل کا نقش دل پر اور گہرا کر دیا۔ [illegible] میں والد ماجد کے ہمراہ لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ کے جلسۂ دستار بندی میں شرکت کی اور وہیں پہلی بار مولانا کی زیارت کے ساتھ دو کتابیں بھی مولانا کی خرید کر لیں۔ ایک ان کی معروف متکلمانہ کتاب "الکلام" دوسری تاریخی رسائل شبلی۔ نویں درجہ کے اسکولی طالب علم اور چودہ پندرہ کے سن کے لڑکے کی بساط ہی کیا تھی۔ کتابیں پڑھیں اور تھوڑی بہت سمجھیں تو آنکھیں کھل گئیں اور ایک عالم ہی دوسرا نظر آنے لگا۔ "الکلام" میں علمی، کلامی فلسفیانہ بحثیں، وجود باری، رسالت، معجزات، عقیدۂ آخرت پر تھیں اور رسائل میں بعض بڑے معرکے کے تاریخی مسئلوں کا حل تھا۔ مضمون اس کے سارے ہی اہم تھے لیکن یہ تین مقالے تو دل کی گہرائیوں میں اتر گئے اور دماغ پر نقش ہو گئے۔ ایک کتب خانہ اسکندریہ دوسرے حقوق الذمیین، تیسرے جزیہ کی تحقیق۔ دونوں کتابوں کے لکھنے والے سے عقیدت گہری سے گہری پیدا ہو گئی اور اب الندوہ کا انتظار ہر مہینے بے تابی سے رہنے لگا۔ اورنگ زیب عالمگیر پر الندوہ میں قسط وار مضمون سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔ سوتے جاگتے شبلی ہی کا خیالی پیکر نظر کے سامنے رہنے لگا۔ سال ڈیڑھ سال بعد کالج میں پڑھنے کے لیے لکھنؤ منتقل ہو آیا اور اخیر [illegible] کی دوسری ششماہی کی کوئی تاریخ

ہو گی جب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا
اف وہ پہلی اصالتہً حاضری[1]! کتنی عقیدت مندانہ اور کیسی پرستارانہ تھی! نام بتانے اور معمولی سے سوالوں کا جواب دینے میں زبان لڑکھڑانے لگی، ہمت جواب دے دے گئی ــــ خیر اس پہلی ملاقات کے بعد راہ کھل گئی اور شروع شروع تو آمد ورفت رک رک کر کئی دن بعد ہوتی رہی اور پھر جلدی جلد ہونے لگی۔ کبھی تنہا اور کبھی اس وقت کے رفیق خصوصی مولوی عبدالباری ندوی کے ساتھ۔ ملاقات کا عام وقت سہ پہر تھا! ادھر سہ پہر ہوا ادر ادھر قدم خود بخود آستانِ شبلی کی طرف اٹھ گئے۔ اس وقت مولانا کی حیثیت گویا پیر و مرشد کی تھی۔ سیاست ہو یا مذہب، شاعری ہو یا ادب تاریخ ہو یا فلسفہ، علم و فن کے ہر شعبے، ہر شاخ میں مراجعیت انھیں کو حاصل۔ وہ امام ہیں مقتدی، وہ رہنما ہیں مسافر، وہ طبیب ہیں مریض۔ مولانا کا قیام اپنی وفات (نومبر ۱۹۱۴ء) سے کچھ قبل تک عموماً بیشتر لکھنؤ ہی میں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی لمبی مدت کے لیے وہ بمبئی، حیدرآباد وغیرہ بھی آتے جاتے رہے۔

اسی درمیان میں ایک دور وہ بھی آیا جب مغربیت کے اثر سے میرے اوپر الحاد کا سوار ہو گیا۔ اورمل، اسپنسر، ہکسلے وغیرہ کے بھرّے میں آکر میں مذہب سے فرنٹ ہو گیا فخر اسلام کی حلقہ بگوشی کے "ریشنلزم" یا عقلیت اور لاادریت پر کرنے لگا، اور مذہب پر کچھ زور نہ چلا تو ساری جھنجلاہٹ شبلی کی 'الکلام' ہی پر اتاردی۔ قلم چلانے کی الٹی سیدھی مشق مولانا ہی کے فیض سے ہو گئی تھی۔ پہلا ہاتھ انھیں پر صاف کیا۔ کئی کئی نمبر 'الکلام' کی ردو قدح میں لکھنؤ کے ایک ماہنامہ میں چہرہ پر "طالب علم" کا نقاب ڈال لکھ ڈالے۔ حاضری کے معمول میں فرق تو کچھ اسی زمانہ میں قدرتاً آیا لیکن بہت زیادہ اس زمانے میں بھی نہ آنے پایا۔ یہ نیازمندی تو ادھر سے تھی، ادھر مولانا کی بزرگانہ شفقت تھی کہ لکھنے والے کا نام جان لینے کے بعد بھی نہ ہٹی نہ گھٹی۔

مولانا نے مکان اس درمیان میں کئی بدلے۔ کم سے کم دو تو گولہ گنج ہی کے آس پاس، اور پھر جب امین آباد میں گھنٹہ گھر پارک تیار ہو گیا، غالباً ۱۹۱۱ء میں، تو

---

[1] اصالتہً اس لیے کہ والد ماجد کے ہمراہ تو تبعاً ۱۹۰۷ء میں حاضری ہو چکی تھی۔

اسی کے بالاخانہ ۱۳۳ء پر منتقل ہوآئے۔ سیرت نبوی کا جب مستقل کام ۱۲ء میں شروع کیا تو ضرورت ایک چلتے ہوئے انگریزی مددگار کی ہوئی جو انگریزی ماخذوں سے معلومات تلاش کر کے اور ترجمہ کر کے پیش کرتا رہے۔ اس خدمت پر تقریباً گھنٹے دو گھنٹے روزانہ کام کے لیے ماہانہ معاوضہ پر اسی خاکسار کا کیا۔ (بی، اے کی سند اسی سال حاصل ہوئی تھی) اور اس تقریب سے حاضری اور ہم نشینی کے موقعے اور زیادہ ملنے لگے اور وقت کے علاوہ بے وقت، بلکہ ناوقت بھی۔ اور جب مولانا سفر میں تشریف لے جاتے تو مراسلت بھی پابندی سے جاری رہتی۔ جلوت کی صحبتوں کے ساتھ خلوت میں بھی بیٹھنے اٹھنے کے موقعے ملنے لگے اور انگریزی حکام سے مولانا کی جو خط وکتابت ہوتی رہتی اس خدمت کا بھی اہل اس نااہل کو سمجھ لیا گیا۔ ندوہ کے معاملات میں دوسروں سے جو نوک جھونک چلی جاتی اس میں بھی ایک حد تک دخیل اپنی طالب علمانہ حدود کے اندر ہوگیا ـــــ صیغۂ متکلم کے بار بار اور سامعہ خراش استعمال سے عجیب نہیں کہ طبیعت اکتا چلی ہو، غرض اس ساری درازنفسی سے یہ ہے کہ علامہ کی شخصیت پر جو گزارش پیش ہو رہی تھی اس کی بنیاد نہ سنی سنائی باتیں نہ واسطہ در واسطہ روایتیں بلکہ بہت کچھ دیکھا سنا ہوا ہے اور "شنید" سے بڑھ کر "دید" کا حصہ ہے۔

اس زمانے میں مولانا تجرد کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اہل خانہ وفات پا چکی تھیں اور صاحب زادے کہیں اپنی ملازمت پر تھے۔ مکان کے مکین بس مولانا خود تھے اور ایک افیونی قسم کے خدمت گزار، کہ وہی کھانا بھی پکا دیتے تھے، اور کھانا پکتا ہی کیا تھا بڑے کم خور تھے۔ جوانی میں سنا ہے کہ بڑے شہ زور تھے، اور عجب نہیں کہ خوش خور بھی ہوں مگر اب تو غذا بہت ہی قلیل رہ گئی تھی۔ معمولات روزانہ یہ تھے کہ رات میں سویرے ہی سو جاتے اور بہت تڑکے منہ اندھیرے اٹھ بیٹھتے۔ صبوحی چائے کا معمول اسی وقت کا تھا۔ خدمت گار صاحب کو یہی ڈیوٹی کمل کر رہتی۔ مولانا چائے کے رسیا تھے اور چائے سے بھی بڑھ کر شکر کے۔ شکردان میں دانہ دار شکر سامنے رکھی ہوئی ہے اور مولانا اس سے شغل فرماتے جاتے ہیں۔ قلم میں شیرینی چاہے کچھ اسی شکرخوری سے آگئی ہو لیکن بھوک پر تو بڑا ہی برا اثر شکر اور چائے کی اس افراط کا پڑنا ہی تھا۔ ابھی کچھ اندھیرا ہی ہوتا کہ لیپ جلا کر بیٹھ جاتے اور لکھنے کا کام صبح ہی کے دو گھنٹے کے اندر کر ڈالتے۔ دن کا

بلاحصہ کتابوں کے اوراق کی الٹ پلٹ کی نذر ہوتا۔ مطالعہ کے شوقین نہیں حریص تھے۔ دن کا کھانا اول ہی وقت کھا لیتے، شام کے کھانے سے اخیر زمانہ میں مغرب سے پہلے ہی فراغت کرتے۔ اکثر ہم بیٹھنے والوں کے سامنے ہی۔ اور کھانا ہوتا کیا، امین آباد کے چٹپٹے کباب سیخ ایک دو سے زیادہ نہیں۔ اور کلچے وہ بھی بس ایک ہی آدھ۔ رساول خوب میٹھی کھاتے، اور ایک رساول کیا، ہر مٹھائی خوب ہی تیز چاہتے۔ ریل کے سفر میں اسٹیشنوں سے مٹھائی خرید خرید کر تناول فرماتے۔

مزاج جذباتی تھا۔ سردی اور گرمی دونوں کا احساس بڑا نازک رکھتے۔ سردی
۹ کی راتوں میں معمولی رضائی، کمبل، لحاف ناکافی ثابت ہوتے لیکن پانی غیر معمولی طور پر ٹھنڈا چاہتے۔ ایک بار کیا ہوا کہ سنہ ۱۳ء کے آخری ہفتہ دسمبر میں لکھنؤ میں شب کو غریب خانہ کھانے پر تشریف لائے۔ ایک دوست کی فرمائش پر عزیز لکھنوی اور شہر کے دو نامور ہندوؤں کو بھی بلوا لے دیا تھا۔ ایک پنڈت برج نرائن چکبست شاعر، دوسرے پنڈت بشن نرائن بیرسٹر اور کانگریس کے سابق صدر، کھانے پر مولانا نے پانی طلب فرمایا اور جب پیش ہوا تو بولے "برف نہیں ہے" اتنے کڑکڑاتے جاڑے میں رات کے وقت کسی کو خیال بھی برف کا ہو سکتا تھا؟ اور اس وقت تو تلاش سے آمین آباد میں بھی نہ ملتی۔ میں شرمندگی سے پانی پانی ہوگیا —— مزاج میں حدت و شدت اسی مناسبت سے تھی اور شاید اسی لیے رفیقوں سے اکثر ان بن بھی رہتی۔ غم و غصہ کا اثر بھی قلب بہت محسوس کرتا۔ چھوٹے بھائی اسحاق مرحوم تو خیر سگے بھائی ہی تھے ان کی وفات نے تو مولانا کی کمر توڑ دی۔ ان کا مرثیہ تو وہ مضطر و بے قرار ہو کر کہتے ہی، باقی غیروں کے جو مرثیے انھوں نے کہے ہیں، ان میں بھی سوز و گداز پھٹا پڑتا ہے۔ میرے والد مرحوم کا انتقال ۱۹۱۲ء کے اخیر مکہ معظمہ میں ہوا۔ میں نے ایک ٹوٹا پھوٹا ماتمی مضمون اس وقت کے ہفتہ وار مشرق (گورکھپور) میں لکھا۔ مولانا نے اسے پڑھا اور نو مشقی کی ساری خامیوں کے باوجود مضمون کی داد اس کی غم انگیزی کی حیثیت سے دی۔ خواجہ حسن نظامی اور پریم چند کے افسانوں میں جو رقت انگیز ٹکڑے آجاتے تھے، مولانا کے آنسو ان پر نکل پڑتے تھے۔ میر انیس کے مرثیوں سے اتنا تاثر بھی اسی رقتِ قلبی کا اثر تھا —— محسن الملک مرحوم، جسٹس سید محمود مرحوم کی وفات اور مدار المہام [illegible]

کہ واقعۂ قتل سے قلب نے بڑا اثر لیا تھا اور اس کا اظہار زبان یا قلم سے، نظم میں یا نثر میں ہو کر رہا۔ اپنے معاصرین میں حالی کے بڑے معترف رہا کرتے۔ میں علامہ کے اور کمالات کا قائل تو تھا ہی، لیکن ان کی سخن فہمی کو اپنا جزو ایمان بنائے ہوئے تھا اور معمول کچھ ایسا بنالیا تھا کہ جب کوئی شعر پسند آجاتا تو اسے کسی نہ کسی بہانے مولانا کے کان تک ضرور پہنچادیتا۔ اب اگر کہیں انھوں نے داد دے دی یا میرے انتخاب پر صاد کر دیا، تو جیسے مجھے سب کچھ مل گیا۔ لیکن اگر کہیں انھوں نے خاموشی یا بے رخی برتی تو معاً وہ شعر میری نظر سے بھی گر جاتا ـــــ ایک بار اپنے دل کی بات بے تکلف گوش گزار کر دی، بولے کہ "خیر میرے لیے تو محض حسن ظن ہے، البتہ مولانا حالی کا درجہ سخن فہمی میں واقعی ایسا ہی ہے میں ان کے ساتھ یہی معاملہ رکھتا تھا"۔ عالی ظرفی کی ایک اور مثال اس سے اونچی سنیے:

ثاقب اکبرآبادی ثم لکھنوی کا شمار لکھنؤ کے اہل زبان میں تھا۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا نے مسجد کان پور کے مشہور حادثہ سے متعلق نظم کہی۔ ایک جگہ پولیس کی گولیوں سے بوڑھوں اور بچوں دونوں کی شہادت کا ذکر تھا۔ ایک شعر موزوں یوں ہوا تھا۔

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ لڑکے ہیں بہت جلد ان کو سوجانے کی عادت ہے

ثاقب ملنے آئے تو انھیں سنایا۔ ثاقب نے کہا کہ دوسرے مصرعہ میں اگر دو ایک لفظ بدل دیئے جائیں تو مصرعہ اور چست ہوجائے: "لڑکے" کی جگہ "بچے"، "بہت جلد" کی جگہ "سویرے" اور "سورہنے" کی جگہ "سوجانے"۔ مولانا نے بلاتامل اس مشورے کو قبول کیا، اور اب مصرعہ یوں ہو گیا۔ ع

کہ بچے ہیں سویرے ان کو سوجانے کی عادت ہے

معاصر کی عظمت کا اعتراف بھی کوئی آسان بات نہیں۔ چہ جائیکہ اس کی اصلاح کو قبول کر لینا۔ پھر خصوصاً وہ معاصر سن میں بھی اپنے سے چھوٹا ہو اور شہرت میں بھی کمتر ہو، یہ انصاف پسندی اور عالی ظرفی ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی۔

دینی غیرت مندی کے پتلے تھے۔ خود عبادات میں چاہے ڈھیلے ہوں، بعض عقائد کی تاویل میں بھی چاہے عقل پرستوں کی صف میں جا ملے ہوں، لیکن جہاں تک دین کی حمیت و غیرت کا سوال ہے، ان کے قدم کسی بڑے سے بڑے منقولی بزرگ سے پیچھے

نہ تھے۔ اور آریہ ہوں یا عیسائی، ملحد ہوں یا مستشرق، طنز و تعریض کی زد کسی سمت سے بھی اسلام پر پڑتے دیکھ برداشت نہ کر سکتے۔ اور فوراً جواب کے لیے بے چین ہو جاتے ــــــ سر سید سے سیاسیات میں سخت اختلاف رکھتے، لیکن ذاتی طور پر ان کے بڑے مداح تھے۔ ان کی سیرت و کردار کی پختگی، ان کی اصول پرستی، ان کے ایثار اور ان کے حب اسلام کی داد برابر دیتے رہتے۔ خود بھی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی کتنی تجویزیں سوچتے رہتے، کتنے منصوبے بناتے رہتے اور جہاں تک بس چلتا ان پر عمل بھی کر گزرتے۔

طبیعت حسن پرست پائی تھی۔ فارسی شاعری میں کھل کھیلتے اور معاملہ بندی کو بڑے لطیف انداز میں سرمستی کی حد تک پہنچا دیتے۔ بمبئی اور جنجیرہ کی تلمیحوں کو تو یار لوگ لے اڑے اور بدگمانی اور مبالغہ کے زور سے سوئی کو بلّم بھالا بنا دیا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ بات سرے سے بے اصل ہو، اور مولانا کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے آخر یہ کیوں ضروری ہے کہ عمل ہی میں نہیں بلکہ خیال اور دماغ میں بھی انھیں بے نفس اور معصوم تسلیم کر لیا جائے۔

مولانا کا سب سے بڑا وصف ان کا مشغلۂ علم تھا۔ کتب بینی ان کی غذا تھی اور مطالعہ ان کا اصلی ذوق۔ انھیں کتب خانہ دے دیا جاتا تو بس انھیں نہ کھانے کی پرواہ تھی نہ سونے کی۔ ان کا سب سے بڑا راحت کدہ ان کا کتب خانہ ہی تھا۔ یہ ذوق ان کی اصل طبیعت و سرشت بن گیا تھا اور چوں کہ یہ حال تھا محض قال نہ تھا۔ آمد تھی آورد نہ تھی، اور تکلف و تصنع کو اس میں دخل نہ تھا اس لیے ان کا یہ ذوق متعدی بھی تھا اور دوسروں کو قوت کے ساتھ متاثر کرتا رہتا، اور جو ان کی صحبت میں اٹھا بیٹھا وہ خود بھی اگر مصنف نہیں تو مضمون نگار تو بن ہی گیا "جمال ہم نشیں در من اثر کرد" کی تصدیق۔ (اقتباس) (بشکریہ صدق جدید، لکھنؤ)

غلام ربّانی تاباں

غزل

دلِ تباہ نے اِک تازہ زندگی پائی
تمہیں چراغ ملا ہم نے روشنی پائی

ترے خیال سے فرصت اگر کبھی پائی
بھری بھری سی یہ دُنیا تہی تہی پائی

ستم بھی تیرے تغافل کو ساز گار آیا
وفا کی داد بھی ہم نے کبھی کبھی پائی

نکھر گئے ہیں پسینے میں بھیگ کر عارض
گلوں نے اور بھی شبنم سے تازگی پائی

سحر سے مل تو گیا سلسلہ اُجالے کا
حیات شمع نے کہنے کو عارضی پائی

کبھی جو یادِ خراباتِ آرزو آیا
غمِ حیات کی تلخی میں کچھ کمی پائی

درِ مغاں سے تو جو کچھ ملا، ملا تاباںؔ ✕ درِ مغاں سے بھی پائی تو تشنگی پائی

([illegible] صفحات : ۱۳۶ قیمت : ۲/۲۵ حوالہ صفحہ ۹۹، ۹۸)

شوکت تھانوی

وہمی

ملازمہ: حکیم صاحب آئے ہیں بیگم صاحب!
بیگم: اچھا۔ دیکھنا! نجمہ وہ ان کی طرف نہ نکل جائیں۔ بلالو یہاں، جلدی سے۔
نجمہ: میں نے بیرے سے کہہ دیا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے مل کر جائیں ابو جان کو دیکھنے۔
لیجے وہ تو آرہے ہیں اسی طرف حکیم صاحب!
حکیم صاحب: (کمرے کے باہر ہی سے آواز دے کر) میں حاضر ہوسکتا ہوں بندہ نواز
نجمہ: تشریف لے آیئے حکیم صاحب!
حکیم صاحب: (آتے ہوئے) آداب بجالاتا ہوں بیگم صاحبہ۔ جیتی رہو نجمہ بیٹی۔
کہیے صاحب کیا حال ہے خان بہادر صاحب کا۔
بیگم: حال کیا ہوتا حکیم صاحب۔ جس مرض کا آپ علاج کر رہے ہیں۔ سچ پوچھیے تو
اس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہ تھی۔
حکیم صاحب: یہ تو آپ نے عجیب بات فرمائی۔ میرے خیال میں تو دنیا میں کوئی
مرض ایسا نہیں ہے جس کی دوا حق تعالیٰ نے بقول مولانا حالی کے پیدا نہ
کی ہو۔
بیگم: یہ تو ٹھیک ہے مگر وہم کا علاج نہیں کرسکتے۔ میرے خیال میں تو ان کو سوائے
وہم کے کوئی بیماری نہیں ہے۔ خوراک ماشاء اللہ اچھی ہے۔ نیند خوب آتی ہے
وزن اللہ رکھے بڑھ ہی رہا ہے۔ بخار ان کو نہیں۔ کھانسی اللہ نہ کرے،
ان کو نہیں۔ درد پار کہیں درد بھی نہیں۔ پھر آخر بیماری کیا ہے؟
حکیم: بیگم صاحبہ! بعض امراض ایسے ہوتے ہیں جن کو صرف مریض محسوس کرسکتا
ہے اور اگر عقل سے کورا نہ ہو تو طبیب بھی سمجھ سکتا ہے۔ تھوڑا بہت میرے

نزدیک آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ خان بہادر صاحب ہر طرح تندرست ہیں اور صرف وہم میں مبتلا ہیں۔

بیگم: تو آپ کے نزدیک ان کو شکایت کیا ہے

حکیم: وہی تمام شکایات جن کا اظہار خان بہادر صاحب کرتے رہتے کہ بخار نہیں ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہے۔ بھوک لگتی ہے مگر جتنا کھانا چاہتے ہیں نہیں کھا سکتے دل جوان ہے اور خود روز بروز ضعیف ہو رہے ہیں۔

بیگم: کمال کرتے ہیں حکیم صاحب آپ بھی۔ میں کہتی ہوں۔ عمر بھی آخر کوئی چیز ہے۔ آپ کے خیال میں کیا ہوگی ان کی عمر؟

حکیم: بیگم صاحبہ! میں نے ہمیشہ امراء اور رؤسا کا علاج کیا ہے اور مجھ کو معلوم ہے کہ رؤسا اپنی عمر کے تابع نہیں ہوتے بلکہ ان کی عمر ان کے تابع ہوتی ہے۔ ویسے خان بہادر صاحب کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں۔ ہوگی ساٹھ کے لگ بھگ۔

بیگم: تو آپ کا خیال ہے کہ اس عمر میں بھی ان کو ضعیفی کی شکایت نہ ہونی چاہیے۔

(خان بہادر کی آواز آتی ہے)

خان بہادر: (دُور سے) ارے بھئی کوئی ہے۔

نازو: جی سرکار۔

خان بہادر: بیگم صاحبہ کو ذرا بھیجو۔

نازو: بہت بہتر۔ بیگم صاحبہ سرکار یاد فرما رہے ہیں۔

بیگم: نجمہ بیٹی۔ تم چلو۔ میں آرہی ہوں حکیم صاحب کو لے کر (نجمہ جاتی ہے) حکیم صاحب۔ آپ آخر ان کی ہاں میں کیوں ہلاتے ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ بالکل تندرست ہیں۔

حکیم: غالباً آپ یہ سمجھ رہی ہوں گی کہ میں اپنی فیس اور دواؤں کی قیمت وصول کرنے کی وجہ سے خان بہادر صاحب کو خواہ مخواہ بیمار ڈالے ہوئے ہوں مگر یہ غلط ہے بیگم صاحبہ وہ واقعی علیل ہیں۔ علالت کا تصور ہی بیمار ذہن میں آتا ہے۔

بیگم: تو یہ کہیے کہ ذہنی بیماری ہے۔

حکیم: ذہنی بیماری نتیجہ ہوتی ہے جسمانی علالت کا۔ ان کے عناصر میں اعتدال نہیں ہے

قوئیٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔

بیگم: میں غالب کا شعر پڑھنے کو نہیں کہہ رہی ہوں۔ حکیم صاحب میں ان کی صحت کے متعلق کسی قطعی نتیجے پر پہنچنا چاہتی ہوں۔ اسی لیے میں نے آج اپنے بھانجے ڈاکٹر اکبر کو بھی بلایا ہے خدا کرے۔ وہ آپ کی موجودگی ہی میں آجائیں۔ وہ کل بھی دیکھ چکے ہیں۔

حکیم: ڈاکٹر اکبر۔ وہ صاحب زادے گویا جن سے نجمہ کی نسبت بھی ہو رہی ہے۔

بیگم: جی ہاں وہی۔ ماشاءاللہ بڑا سمجھ دار ڈاکٹر ہے۔ ہزار بارہ سو کی پریکٹس تو ابھی سے ہو گئی ہے اس کی۔

حکیم: یہ درست ہے مگر شاید آپ کو معلوم نہیں کہ خان بہادر صاحب یونانی امراض میں مبتلا ہیں۔ ان امراض کو طب انگریزی کے ماہر مشکل ہی سے سمجھ سکیں گے۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔

بیگم: جی ہاں اب اسی اختیار سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ ہے۔ آپ تشریف تو لایئے۔ وہ آپ کے لیے کچھ اور امراض تصنیف کیے بیٹھے ہوں گے۔

حکیم: بسم اللہ۔

(دونوں جاتے ہیں۔ ذرا سے وقفے کے بعد خان بہادر کی آواز آنا شروع ہوتی ہے)

خان بہادر: نسخے میں صاف لکھا ہے کہ مربہ سیب درورق نقرہ پیچیدہ اوّل بخورند اور مجھ کو پلا دی گئی پہلے دوا۔ گویا جو چیز اوّل بخورندنی تھی وہ عقب ان ہو گئی۔ خوب ہو رہی ہے ہماری تیمار داری۔ اب نہ جانے اس کا کیا نتیجہ ہو۔

نجمہ: غلطی تو ضرور ہو گئی۔ مگر یہ کوئی اتنی پریشانی کی بات نہیں ہے ابو جان۔

خان بہادر: اے بیٹا! بیمار کے لیے اتنی ہی سی بات بہت ہوتی ہے۔ دیکھ رہی ہو میری حالت۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ اور وہ کیا ہوئی معجون!

نجمہ: اس کی دوائیں کوٹی جارہی ہیں۔ چٹنی بھی تیار ہے۔ لعوق بھی بن گیا ہے۔

خان بہادر: ذرا دیکھنا بیٹی میرا جسم تو گرم نہیں ہے آنکھیں کچھ جل سی رہی ہیں سانس کی ہوا بھی گرم ہے۔

نجمہ : نہیں ابوجان ۔ جسم تو اچھا ہے۔
خان بہادر : مگر تمہاری ہتھیلیاں کیوں جل رہی ہیں۔ دکھانا ذرا۔ ہوں ہوں۔ دوسرا ہاتھ دو۔ ٹھیک ٹھیک ۔ ضرور حرارت ہے۔ جسم گنگنا ہو رہا ہے چہرہ بھی تمتایا ہوا ہے۔ حکیم صاحب آئیں تو نبض دکھا دینا۔ آیئے حضور یاد ش بخیر بھئی بڑی عمر ہے۔ نام لیا ہی تھا کہ تشریف لے آئے۔
حکیم : کہیے حضور مزاج مبارک۔ کیا حال رہا۔
خان بہادر : میرا حال تو بعد میں پوچھیے گا۔ پہلے زرا صاحب زادی کی نبض دیکھیے۔ میرے خیال میں حرارت ہے اور بخار کی آمد آمد ہے، آنکھوں کا اضمحال اور چہرے کی بھر بھراہٹ بھی ملاحظہ فرمایئے۔
حکیم : دکھانا بیٹی زرا اپنی نبض ۔
بیگم : چھوڑیئے بھی حکیم صاحب اچھی خاصی ہے۔ یہ ان کو اپنے متعلق بھی طرح طرح کے تنک گھیرے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی وہم میں بتلا کرنا چاہتے ہیں۔
خان بہادر : کمال کرتی ہیں صاحب آپ بھی یعنی میں کہہ رہا ہوں کہ لڑکی بیمار ہے اور آپ فرماتی ہیں۔ وہم ہے۔ آخر مجھ کو بھی کچھ نہ کچھ تجربہ تو ہے ہی جو شخص اتنے دن سے بیمار ہو وہ خود بھی چھوٹا موٹا طبیب تو ہو ہی جاتا ہے۔ کیا رائے ہے حکیم صاحب۔
حکیم : بجا فرمایا غریب پرور۔ صاحب زادی کے چہرے پر علالت کی تمام علامتیں موجود ہیں۔ کیوں بیٹی نزلے کی تحریک تو نہیں ہے۔ مثلاً چھینکیں یا گلے میں کچھ سرسراہٹ۔
نجمہ : جی نہیں۔ مجھے اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ آپ ابوجان ہی کو دیکھیے۔
خان بہادر : اب ہوگی بھی کوئی شکایت تو وہ ظاہر تھوڑی کرے گی۔ ماں کی نگاہیں پہچانتی ہے۔ اس کو اپنی عافیت تھوڑی خطرے میں ڈالنا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ یہی چھوٹی چھوٹی شکایتیں بڑھ کر مہلک امراض کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔
حکیم : درست فرمایا غریب پرور۔ اگر ان کی معمولی شکایات کا ابتدا ہی میں سدّباب ہو جایا کرے تو علالت طوالت اختیار نہ کرے۔
بیگم : حکیم صاحب! آپ اس قصے کو چھوڑیئے۔ فی الحال آپ ان کا حال سنیے۔

اوران ہی کا معائنہ فرمائیے۔ کل ڈاکٹر اکبر نے ان کو دیکھ کر آپ کی تشخیص سے اختلاف کیا ہے۔

خان بہادر: جی ہاں۔ وہ صاحب زادے بھی عجیب اناڑی نکلے۔ میں تو سمجھا کہ اتنے دنوں تک میڈیکل کالج میں پڑھا ہے۔ دو تین سال فیل ہو کر پاس ہوا ہے۔ پھر ولایت گیا ہے اور اب پریکٹس بھی اچھی خاصی کر رہا ہے۔ کچھ نہ کچھ جانتا ہی ہوگا مگر وہ تو سخت جاہل ہے اور بے وقوفی میں بھی بالکل اپنے آپ کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔

بیگم: محض اس لیے کہ اس نے تمہاری ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ اس نے تمہارا معائنہ کر کے اپنی صحیح رائے دے دی۔

خان بہادر: خیر آپ کا قصہ تو یہ ہے کہ گھٹنے پیٹ کی طرف جاتے ہیں وہ آپ کا بھانجا ہے۔ اس لیے اس کی جہالت بھی آپ کے نزدیک بڑی چیز ہے اور اگر میرے گھٹنے بھی پیٹ کی طرف گئے تو مجھ کو یہ غور کرنا پڑے گا کہ میں اپنی لڑکی اس جہلِ مرکب کے حوالے کروں یا نہیں۔

بیگم: جہلِ مرکب وہ اسی لیے تو ہے کہ اس کے نزدیک تم کو وہ بیماریاں نہیں ہیں جو تمہارے خیال میں تم کو ہیں۔

خان بہادر: بھئی حکیم صاحب۔ یہ کمال دیکھیے اُن صاحب زادے کا کہ میں نے اُن کو کہا کہ مجھ کو حرارت ہے۔ وہ تھرما میٹر لگا کر اس نتیجہ پر پہنچے کہ گویا میں جھوٹا ہوں اور وہ شیشے کا سوا روپے والا قلم جس میں پارے کا ایک قطرہ اِدھر اُدھر ٹہلا کرتا ہے میرے مقابلے میں سچا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا سر بھاری بھاری سا رہتا ہے۔ ان حضرت نے ایک صندوقچہ کھول کر ایک سیاہ پٹی باندھی میرے بازو پر اور ایک پھُکنا دبانا شروع کیا اور آخر میں کہہ دیا کہ بلڈ پریشر بھی ٹھیک ہے سر کی شکایت کی تو بازو پر پٹی باندھی اور صندوقچے کے ہندسوں سے نتیجہ نکال لیا۔ اس کو کہتے ہیں ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ ایسے چُغد کو میں اپنی لڑکی دے کر اس کی زندگی تباہ کروں گا۔ ناممکن۔

حکیم : عجیب تشخیص ہے یہ تو غریب پرور۔ خیر چھوڑیئے اس قصے کو۔ یہ فرمایئے کہ رات کو نیند کیسی آئی۔

خان بہادر : ویسے تو میں خوب سویا مگر جو شخص رات بھر سوتے میں بیداری کے خواب دیکھے۔ وہ کچھ تھک ضرور جاتا ہے۔ چناں چہ صبح جو میں بیدار ہوا تو معلوم ایسا ہوتا تھا حکیم صاحب کہ گویا رات بھر سفر میں رہا ہوں۔

حکیم : وہ خستگی تو میں آپ کے چہرے پر بھی دیکھ رہا ہوں۔

بیگم : بالکل غلط۔ مجھے تو کوئی خستگی نظر نہیں آتی۔ اچھا خاصا بشاش چہرہ ہے۔ ڈاکٹر اکبر کی رائے پر عمل کرکے اگر صبح غسل کیا ہوتا اور ہوا خوری کو گئے ہوتے تو طبیعت اور بھی چاق ہوتی۔

خان بہادر : صاحب آپ کے ڈاکٹر اکبر کی رائے پر عمل تو میں جب کرتا۔ اگر مجھ کو ان پر اعتقاد ہوتا۔ آپ کو کیا معلوم کہ کل میں نے اُن صاحب زادے کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے۔ میرے خیال میں تو اس نے ڈاکٹری کو دوں دے کر پڑھی ہے۔ اُسے معلوم ہی نہیں کہ کس مرض کا سر کدھر ہوتا ہے اور دُم کدھر ہوتا ہے۔ بہرحال تو میں یہ عرض کر رہا تھا حکیم صاحب کہ صبح کچھ مضمحل زیادہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناشتہ بھی حسبِ دلخواہ نہ کرسکا۔

بیگم : حکیم صاحب مجھ سے سُنیئے۔ ناشتے میں حسبِ معمول دلیا اور دودھ تھا۔ پھر دو تلے ہوئے انڈے۔ دو مکھن لگے ٹوسٹ جن پر جیلی بھی خاصی مقدار میں چپڑی گئی تھی اور دو چائے کی پیالیاں اور آخر ناشتہ کس کو کہتے ہیں۔

خان بہادر : ارے بھئی حکیم صاحب نے خود فرمایا ہے کہ پرندوں کا گوشت ناشتے میں کھایا جاسکتا ہے۔ بھُنے ہوئے گردوں کی بھی اجازت دی ہے۔ بہرحال تو جناب والا اس ناشتہ کے بعد ہی کچھ اختلاج کی سی کیفیت محسوس ہوئی تو میں نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین گلاس مالٹوں کے رس پیے۔

بیگم : اور وہ چٹنیاں، معجونیں، لعوق، مُربّے اور حریرے الگ سے استعمال کیے جو حکیم صاحب نے دوا کے طور پر بتائے ہیں۔

خان بہادر : خیر خیر ـــــ یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات ـــــ

تو میں یہ عرض کر رہا تھا حکیم صاحب کہ اب کھانے کا وقت قریب ہے مگر بھوک کا جیسے کوسوں پتہ نہیں۔ مجھے تو اب یہ شبہ ہو گیا ہے کہ میرے پیٹ میں معدہ ہے بھی یا نہیں۔ اور ہاں صاحب صبح سے ایک عجیب شکایت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پیر سو جاتا ہے یہ فالج کا مقدمہ تو نہیں ہے حکیم صاحب۔

بیگم : جب چوبیس گھنٹے پڑے رہو گے تو اور کیا ہو گا۔

خان بہادر : صاحب یہ عجیب مصیبت ہے۔ جو بات میں حکیم صاحب سے کرتا ہوں جواب آپ دیتی ہیں۔ ان کو بھی تو کوئی رائے قائم کرنے دیجیے۔ یہ پیر کا سُن ہو جانا یا سو جانا معمولی بات نہیں ہے۔ مجھے تو بڑا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

حکیم : ہے بھی خطرناک بات۔ میں اس کی رعایت نسخے میں کر دوں گا اور آپ بھی پرندوں میں کبوتر کا اضافہ کر دیجیے۔

(موٹر کار کے رکنے کی آواز)

بیگم : ارے دیکھیو۔ میرا خیال ہے اکبر میاں آئے ہیں۔ انھیں یہاں لے آؤ۔

لڑکی : بہتر

حکیم : تو میں اب اجازت چاہوں گا۔

خان بہادر : نہیں صاحب۔ آپ تشریف رکھیے۔ آنے دیجیے ان صاحب زادے کو ایسے ایسے لونڈوں کو خاطر ہی میں کون لاتا ہے۔ کہاں آپ کا ایسا طبیب حاذق کہاں وہ کل کا چھوکرا۔ اور میں نے کہا سن لیجیے بیگم صاحبہ میری طرف ان صاحب زادے کو متوجہ نہ فرمایئے گا۔ ورنہ آج میں ان کی قلعی کھول کر رکھ دوں گا آیا وہاں سے ڈاکٹر بن کر۔

بیگم : خدا کے لیے اب اس کے منہ پر نہ کچھ کہہ بیٹھنا۔ سُن لے تو وہ بھی کہے کہ خوب قدر ہو رہی ہے۔ ہونے والی سسرال میں۔

خان بہادر : خیر یہ تو ابھی غور طلب مسئلہ ہے۔

(دستک)

نجمہ : (دروازے کا کواڑ کھولتے ہوئے) تشریف لائیے۔

اکبر : السلام علیکم۔ مزاج کے متعلق اگر کچھ فرمانا ہو تو فرما دیجیے۔
نجمہ : مجھے مزاج کے متعلق تو نہیں۔ البتہ اور کچھ عرض کرنا ہے اور سنجیدگی سے عرض کرنا ہے۔
اکبر : بالکل ٹھیک۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان اب سنجیدہ گفتگو عام طور پر ہوا کرے۔ وہ کھلنڈرے پن کا زمانہ گیا۔ اب بقول خالہ جان کے اللہ رکھے ہم دونوں سمجھ دار ہیں۔
نجمہ : میں تو خیر ہوں سمجھ دار۔ مگر فریق ثانی کی طرف سے مجھے شبہ ہے۔
اکبر : فریق ثانی ؟ ——— وہ تو ——— وہ تو غالباً میں ہوا۔
نجمہ : غالباً نہیں بلکہ یقیناً آپ ہی ہیں اور آپ ہی کی عقل سلیم کی طرف سے مجھ کو شبہ ہے۔ میں یہ پوچھتی ہوں کہ جناب کو ابو جان کی تشخیص میں اپنی قابلیت بگھارنے کی کیا ضرورت تھی۔
اکبر : قابلیت ؟ وہ کب بگھر گئی۔ میں نے تو ان کو دیکھ کر یہی بتایا ہے کہ ان کو دراصل کوئی بیماری ہی نہیں ہے۔
نجمہ : جی ہاں ! تو یہ آپ نے کیوں بتایا۔ اتنے دنوں سے آپ ان کے بھانجے بنے چلے آرہے ہیں اور اب تک آپ کو یہ بھی اندازہ نہیں ہوا کہ ان کو بیماری اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ بیمار ہونے کا شوق ہے اور ہر اس شخص سے وہ بیزار ہو جاتے ہیں جو ان کی بیماری میں ذرا بھی شک کرے۔
اکبر : بیزار ؟ تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ وہ مجھ سے بھی بیزار ہو گئے ہوں گے۔
نجمہ : ایسے ویسے بیزار۔ وہ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ اب مجھ کو غور کرنا پڑے گا کہ اس لڑکے کو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو گویا وہ۔
اکبر : داماد بھی بنائیں یا نہیں ؟ یہی نا۔
نجمہ : جی ہاں یہی سمجھ لیجیے۔
اکبر : لاحول ولاقوۃ۔ میرا کیا ہے مجھ سے کہیے میں دو ہزار بیماریاں ان کے لیے تجویز کردوں۔
نجمہ : خیر یہ کام تو وہ خود اپنے لیے کرتے رہتے ہیں۔ اب آج خیال یہ ہو گیا ہے کہ

فالج کے آثار ہیں۔ پیر بار بار سو جاتا ہے۔

اکبر: بس تو ٹھیک ہے۔ وہ معتقد کیا ہوا اپنا کہ وہ نیم حکیم خطرۂ جان بھی منہ دیکھ کر رہ جائے۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔

نجمہ: سنیے تو۔ صبح جب اٹھے ہیں تو کچھ تھکاوٹ بھی تھی اور ناشتہ بھی حسبِ دل خواہ نہیں کیا ہے۔

اکبر: بس بس سمجھ گیا ہیں تم آؤ میرے ساتھ!

(جاتے ہیں خان بہادر صاحب کی آواز رفتہ رفتہ قریب آجاتی ہے)

خان بہادر: رات جو ملازم میرے کمرے میں دودھ لے کر آیا تھا اس کو چھینک آگئی تھی۔ نزلے کی وجہ تو یہی ایک بے ہودگی ہو سکتی ہے۔

حکیم صاحب: درست فرمایا غریب پرور۔ نزلہ چھینک ہی کے ذریعے پھیلتا ہے

اکبر: (داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض کرتا ہوں خالو جان۔ خالہ جان تسلیم۔ اور آپ کی تعریف۔

خان بہادر: یہ میرے طبیب خاص عمدۃ الحکماء حکیم اشرفی صاحب ہیں۔ کیا سوجھ بوجھ ہے اور کیا تشخیص ہے۔

اکبر: (ہاتھ ملاتے ہوئے) میرا نام اکبر ہے۔ بڑی مسرت ہوئی حکیم صاحب آپ سے مل کر۔ صاحب کل میں نے آپ کے مریض کا معائنہ کیا تھا اور چند معمولی شکایات محسوس کر کے بظاہر خالو جان کو مطمئن کر دیا تھا کہ آپ کو کوئی بیماری ہی نہیں ہے مگر میں جو خون وغیرہ ٹسٹ کرنے کے لیے لے گیا تھا۔ اس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مریض سے بیماری چھپانا نہیں چاہیے تاکہ وہ زیادہ احتیاط برت سکے۔

خان بہادر: کیا مطلب۔ گویا آپ کے خیال میں کچھ امراض ہیں نا مجھے؟

اکبر: وہ میں ابھی عرض کرتا ہوں آپ کو دیکھ کر۔ ذرا نبض دیجیے مجھے۔ ہوں۔ ہوں کبھی ایسی کوئی بات تو نہیں ہوئی کہ مثلاً آپ رات کو خوب آرام سے سوئے ہیں مگر صبح اس طرح اٹھے گویا سخت تھکن سی ہو۔

خان بہادر: بالکل۔ بالکل۔ وہ تو ابھی آج ہی ہوا ہے۔ کیوں بیگم حکیم صاحب

کہہ رہا تھا نا۔

: جی ہاں! آپ فرما رہے تھے اور مجھے بھی چہرہ پر خستگی نظر آئی تھی۔

: ٹھیک ہے میرا خیال۔ اچھا یہ بتائیے خالو جان کبھی آپ کے ہاتھ یا پیر سُن تو نہیں ہو جاتے یعنی سو تو نہیں جاتے۔

بہادر : ارے بھئی۔ میں بالکل یہی تکلیف بیان کر رہا تھا ابھی۔

: یہ تو آج ہی ان کو شکایت پیدا ہوئی ہے۔

بہادر: میرا خیال یہ ہے کہ تم اب مرض کی تہہ کو پہنچ گئے ہو۔

: کوئی خطرناک بات تو نہیں ہے اکبر میاں۔

: خالہ جان احتیاط شرط ہے۔ انشاء اللہ خالو جان بالکل تندرست ہو جائیں گے۔ ان کو دو مرض ہیں۔ ایک کا نام انسائیکلو پیڈیا ہے اور دوسرے کا نام کانسٹینٹی نوپل۔

: بجا ارشاد فرمایا غریب پرور۔ میری تشخیص بھی یہی تھی

بہادر: تشخیص تو آپ کی ضرور ہوگی مگر علاج اب میں اکبر میاں ہی کا کروں گا۔ گھر کی مرغی دال برابر ضرور ہوتی ہے۔ مگر کیا سوجھ بوجھ ہے۔ یعنی پیروں کا سُن ہونا سمجھ گئے۔ صبح کا اضمحلال سمجھ گئے۔

: آپ اطمینان رکھیے۔ میں ابھی آپ کے لیے دوا منگواتا ہوں خالہ جان! آپ زرا میرے ساتھ آیئے۔

: میں گویا اب اجازت چاہتا ہوں۔

بہادر: (بلند آواز سے) ارے بھئی حکیم صاحب کی فیس بھی بھیج دینا بیگم۔

(دور سے) بھیجے دیتی ہوں (آہستہ آواز میں) اکبر میاں یہ ان کو آخر ہو کیا گیا ہے۔

: چپ بھی رہیے خالہ جان۔ کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ وہم کا علاج اسی طرح ہوتا ہے۔ مجھ سے جو حال سُنا تھا، وہ ان پر ظاہر کر دیا وہ معتقد بھی ہو گئے اور میری ساکھ بھی قائم ہو گئی اور رشتہ بھی گڑبڑ نہیں ہوا۔

: تو یہ ہے میرا تو دم ہی نکال لیا تھا تم نے۔ مگر تم نے ٹھیک کیا ان کا علاج یہی

یہ ہے۔ بھٹہرد میں حکیم صاحب کو فیس تو بھیج دوں۔

بر: بھیجیے یا نہ بھیجیے (آہستہ سے) میں نے تو اپنی فیس وصول کر لی کیوں نجمہ؟

مہ: چپ بھی رہیے گا کہ نہیں ــــــ شرم نہیں......

بر: (بات کاٹ کر) شرم کس کی؟ تمھاری؟ اس کا بھی علاج کرنا پڑے گا مجھے ــــ بھٹہردا!"

(ہنستا ہے۔)

("کمی کمی" حوالہ صفحات: ۱۱۹ تا ۱۳۴)

شرابِ کہنہ

راسخ

۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۸ء ——— ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء

شیخ غلام علی نام، راسخ تخلص مولد و مدفن عظیم آباد (پٹنہ، بہار) پہلے عشق (معاصر میر و سودا) اور شرر کو کلام دکھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد میر کے ایسے قائل اور گرویدہ ہوئے کہ دہلی جاکر ان سے ملے۔ بغرض اصلاح اپنا دیوان پیش کیا، میر صاحب نے جستہ جستہ اُسے دیکھ کر فرمایا "تم سمجھ بوجھے آدمی ہو، تم کو اصلاح کی کیا ضرورت" شیخ صاحب نے پھر اصرار کیا تو دو چار جگہ قلم لگا کر اپنا دیوان عنایت کرکے بولے "بھی تمھاری اصلاح کیا کرے گا"۔ اس عزت افزائی پر راسخ زندگی بھر نازاں رہے اور میر سے اپنی وابستگی اور تعلق کا متعدد مقطعوں میں اظہار کیا ہے۔

تقریباً ساٹھ برس کی عمر تک کلکتے، غازی پور، لکھنؤ اور دہلی کی سیاحت کے بعد وطن آکر مقیم ہوگئے۔ عظیم آباد ان دنوں ارباب کمال کا مرجع سخن وروں اور سخن شناسوں کا مرکز تھا۔ راسخ کو فضا ساز گار آئی پھر مرتے دم تک کہیں جانے کا سوال ہی نہ رہا۔

راسخ ایک صوفی منش اور آزاد سرشت انسان تھے، بے نیازی کا یہ عالم کہ ساری زندگی کرائے کے مکان میں رہے، بزرگان دین سے خاص عقیدت تھی، اکثر ان کے مزارات پر جاکر اپنا کلام پڑھا کرتے تھے۔ موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ مشہور ہے کہ جب تک شعروں سے دل گداز نہ ہوجاتا شعر نہ کہتے۔ مشاعروں میں دو زانو ہو کر بیٹھتے اور آنکھیں بند کیے جھوما کرتے، شعر خوانی کے درمیان واہ واہ کرنا مشاعرے کے آداب کے خلاف سمجھتے مشاعرہ ختم ہوجاتا تب شعرا کی ہمت افزائی کرتے اور داد و تحسین کے کلمات سے نوازتے۔ اپنی غزل سناتے وقت آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا، چار پانچ شعر سے زیادہ نہ پڑھ سکتے۔

سنہ ۱۸۹۳ء میں پٹنے سے کلیات شائع ہوا تھا، تمام اصناف سخن میں کلام موجود ہے، مثنوی کی زبان میر کی سی ہے، غزلوں میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے، زبان صاف اور سادہ ہے، مضامین پاکیزہ اور طرز بیان سلیس ہے۔

انتخاب

شاگرد ہیں ہم میر سے اُستاد کے راسخ
استادوں کا استاد ہے، اُستاد ہما

لاگ اس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ آہ
کانٹا سا کچھ جگر بیں ہے اپنے چبھا ہوا

دکھ سہے ترک جو نظارۂ دل دار کیا
آہ پرہیز نے دونا ہمیں بیمار کیا

جوانی ہنس کے کاٹی اب پلک پر اشک چمکے ہے
جو رات آخر ہوئی نکلا ستارہ صبح پیری کا

تھا جی میں کہ دشواریٔ ہجر اس سے کہیں گے
پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آ

سونپا ہوا داغ ان کا تازہ ہی سدا رکھا
ہم نے اس امانت کو چھاتی سے لگا

دور میں اس کی مست آنکھوں کے
محتسب بھی شراب خوار ہوا

راسخ کو ہے میر سے تلمذ
یہ فیض ہے ان کی تربیت کا

صورت ہمارے حال کی بگڑی سی دیکھ کر
قاصد نے ان کے آنے کی دل سے بنا

اپنا بھی ماجرائے دل، اک مرثیہ سا ہے
بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیا

شیخ اس بت شکنی پر نہ ہو نازاں اتنا — تو نے توڑا نہیں اپنا بتِ پندار ہنوز

بازارِ جہاں میں کوئی خواہاں نہیں تیرا — لے جائیں کہاں اب تجھے اے جنسِ وفا ہم

گھر سے کھو کر در پہ اپنے بیٹھنے دیتے نہیں — تم جو کہتے ہو کہ جا، یاں سے میں اب جاؤں کہاں

ملتا ہوں ان کے حسرتِ پابوس میں جو ہاتھ — کہتے ہیں بیٹھے ہاتھ تم اپنے ملا کرو
راسخ علاقہ دل کا نہ ہو دل بروں کے ساتھ — تم اہلِ دل ہو حق میں مرے یہ دعا کرو

اگر بابِ اجابت تک رسا اپنی دعا ہوتی — تو جی میں تھا کہ خواہانِ دلِ بے مدعا ہوتے

آہ عالم کی ہم اس وضع سے حیران ہوئے — دشت یاں شہر ہوئے، شہر بیابان ہوئے

وقت چلنے کے علاقوں کی خلش تا نہ رہے — اس لیے جی کو ہر اک شے سے اٹھایا ہم نے
خواہشیں جمع تھیں دل میں سو کیا ان کو وداع — کوچ سے آگے ہی سامان لٹایا ہم نے

نئی مطبوعات

اُردو اسپیکنر (مضامین)	سید ظہیر الدین مدنی	دہلی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۱۹۲	۳/-
چٹانوں کی کہانی (معلومات)	محمد امین ایم، اے	" " " "	۷۶	۱/۷۵
تجلیات کعبہ (بابت حج)	مولانا احتشام الحسن	" کتب خانہ انجمن ترقی اُردو	۳۶۲	۳/-
" مدینہ (" ")	" " "	" " " "	۲۵۶	۲/۵۰
زلفی (ناول)	زبیدہ خاتون	" اُردو مرکز	۲۸۰	۶/-
کالا پانی (سوانح)	مولانا جعفر تھانیسری	" " "	۱۶۰	۳/-
خونِ شہید (ناول)	شوکت صدیقی	" " "	۲۸۰	۶/-
خلائی جہاز (معلومات)	ہیگرٹی جونیر	" انڈین اکیڈمی	۱۳۴	۲/-
فانوس (ناول)	خورشید عالم زبیری	" کوہ نور پبلیکیشنز	۲۲۸	۴/-
فاخرہ (")	رئیس احمد جعفری	" سکینہ پبلشنگ ہاؤس	۳۶۰	۶/
کمی کمی (ڈرامے)	شوکت تھانوی	" نیو تاج آفس	۱۷۶	۴/-
تصریحاتِ آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد	" تاج اردو اکیڈمی	۱۶۰	۳/۵۰
مرزا غالب کی شوخیاں	مولانا عبدالباری آسی	لکھنؤ، مکتبہ دین و ادب	۲۶۴	۴/-
ادبی تاثرات (تنقید)	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	" ادارہ فروغ اُردو		۴/۵۰
پھول اور چراغ (مجموعہ کلام)	شفیق جون پوری	جونپور شیراز ہند پبلشنگ	۵۷۶	۷/-
حضرت حسن ابن علی رض	سلام اللہ صدیقی	وارانسی مکتبہ اسلامی ادب		
" حسین " "	" " "	" " "		
		" مجلس ادب		
شرارحیات (غزلیات)	قیصر الغائری			
ہائیڈروجن بم کے بعد (نیا ایڈیشن)	کرشن چندر	دہلی ایشیا پبلشرز	۱۸۴	۳/۵۰
گیہوں اور گلاب (")	" "	" " "	۲۲۴	۴/۵۰
تری آنکھیں	سہیل مراد آبادی	نئی دہلی، جیبی بکڈپو	۴۳	/۷۵

زیر طبع

ماہنامہ "سروج" انڈوپاک مشاعرہ نمبر پتہ: پوسٹ بکس ۲۵۳، دہلی ۶ ۱/-

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

مکاتیب امیر مینائی

(سن اشاعت جون ۱۹۶۴ء)

مرتبہ: احسن اللہ خاں ثاقب
صفحات: ۳۴۷ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: پانچ روپے
ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

منشی امیر احمد مینائی ایک پختہ مشق اور مشہور و مقبول شاعر تھے ہی، اس کے علاوہ ان کی ذات گرامی اور بہت سے ادبی کمالات اور دانش ورانہ اوصاف کا مجموعہ تھی۔ شاعر، ادیب، زبان داں اور محقق ہونے کا ثبوت ان کی متعدد اور مختلف النوع تصانیف اور تالیفات میں محفوظ اور موجود ہے، اسی کے ساتھ بحیثیت انسان بھی وہ ایک نہایت لائق احترام بزرگ تھے۔ اور ان کی یہ تمام صلاحیتیں اور صفتیں ان کے خطوں میں بہ آسانی نظر آسکتی ہیں۔ جسے ان کے ایک سچے قدرداں اور لائق شاگرد مولوی احسن اللہ ثاقب نے مکاتیب امیر مینائی کے نام سے جمع کرکے شائع کیا۔

حضرت امیر نے اپنے وسیع تعلقات اور مراسم کے تحت سینکڑوں خط لکھے ہوں گے مگر ثاقب صاحب کی تمام امکانی کوششوں کے باوجود ان کو صرف ۲۶۰ خط دستیاب ہوسکے، مرتب کی یہ شکایت کہ اس معاملے میں لوگوں نے ان کے ساتھ کماحقہ تعاون نہیں کیا، بے جا نہیں۔ بہرحال جتنے بھی خط اس مجموعے میں ہیں ان سے لکھنے والے کی سیرت اور علمیت کے سب ہی پہلو سامنے آجاتے ہیں۔

خطوں کی تعداد کی کمی مرتب نے اپنے فاضل استاد کی سوانح عمری، تصنیف و تالیف، تلامذہ، طریقہ اصلاح اور پھر ان کی نظم و نثر پر تنقید و تبصرہ کرکے پوری کردی ہے اور اس طرح یہ کتاب محض مکتوبات ہی کا ایک مجموعہ نہیں بلکہ

مفتی صاحب مرحوم و مغفور کو سمجھنے اور پرکھنے کا بھی ایک ذریعہ اور وسیلہ بن گئی ہے
پہلی بار ۱۹۱۰ء میں یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی تھی اور ملک کے بعض مقتدر اور نام آور ادیبوں اور شاعروں نے اس کا جی کھول کے خیر مقدم کیا تھا، مولانا حالیؔ، مولانا سیفی، شاد عظیم آبادی، نظم طباطبائی، محسن کاکوروی اور حسرت موہانی وغیرہ نے ثاقب صاحب کی اس خدمت کو نہایت خلوص کے ساتھ سراہا ہے۔ ان میں سے کئی ایک بزرگوں نے توصیف کے ساتھ ساتھ تنقید کا بھی حق ادا کیا ہے اور جہاں جہاں مرتب کا قلم جادہ اعتدال سے ہٹا ہے اسی طرف توجہ بھی دلائی ہے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں کچھ ترمیم و اضافے کے بعد "مکاتیب امیر مینائی" کو مرتب نے دوسری بار شائع کرایا، قدر افزائیوں کی مستحق تو شروع ہی سے یہ کتاب رہی اور اب یہ تیسرا اڈیشن ہے جس کی طباعت و اشاعت کا سہرا نسیم بک ڈپو کے سر ہے یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ ابھی ہندوستان میں اردو کے قدردان موجود ہیں اور ان کو ایسی بیش بہا چیزوں کی تلاش اور ضرورت رہتی ہے۔

(رشید نعمانی)

※

کیف و کم

(سن اشاعت سنہ ۱۹۶۴ء)

از: یوسف ناظم
صفحات: ۱۷۶ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: تین روپے
ناشر: میرا اینڈ کمپنی، اردو بازار دہلی

ان دنوں مزاح نگاری کے نام پر بہت کچھ زباں درازی ہو رہی ہے۔ بالخصوص نظم میں۔ اور بیشتر خامہ فرسائی ڈھول میں لٹھ مارنے کے مصداق ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ "کیف و کم" کے مصنف نے اپنے قلم کو بڑے محتاط طریقے سے جنبش دی ہے اور بڑی حد تک اپنے آپ کو فضول گوئی سے بچا لیا ہے۔ ان کے یہاں نہ الفاظ کا گورکھ دھندا ہے اور نہ نت نئی ترکیبوں اور بندشوں کا جال۔ یوسف ناظم کا مزاح صورتِ حال سے پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے ایک آدھ مصو

صورت چلنے سے کمشن میں جگاری ڈال کر الگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے موضوعات کے لیے پرستارانِ سیاست، پاسبانِ تجارت یا محافظانِ دولت پر ہاتھ صاف کرنا ضروری نہیں سمجھا ہے بلکہ اپنے مزاح کی چاشنی ادب و زندگی سے تیار کی ہے۔ ان کے بیس مضامین کے اس مجموعے میں قواعدِ اردو، گفتگو، شعر گوئی، ناخلف اشعار، جیسے عنوانات بھی ہیں اور گرہست شاستر، بارات، اشتہار بازی اور کالونی نامہ بھی۔ قواعدِ اردو میں ذرا حرفِ صحیح کی تعریف ملاحظہ ہو!

حرفِ صحیح ایسے حروف ہیں جن کی صحت اچھی ہے۔ واؤ، الف اور ی کے علاوہ 'الف' 'ب' کی تختی کے سارے حروف صحت مند ہیں حتیٰ کہ ننھی سی جان والا ہمزہ بھی۔ ہمزہ کی مثال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حکما نے یہ کلیہ بنالیا ہے کہ صرف جسم کا مٹاپا ہی صحت کی نشانی نہیں۔ لاغر اور منحنی قسم کے لوگ بھی تندرست ہو سکتے ہیں اور مقابلے کے امتحانوں میں حصہ لے سکتے ہیں۔" اب گرہست شاستر، میں شادی کی بابت بھی سن لیجیے۔

"شادی ہر قید سے آزاد اور ہر شرط سے پاک ہے۔ شادی کے لیے دنیا میں پیدا ہونا اور پیدا ہو کر جوان ہونا بہت کافی ہے۔ بعض صورتوں میں شادی کے لیے جوان ہونے کی شرط بھی غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔"

یہاں یوں تو بات میں اپنی لطافت موجود ہے لیکن دونوں اقتباسات کے آخری جملوں کی دبی ہوئی چنگاریوں کے آتش گیر مادّے کی شدّت کا اعتراف کیے بغیر بھی نہیں رہا جا سکتا۔

آپ جانتے ہیں کہ بڑے بڑے شہروں میں 'تتمّے' کے طور پر 'کالونی' آباد ہوتی رہتی ہیں اور آج کل اس دھندے کا سہالگ ہے۔ یوسف ناظم کیسے اس طرف توجہ نہ فرماتے۔ اپنے 'کالونی نامہ' میں رقمطراز ہیں کہ "کالونی جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس مقام کو کہتے ہیں جہاں چند مکانات ہوں اور بکثرت لوگ رہتے ہوں۔ ..... کالونی عموماً ایسی جگہ بنائی جاتی ہے جہاں سڑک وغیرہ کا نام و نشان تک نہ ہو، سہولت کی خاطر مکانات پہلے بنا دیے جاتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ دکانیں، بازار اور بعد میں سڑکوں کی تعمیر ہوتی ہے۔" اس پورے مضمون میں نہ صرف طنز و مزاح کا رچا بسا مذاق موجود ہے بلکہ حقیقت پسندی اور ندرت بینی کا ثبوت بہم پہنچا دیا گیا ہے۔ یہاں پر شائستہ اور

ضبطِ تحریر کا بھی ایک نمونہ دیکھتے جایئے۔ کالونی کے شب و روز کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ایک صاحب بالکونی میں اپنی کرسی میں بحالتِ نیم برہنگی یوں بیٹھتے ہیں کہ پشت تو آپ کی کرسی پر ہوتی ہے لیکن ٹانگیں بالکونی کے کٹہرے پر۔ اگر آپ ان کی طرف دیکھیں تو بہت دور تک دیکھ سکتے ہیں۔ موصوف نیت کے صاف ہیں صرف عادت سے مجبور ہیں"۔ یوسف ناظم کا مضمون سالانہ رپورٹ، بھی اس دفترشاہی فرمان کی رسمی نوعیت پر بھرپور طنز ہے۔ ناخلف اشعار، اور "گفتگو" میں زبان اور لطفِ زبان دونوں ہی معرضِ بحث میں آگئے ہیں۔ لیکن کہیں بھی انہوں نے بلند آہنگی اور چیرہ دستی سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کی تحریر ایک مہذب اور کشادہ ذہن کی دین ہے۔

"کیف وکم" کا پہلا مضمون 'مرزا غالب کی صحت جسمانی' ہے۔ یہاں پر غالب کے بعض اشعار سے بات نکالی گئی ہے اور اپنا لطف رکھتی ہے۔ اس مضمون کی تمہید اس شعر سے کی گئی ہے۔ تنگ دستی اگر نہ ہو غالبؔ ــــ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ لیکن یہاں پر یوسف ناظم سے چوک ہو گئی ہے۔ یہ شعر غالب کا نہیں سالک کا ہے۔ اور اپنی مشتبہ حیثیت کی بنا پر ان کے ناخلف اشعار میں با آسانی شمار کیا جا سکتا ہے۔

یوسف ناظم کے بارے میں کرشن چندر کا خیال ہے کہ "اختصار کے فن میں وہ پطرس کے قریب ہیں اور اپنے اسلوب کے مزاج کے اعتبار سے رشید احمد صدیقی کے طرف دار نظر آتے ہیں"۔ 'کیف وکم' کے مطالعے کے بعد کرشن چندر کے اس بیان کی تائید میں مطلق تکلف نہیں ہوتا۔ کتابت و طباعت معمولی ہے۔

(عبداللہ ولی بخش قادری)

⁂

خلافت بنی امیہ

مصنف: مولوی رشید الوحیدی
صفحات: ۱۳۶ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت: ایک روپیہ ۲۵ پیسے
ناشر: قومی کتاب گھر نزد دارالعلوم دیوبند

مصنف کے بڑے بھائی مولوی فرید الوحیدی صاحب نے مدرسوں اور اسکولوں کے طالب علموں کے لیے تاریخ اسلام کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ سیرتِ نبویؐ

اور سوانح خلفاء راشدین کی اشاعت کے بعد وہ حجاز چلے گئے ان کی عدم موجودگی میں اس سلسلہ کی تکمیل ان کے چھوٹے بھائی مولوی رشید الوحیدی صاحب نے اپنے ذمہ لی پیش نظر کتاب انھیں کی تیار کردہ ہے۔ زبان اور بیان کا معیار تقریباً وہی ہے جو اس سے پہلی جلدوں کا تھا۔ پوری کتاب ۲۴۲ اسباق میں تقسیم کی گئی ہے اور ہر سبق کے آخر میں سوالات کے ذریعے واقعات یاد کرانے کی کوشش کی گئی ہے امید ہے کہ اس سے طلبہ کو فائدہ پہونچے گا۔

(مولانا) عبدالسلام قدوائیؒ

٭

سرشار ایک مطالعہ

(سن اشاعت ۱۹۶۴ء)

مرتبہ: پریم پال اشک
صفحات: ۲۸۸ سائز $\frac{20\times30}{16}$
قیمت: پانچ روپے
ناشر: آزاد کتاب گھر، اردو بازار دہلی ۶

سرشار اور ان کے فن پر کئی ایک کام ہوئے لیکن مستقل موضوع کی حیثیت سے نہیں۔ حالانکہ یہ موضوعات مستقل موضوع بننے کی بڑی گنجائش رکھتے تھے۔ کیا سرشار کی شخصیت اور زندگی، کیا سرشار کا اسلوب اور طرز، کیا سرشار کی تصانیف کا سماجی اور تہذیبی پس منظر ـــــ ایسے موضوعات ہیں کہ ان پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے کیوں کہ ان میں سے ہر ایک موضوع اتنی وسعت رکھتا ہے کہ اس میں ایک دنیا سمائی ہوئی معلوم ہوتی ہے جناب پریم پال اشک کی کتاب "سرشار ایک مطالعہ" کئی پہلوؤں کو دامن میں لیے ہوئے ہے۔ اس کی تقسیم ابواب بھی وہی ہے جو عام طور سے ہوتی ہے کوئی باب غیر معمولی نہیں ہے اگرچہ انہوں نے ان ابواب میں بڑی دیدہ ریزی اور نہایت کاوش سے کام لیا ہے پھر بھی کہیں کہیں ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے، اگر وہ اپنے اس مقالے میں ضمیمہ (مثنوی تحفۂ سرشار۔ قصیدہ طوفان سرشار اور قصیدہ فارسی کے شامل نہ کرتے تو کتاب کی اہمیت میں کوئی فرق نہ پڑتا اور اگر وہ اس ضمیمے کو بھر پور مقدمے کے ساتھ الگ سے ترتیب دے دیتے تو ایک کام ہوجاتا بلکہ ممکن تھا کہ کچھ اور گوشے کھلتے۔

سرشار کی شخصیت اور فن سے متعلق پنڈت بشن نرائن در اور چکبست کے علاوہ کئی اچھے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اور کئی ناقدین نے اپنی دوسری تصانیف میں سرشار اور ان کے شاہ کار" فسانۂ آزاد" کا نہایت شعوری ڈھنگ سے مفصل تذکرہ کیا ہے مجاہے یہ کتنے ہی ناکافی اور قلیل ہوں لیکن اس میں بڑی کام کی باتیں کہی گئی ہیں، اگر اشک صاحب کچھ ایسا کر دیتے کہ ان کی اس کتاب کو دیکھنے کے بعد سرشار کو جاننے کی ضرورت نہ پڑتی تو ان کے کام میں کوئی کمی نہ رہ جاتی۔ اسی وجہ سے یہ مقالہ ایک مطالعہ کے بجائے ایک تعارف معلوم ہوتا ہے، انھیں اتنا تو چاہیے تھا کہ وہ اس میں وہ سب کچھ سمودیں جو سرشار کو ایک مناسب حد تک سمجھنے کے لیے معاون ہو سکتا میں یہ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ یہ مقالہ اس مقصد کو جیسا چاہیے ویسا پورا نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ میں اس رائے میں کچھ شدت سے کام لے رہا ہوں لیکن میں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ ایک کام کو اتنا ہونا ہی چاہیے، کہ اس کے ہیرو کو سمجھنے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

بہرکیف اشک صاحب کا کام مبارک باد کا مستحق ہے اور ان کا اردو ادب سے شغف رکھنے والوں پر احسان ہے کہ انھوں نے اس موضوع کو اتنا ابھارا ہے کہ یہ قابل توجہ اور لائق التفات سمجھا جانے لگا ہے اور امید ہونے لگی ہے کہ وہ یا کوئی اور صاحب اس موضوع کو اور ابھاریں گے اور یہ کارواں چلتا رہے گا۔

(ظفر ادیب)

✻

اردو اسیز

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

قیمت : ۳/-

اس کتاب میں سرسید، حالی، شرر، مولانا آزاد، خواجہ حسن نظامی جیسے مختلف سرِ بلند پایہ ادیبوں کے بائیس "اسیز" شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کتاب کے شروع میں اس فن کی ابتدا۔ اس کی تدریجی ترقی اور پھر ناول نگاری میں اس کے ضم ہو جانے سے متعلق ضروری باتوں سے بھی متعارف کر دیا گیا ہے۔ "اردو اسیز" انشائیہ یا مضمون نگاری پر اپنی قسم کی واحد کتاب ہے

ادیبوں کی اپیل

(حوالے کے لیے اشاریہ ملاحظہ فرمائیں)

"ہم اُردو کے مصنف، ادیب اور شاعر قومی یک جہتی جمہوریت کے اعلیٰ مقاصد اور مشترک تہذیب کے نام پر صدر جمہوریہ سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اُردو کو جو ہندوستان کی چودہ زبانوں میں سے ہے اترپردیش، بہار، پنجاب اور دہلی کے علاقے میں دستور کی دفعہ ۳۴۷ کی رو سے سرکاری زبان قرار دیں اور دوسری ریاستوں میں بھی جہاں اُردو بولنے والوں کی کافی تعداد ہو ابتدائی اور ثانوی تعلیم اُردو کے ذریعہ سے دیے جانے کی ہدایت کریں۔ اور اُردو کے چلن میں سہولتیں بہم پہنچائیں۔

آزادی کے بعد ہمارا خیال تھا کہ جس طرح اور قومی زبانوں کو فروغ ہوگا اسی طرح اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے بھی راہیں کھلیں گی مگر ہمیں یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ کئی ریاستوں میں اُردو زبان کی تعلیم کا مناسب انتظام ہی نہیں کیا گیا ہے اور اس کے چلن کے راستے میں بہت سی رُکاوٹیں ڈالی گئی ہیں۔ ہم یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ روش نہ صرف قومی مقاصد کے خلاف ہے بلکہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی آبادی کے ایک قابلِ لحاظ حصّہ کی شخصیت کی نشوونما پوری طرح نہیں ہو سکتی اور نہ یہ طبقہ ملک کی ترقی اور تعمیر میں بھرپور حصّہ لے سکتا ہے جس کی وجہ سے پوری قوم کا نقصان ہوتا ہے۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے اعداد ہمارے سامنے ہیں اور اگرچہ ہمارے یہ کہنے کے لیے کافی وجوہ ہیں کہ اُردو کے سلسلے میں جو اعداد وشمار شائع کیے گئے ہیں وہ حقیقت کی ترجمانی نہیں لیکن ان اعداد وشمار کے مطابق بھی ہندوستان میں اُردو بولنے والوں کی تعداد ۲،۳۳،۲۲،۰۰۰ ہے جس میں ۸۰ لاکھ اترپردیش میں اور ۴۱ لاکھ بہار میں ہیں۔

اُردو زبان جدید ہندوستانی زبان ہے جو کھڑی بولی سے نکلی ہے۔ اس کی ابتدائی تحریریں پندرھویں صدی سے ملتی ہیں اور تقریباً پانچ سو برس سے اس میں بول چال اور تصنیف کا سلسلہ ہے اس زبان کا ایک شاندار ادب ہے جس میں ہندوؤں مسلمانوں سکھوں، عیسائیوں اور دوسرے فرقوں کے لوگوں نے برابر کا حصّہ لیا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم بھی دی جا چکی ہے۔ اور ہندوستان کمول و عرض میں یہ آج بھی

بھی جاتی ہے۔ جدید ہندوستانی زبانوں کے بولنے والوں میں اس کے بولنے والے پانچویں نمبر پر ہیں۔ اس کے ادب نے زندگی کے ہر موڑ کا ساتھ دیا ہے اور اس میں ہندوستان کی تاریخ، تہذیب، معاشرت اور مزاج کا ہر رنگ ملتا ہے۔ اس نے جنگ آزادی میں بھی ایک ایسا رول ادا کیا ہے جو زبان سے کم نہیں۔ افسوس ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے ایک ایسی قومی زبان کو اس کے قدرتی حق سے محروم کردیا گیا۔

ہمیں یقین ہے کہ صدر جمہوریہ ہماری درخواست پر ہمدردی سے غور فرمائیں گے اور جلد سے جلد دفعہ ۳۴۷ کے تحت اُردو کو اتر پردیش، بہار، پنجاب اور دہلی میں سرکاری زبان قرار دیں گے۔ اور دوسری ریاستوں میں ضروری سہولتیں دیے جانے کی ہدایات کریں گے۔

ادبی خبریں

مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

بنارس ہندو یونی ورسٹی نے اپنے شعبۂ اُردو کے لکچرر جناب حکم چند نیر کو "درگا سہائے سرور، حیات اور شاعری" پر اپنی پچاس سالہ زندگی میں پہلی بار کسی اُردو کے ریسرچ اسکالر کو پی، ایچ ڈی کی ڈگری دینا منظور کیا ہے۔

حکومت روس کی دعوت خصوصی پر ڈاکٹر قمر رئیس، ریڈر شعبۂ اُردو، دلّی یونی ورسٹی) مزید ایک سال کے لیے تاشقند یونی ورسٹی کے اُردو پروفیسر مقرر ہوکر گئے ہیں۔ جہاں کم و بیش سَو طالب علم اُردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

آگرہ یونی ورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ نے ملک کی مختلف زبانوں کے تقریباً گیارہ سو نایاب قلمی مسودات حاصل کیے ہیں۔ یہ سب مسودات ۱۵ویں صدی عیسوی کے عہد تک کے ہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں، پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونی ورسٹی نے سرسالار جنگ ہال نظام کالج کے ایک جلسہ میں کہا کہ اُردو ہندی میں بنیادی طور پر فرہنگ اور رسم الخط کا فرق ہے نیز یہ کہ ہندوستانی تہذیب کی ترجمان ہے۔

سالانہ ایک روپیہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵	فی پرچہ ۱۰ پیسے

پرنٹر پبلشر سید احمد دہلوی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایّام میں

ڈاکٹر سید عابد حسین نے اس کتاب میں وقت کے سب سے اہم اور نازک مسئلے پر قلم اُٹھایا ہے اور حق تو یہ ہے کہ جس خوبی کے ساتھ ان مسائل پر بحث کی ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ مسلمانوں کے مسائل سے دل چسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

سائز $\frac{۱۸\times۲۲}{۸}$ صفحات ۳۶۸

قیمت :۔ آٹھ روپے

عَروسِ نیل

بیگم سُلطانہ آصف فیضی کئی سال مصر میں مقیم رہی ہیں۔ اس کتاب میں آپ نے اپنے مشاہدات کو بہت دل چسپ انداز میں قلم بند کیا ہے۔ پہلا ایڈیشن عرصے سے نایاب تھا۔ اس دوسرے ایڈیشن میں مُصنفہ نے ایک اور مضمون "ڈائری کے چند ورق" کا اضافہ کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کتاب آٹھ تصویروں سے مزیّن ہے۔

سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ صفحات ۲۱۶

قیمت : ۳/۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

Regd. No. D. 58

May, 1965.

Kitab Numa

JAMIA NAGAR, NEW DELHI. 25.

کتاب نما

ماہنامہ

نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

تعلیم پر کتابیں

اُردو اِملا کا آسان طریقہ	عبدالغفار مدہولی	-/۷۵
اصولِ تعلیم	خواجہ غلام السیدین	-/۹
بنیادی اُستاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	۴/۲۵
تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	۳/۷۵
تعلیم دینے کا فن	گلبرٹ ہگٹ	۳/۵۰
چند پروجکٹ	عبدالغفار مدہولی	۲/۵۰
کھیل کے ذریعے تعلیم اوّل	" "	-/۲
" " " دوم	" "	-/۱
ہم کیسے پڑھائیں	ڈاکٹر سلامت اللہ	۳/۵۰
مدرسہ ابتدائی کی کہانی	عبدالغفار مدہولی	-/۲
نظریۂ تعلیم اوّل دوم	قاضی عبدالحمید	۶/۱۲
زندگی کا رُخ	سعید انصاری	-/۲

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

منیجنگ ایڈیٹر
غلام ربانی تاباں

ماہنامہ **کتاب نما** نئی دہلی

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۶ | جون ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۶

اشاریہ

جاننے والے جانتے ہیں کہ بڑوں کے مقابلے میں بچوں کے لیے لکھنا نسبتاً مشکل کام ہوتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھنے والے کو خاص طور سے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھے اور جس عمر کے بچوں کے لیے لکھے وہ اس کے مزاج کے مطابق ہو۔ اسے اس بات کی احتیاط کرنی پڑتی ہے کہ وہ ایسی زبان استعمال کرے جسے بچہ آسانی سے سمجھ سکے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی تحریر کا انداز ایسا ہو کہ بچہ اس کے پڑھنے میں خود دلچسپی لے اور اس طرح تعلیم و تربیت کا جو مقصد اس کے سامنے ہے وہ خود بخود آسانی سے پورا ہو جائے۔

بچوں کی کتابیں تیار کراتے وقت مکتبہ جامعہ کے سامنے بھی ہمیشہ یہی اصول اور یہی مقصد رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری تیار کردہ بچوں کی درسی کتابیں ملک کے بیشتر صوبوں میں سرکاری طور پر منظور ہیں اور اب تک لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکی ہیں۔ ہماری بچوں کی دوسری عام کتابوں کا جن میں مذہب، معلومات، سرکس، تاریخ اور کہانیوں وغیرہ کی کتابیں شامل ہیں، کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے کہ بچے خود ہی انھیں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔

ہم نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی اسی طرح کی کتابیں شائع کی ہیں ابھی اسی سال سیرت پر ہندی میں جو دو نئی کتابیں 'حضرت محمدؐ' اور 'ہمارے نبی' شائع ہوئی ہیں وہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے ہر جگہ بہت پسند کی گئی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ابتدائی درجوں کے اُن بچوں کے لیے تیار کی گئی ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ ان کتابوں کا رسم الخط دیوناگری ہے ویسے زبان عام فہم اردو استعمال کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ عربی کلمات بھی عربی رسم الخط میں دیے گئے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ اہلِ نظر حضرات ان کتابوں کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

نثار احمد فاروقی

میر کا آرٹ

میر نے لکھا ہے کہ شاعری میں جو انداز میں نے اختیار کیا ہے وہ ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ تمام صنائع کو محیط ہے لیکن اسے وہی سمجھ سکتا ہے جو فنِ شاعری پر نگاہ رکھتا ہو۔" میر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی میں سب سے اہم جزو سوزِ دل ہے اس لیے ان کا کلام سمجھنے والے کا بھی سوزِ دل سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ ان کا شعر ہے:

مجکو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اور ایک فارسی مثنوی کے دو شعر ہیں:

دل ز جوشِ درد و غم خوں می کنم   مصرعے آں گاہ موزوں می کنم
رفتہ رفتہ عشقم، غم من وا فراست   ہر کہ شاعر داندم ناشاعر است

میر کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ایک مخصوص مترنم و ملائم لہجے سے جتنی بار پڑھا جائے ایک نیا کیف اور نئی لذت ملتی ہے اور ہر لفظ دل میں کھنچ لیتا ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

یک نگہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اس کے تئیں   اور ہیں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا

اس میں "یک نگہ" کا لفظ ہی نگاہ کے اُچٹتے ہوئے ہونے کی غمازی کر رہا ہے۔ شاعر اس "تیرِ نگاہ" کو بھی محبوب کا نقصان بتاتا ہے پھر یہ کہ اس "یک نگاہ" سے بیش کچھ نقصان اور بھی نہیں ہوا۔ اپنے لیے شاعر نے "بے چارہ" اتنا برمحل استعمال کیا ہے کہ پورے شعر میں جان پڑ گئی ہے۔ جہاں "بے چارہ" کہہ کر اپنی بے بسی اور مسکینی کا اظہار کیا ہے وہیں یہ پہلو بھی نکال لیجیے کہ "زخمی نگاہ" کا چارہ بھی کیا ہے؟ پھر "اے مہرباں" کہہ کر شعر میں اتنا اشارہ [illegible] ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔ غور کیجیے کہ "یک نگاہ" کے بعد دل کا زخمی یا [illegible] ہونا بیان نہیں کرتا، نہ راتوں کی نیند اڑ جانے کا ذکر ہے نہ متاعِ صبر و قرار لٹ جانے کا

شکوہ! "مارا گیا" کہہ کر دو لفظوں اور سات حرفوں میں اپنی مکمل بے بسی، بے چارگی، تباہی و بربادی اور بے صبری و بے قراری کا مرقع پیش کر دیا ہے۔ پورا شعر بیانیہ انداز میں پڑھیے، نرم و سبک لہجہ پُر درد بھرائی ہوئی آواز اور چہرے پر وہ تمام نقوش و اثرات جو ایک فریادی کے لیے مخصوص ہیں۔ کسی ثالث کو داد رس تصور کیجیے زرا سی توقع پر کہ شاید یہی بربادی کی کچھ تلافی کر دے یا کم از کم تباہی پر دو آنسو بہا لے اور کچھ نہیں تو ہمدردی سے سن ہی لے۔ یہ بھی دیکھیے کہ اسی شعر میں معشوق کی سنگ دلی اور جفا شعاری کا کیسا لطیف پہلو ہے۔

فن کے نقطۂ نگاہ سے میرؔ کا ایک یہی شعر اتنا مکمل نہیں۔ اس کے دیوان میں سینکڑوں اشعار ایسے ہی جامع ملیں گے جو میرؔ کے آرٹ اور اس کے منفرد فن و اسلوب کے نمائندہ ہیں۔ ان کا ایک وصفِ امتیازی یہ بھی ہے کہ ایک لفظ کم کر نا کیسا، ادھر سے اُدھر کر دیجیے تو شعر مہمل یا کم سے کم بے کیف ضرور ہو جائے گا۔

ایک اور شعر ہے:

کیا خوبی اس کے منہ کی اے غنچہ نقل کریئے تُو تو نہ بول ظالم، بو آتی ہے دہاں سے

اس شعر میں بھی وہی کمال ہے جس کا میں نے پہلے شعر کی توضیح میں بیان کیا یعنی آہنگِ الفاظ سے شاعر کے تخیّل کی پوری تائید ہوتی ہے اور اُس کا معہود ذہنی چار خیال میں اپنی تمام خوبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ اس طرح آتا ہے کہ دل جھومنے لگتا ہے۔ پہلے مصرعے کا لہجہ حقارت آمیز ہے۔ چمن میں غنچے کو دیکھ کر معشوق کا دہن یاد آتا ہے لیکن پھر خیال ہوتا ہے کہ کہاں میرے محبوب کا دہن اور کہاں یہ بے مایہ غنچہ! اگر دیکھتا ہے کہ غنچہ محبوب کے دہن کی نقل اتارنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن ایسا ہے گویا بنا نہیں سکتا منہ بگڑا جا رہا ہے۔ شاعر اسے دیکھ کر ٹوکتا ہے: "کیا خوبی اس کے منہ کی اے غنچہ نقل کریئے!" تصور کی آنکھوں نے دیکھا اور خیال کے کانوں نے سُنا کہ غنچہ کچھ کہنے چلا ہے ظاہر ہیں وہ آہستہ آہستہ کھل رہا ہے۔ غنچے کے تبسم کو دیکھ کر شاعر سوچتا ہے کہ جب میرا محبوب بات کرتا ہے تو اس کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ غنچے کا اس کے دہن کی نقل کرنا ہی ایک جسارت تھا آگے چھوٹا منہ بڑی بات! اب وہ محبوب کے

تکلم سے بھی خاک اڑانے چلا۔ تو کس عجیب ڈھنگ سے للکارتا ہے ؎

تو تو نہ بول ظالم۔ بو آتی ہے دہاں سے

دوسرے مصرعے کا پہلا ٹکڑا بیزاری میں اضافے کی طرف اشارہ کرتا ہے "ظالم" ایسی جگہ واقع ہوا ہے کہ اس سے ایک پیار بھری نفرت کا اظہار ہو رہا ہے "پیار بھری" یوں کہ نقل بُری ہے یا بھلی صحیح ہے یا غلط ہے تو دہانِ محبوب کی! ذہن اس بھونڈی نقل کو ہی دیکھ کر معشوق کے پیارے مکھڑے اور اس کے دل نواز تبسم کی طرف منتقل تو ہوتا ہے اور دوسرے ٹکڑے کی جامعیت یہ ہے کہ جیسے ناک سکیڑ کر، ماتھے پر بَل ڈال کر منھ پھیر لیا — بو آتی ہے دہاں سے!"

اور دیکھیے: رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم

آتا ہے جی میں آنکھوں کو ان میں گڑو دیئے

اس شعر میں رخسار کی صباحت یا ملاحت اور شگفتگی کا کہیں ذکر نہیں۔ لیکن شعر کا پہلا مصرعہ پڑھ کر ہی، رخسار کی جتنی خوبیاں ہو سکتی ہیں وہ سب ذہن میں آجاتی ہیں۔ دوسرے مصرعے میں ایک عجیب خواہش کا اظہار ہوتا ہے جو محبت کا درجۂ انتہا ہے۔ سب سے بڑا فنکارانہ کمال یہ ہے کہ رخسار دیکھ کر بوسے کی خواہش ظاہر نہیں کرتا نہ ان سے آنکھیں ملنے کو کہتا ہے۔ "آنکھیں گڑو دیئے" کہہ کر تمنا کی پاکیزگی، محبت کی فراوانی، رخسار کی دل کشی سب کا بیان یکجا کر دیتا ہے۔ ایک عام شاعر "ہائے رے" کا بھی اتنا برمحل استعمال نہیں کر سکتا۔ میر نے یہاں "ہائے رے" کہہ کر اس مفہوم کو ادا کر دیا کہ اس پر اپنا بس نہیں چلتا۔

یہ شعر ملاحظہ ہو: مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں

میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

یہ گیارہ الفاظ اتنا بڑا مرقع پیش کرتے ہیں جسے گیارہ سو صفحات پر پھیلایا جا سکتا ہے۔ میر کے آرٹ کا کمال ایسے ہی اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کے مزاج کو پہچانتا ہے۔ الفاظ سے لہجہ اور لہجے سے موسیقی پیدا کرتا ہے۔ الفاظ کے مزاج اور آہنگ سے اشعار میں ندرت اور دل کشی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں دیکھیے کہ مجلس کے ہم معنی الفاظ محفل، بزم، انجمن وغیرہ بھی ہیں مصرعے کے وزن سے قطع نظر کر کے "آفاق کی بزم" "آفاق کی محفل"

کی محفل" یا "آفاق کی انجمن" پڑھیے، خاک مزانہ آئے گا "آفاق" بھی محل غور ہے۔ یہاں کائنات عالم یا دنیا کہنے سے بات بن بھی جائے تو اثر کافور ہوجائے گا۔ اب "مجلس آفاق" کی ترکیب پر نظر کیجیے تو ذہن میں کائنات کی تمام وسعتوں کا احاطہ ہوجاتا ہے اور مجلس کا لفظ آفاق کی نیرنگیوں اور اس کے تضاد کا لطیف پہلو بھی پوشیدہ کیے ہوئے ہے۔ دیکھیے اس مجلس میں، آفاق کی مجلس میں، میر کا موقف ہے "پروانہ ساں"، یعنی ایک پتنگا۔ مبالغہ ہے مگر مبالغہ معلوم نہیں ہوتا اور یہی شاعرانہ کمال ہے جو مصوری سے زیادہ بلند اور نازک ہے۔ دوسرے مصرعے میں صرف اتنی بات کہی ہے کہ "شام اپنی سحر کر گیا"۔ اس میں اور کسی بات کا ذکر نہیں ہے لیکن ہر لفظ اتنا جامع اور ایسا پہلو دار ہے کہ انسان کی مجبوری، کائنات میں اس کی بے مائگی، اور وجود کی بے اہمیتی سب کا تصور مستلزم ہے۔ میں غالب کو اس کے مقام پر بہت بڑا شاعر سمجھتا ہوں، یہاں موازنہ مقصود نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ غالب نے جو بات اس شعر میں کہی ہے:

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یہ شعر میر کے مذکورہ بالا شعر کے صرف اتنے ٹکڑے میں سما گیا ہے بلکہ گم ہوگیا ہے کہ "شام اپنی سحر کر گیا"۔ لیجیے میر و غالب کے ان دونوں شعروں کا ذرا موازنہ کر دیکھیے۔ غالب نے زندگی کو "شمع" سے تشبیہ دی ہے اور میر نے اپنے وجود کو "پروانے" سے۔ غالب کے شعر میں خیال کے دونوں پہلو نہیں ہیں لیکن میر نے مجلس آفاق" کہہ کر آفاق کی لاج رکھ لی، صرف اپنی بے اہمیتی کا ذکر کیا ہے۔ غالب نے پہلے مصرعے میں "غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج" جو کچھ کہا ہے وہ بات میر نے بغیر الفاظ کا سہارا لیے اپنے خیال کے ساتھ ادا کر دی ہے۔ شعر پڑھتے ہوئے آپ کو انسان کی مجبوری کا تصور تولا محالہ کرنا پڑے گا!

کہا جاسکتا ہے کہ غالب نے بالتخصیص اپنے متعلق نہیں، پورے غم ہستی کے لیے کہا ہے کہ اس کا علاج سوائے موت کے اور کچھ نہیں اور میر نے صرف اپنے وجود اور اپنی زندگی کے لیے۔ لیکن غور کیجیے تو میر نے دوسرے مصرعے میں "میر بھی" کہہ کر اس طرف

کی زبان بند کر دی ہے۔ یہ بھی دلالت کر رہا ہے کہ جس طرح اور لوگ مجلس آفاق میں پروانے کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح میر بھی اپنی شام کو جیسے تیسے سحر کر گیا۔ غالب نے ہستی کو تشبیہ شمع سے دی ہے اور شعر سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ماتم خانہ ہو یا شادی خانہ، کوئی رنگ ہو، شمع محفل کو سحر تک جلنا ہی پڑتا ہے شمع کے ختم ہو جانے پر محفل کا سرد ہو جانا بھی لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن میر نے پروانے کی مثال سے یہ بھی نکتہ ملحوظ رکھا ہے کہ پروانے کے لیے ضروری نہیں وہ مجلس کے ساتھ یا مجلس اس کے ساتھ ختم ہو۔ "مجلس" کے کسی بھی دور میں پروانے کی شام زندگی سحر ہو سکتی ہے مجلس کے ہنگامے اور اس کی گرمی بدستور قائم رہے۔ مجلس کی شام سحر نہیں ہوئی بلکہ ایک پروانے کی شام جوں توں سحر ہوئی ہے اپروانے کی زندگی میں سوز ہے، کرب ہے، ماسوا سے بے تعلق ہونے اور اپنے محبوب و مقصود پر فدا ہو جانے کی خصوصیت ہے، جو شاعر اپنی زندگی کا بھی وصف سمجھتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی شعر کے ہر ہر لفظ میں ہزار ہزار پہلو ہیں۔ جتنا غور کیجیے نیا انکشاف ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سادہ و حسین تصویر میں ہزاروں باریک خطوط ہیں اور ہر خط اپنی جگہ مصوری، خطاطی اور نقاشی کا بہترین نمونہ ہے جس میں دل و نگاہ جذب ہوئے جا رہے ہیں۔ اردو کے کسی بھی شعر کو پڑھیے تنقیص نہیں حقیقت ہے کہ ایسا آرٹ اور اس چابک دستی سے کہیں مل ہی نہیں سکتا۔

اس شعر کی توضیح میں غالب کے ایک شعر کا موازنہ آگیا۔ اس بارے میں یہ عرض کردوں کہ کچھ ناقدوں نے میر و غالب کا موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ بے سود رہی کیونکہ موازنے کے لیے مطابقت شرط ہے۔ غالب صاحب فکر ہیں۔ میر صاحب نظر۔ غالب ایک مفکر ہیں۔ میر متصور و مشاہد، غالب دماغ سے زیادہ کام لیتے ہیں میر دل سے۔ میر کا "عشق" جس آگ میں "بے خطر" کود پڑتا ہے وہاں غالب کی "عقل" "محو تماشائے لب بام" نظر آتی ہے۔ میر کے الفاظ میں ان کے معنی گم ہو جاتے ہیں اور غالب کے معنی میں الفاظ، میر کے اشعار پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ الفاظ معانی کو وسعت دے رہے ہیں جب کہ غالب کے اشعار میں معانی، الفاظ کی اہمیت کا سبب بن جاتے ہیں اور مختصر کرکے یوں کہیں گے کہ غالب کے اشعار میں فشار الفاظ ہے اور میر کے کلام میں فشار معانی۔ دونوں آرٹ

جداگانہ ہیں اور بڑے ہیں۔ غالب اور میر کے بنیادی تصورات میں بھی بہت فرق ہے میر کو تصوف کی عملی تعلیم ملی جس نے ان کے دل کی کھڑکیوں کو کھول دیا۔ غالب نے تصوف کو فلسفے کی کتابوں میں تلاش کیا، ان کے ذہن کو بیداری اور روشنی ملی۔ درحقیقت غالب کو میر کی تصویر کا دوسرا رُخ سمجھنا چاہیے۔ یہ بات ضرور ہے کہ جتنی رنگا رنگ، دل کش اور جامع شخصیت غالب کی ہے اتنی میر کی نہیں۔ غالب زندگی کی تلخ حقیقتوں پر ہنستے ہیں اور میر روتے ہیں!

پھر میر کے اشعار کی طرف آیئے ؂

دیدنی ہے شکستگی دل کی　　　کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

آپ نے سیکڑوں پرانی اور شکستہ عمارتیں دیکھی ہوں گی جنھیں دیکھ کر ماضی کے نقوش ذہن میں ابھر آتے ہیں۔ مثلاً دلی کا پرانا قلعہ دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے، کسی زمانے میں اس کی دیواریں سنگین تھیں۔ چاروں طرف ہزاروں مسلح سپاہی گشت کرتے تھے، کیا کرّوفر تھے کیسی آن بان تھی، کتنے ٹھاٹ باٹ تھے، کیا سجاوٹ اور کیسی بناوٹ ہوگی! ظاہری نظر تو یہ دیکھتی ہے کہ دیواریں شکستہ ہیں، ایک ایک اینٹ بکھری ہوئی ہے۔ رنگ اڑ گئے ہیں۔ پھول پتے خراب ہوگئے ہیں لیکن احساس کی آنکھ اس کا عکس ٹٹولتی ہے، کبھی یہاں چمن ہوگا یہاں پچی کاری سے عجب گل کھل رہے ہوں گے، یہاں رنگین پھولوں کی بہار ہوگی! اسی تصور نے میر کو "دیدنی" لکھنے پر مجبور کیا۔ اگر وہ یہاں "دیدنی" نہ کہتا اور مصرع یوں موزوں کرتا:

کوئی دیکھے شکستگی دل کی

تو وزن بھی ٹھیک ہے، مطلب بھی پورا ہو جاتا ہے اور کوئی لفظ بھرتی کا بھی نہیں ہے۔ مگر وجدان کہہ رہا ہے کہ اثر آدھا بھی نہیں رہا!

اشارے کنائے میں کیسی کیسی باتیں چپکے سے کہہ دی جاتی ہیں۔ اس شعر کو پڑھ کر دیکھیے کہ نظامِ زندگی کے عروج و زوال کی پوری تاریخ ایک طرف اور یہ دو مصرعے دوسری طرف!

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں　　　یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے

اگر میر کا تاریخی ماحول آپ کی نظروں میں ہے تو آپ اس شعر کو بار بار پڑھیں گے اور وجد کریں گے۔

ایک یہ شعر شور انگیز ہے ؂

کچھ کر و فکر مجھ دِوانے کی　　دھوم ہے پھر بہار آنے کی

حضرتِ آثرؔ لکھنوی نے مزامیرؔ کے مقدمے میں (ص ۳۱) اس شعر کی اپنے مخصوص دلنشیں انداز میں تشریح کی ہے میں ان سے اچھے الفاظ کہاں سے لاؤں، نقل کرنا کافی ہوگا۔ فرماتے ہیں: "پہلے مصرعے سے کتنی گھبراہٹ ظاہر ہوتی ہے الفاظ اور ان کی ترتیب ایسی ہے کہ آدمی جلد پڑھنے پر مجبور ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس شخص کو اپنے میں وہ تغیرات محسوس ہونا شروع ہو گئے۔ جو ایک مرتبہ پہلے دیوانگی کا پیش خیمہ بن چکے ہیں... ...... دوسرے مصرعے میں لفظ 'دھوم' ایسی جگہ واقع ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈھول تاشے بج رہے ہیں، بہار کا لشکر جوق در جوق امڈا چلا آرہا ہے اور اس غریب کا خرمنِ صبر و ہوش تاراج کیے دیتا ہے۔"

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی　　اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

نشست و آہنگ الفاظ کے اعتبار سے یہ شعر بھی میرؔ کی سحر کاری اور اعجاز کا نمونہ ہے۔ بقول حضرت اثرؔ لکھنوی ــــ "یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زندانی و زنجیری نے جو اپنی آشفتہ سری کے علاج سے مایوس ہے، پہلا مصرع پڑھا، پھر دانت بھینچ کر آنکھیں بند کر کے زور سے سر میں پتھر مارا اور خون میں لت پت ہو گیا۔" یہاں 'سنگ' ایسی جگہ آیا ہے کہ پڑھتے ہوئے لہجے میں جھٹکا سا لگتا ہے اور پتھر سے سر پھوڑنے کے تصور کو واضح کر دیتا ہے پہلے مصرع میں لفظ "شورش" کی معنویت پر غور کیجیے کہ ایک لفظ نے جنون کی ساری کیفیتوں کا احاطہ کر لیا ہے۔ جن میں آہ و نالہ، بے خوابی، جیب و دامن کا چاک کرنا، رونا دھونا، چیخنا پیٹنا، اضطراب و اضطرار، مدہوشی و بدحواسی سب کا تصور مجتمع ہو گیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں یہ کہہ کر "اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا" اتنا کچھ بیان کر دیا کہ پتھروں سے سر پھوڑنا اور خاک و خون میں لوٹنا باقی رہ گیا تھا اسے بھی آزما دیکھیں شاید یہ شوریدگی میں تخفیف کا باعث ہو لیکن یہ بھی ہے جنون کی ہی اضطراری و انفعالی حرکت! زنداں میں بھی "کہنا ظاہر کر رہا ہے کہ یہ شوریدہ سر صحرا صحرا کی خاک چھان چکا ہے لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اب زنداں میں ڈالا گیا ہے۔ یہاں بھی سودا بدستور ہے۔

ایسے جامع، پہلودار اور ہفت رنگ اشعار میرؔ کے بعد مشکل سے ہی کسی دوسرے

شاعر کے ہاں ملیں گے۔ ہوں گے تو میرؔ کے ہی فیضانِ اثر سے ۔ اور اسی کے خیال کا عکس۔

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میرؔ زبس ان نے کل رو رو دیا ہاتھ کو دھوتے دھوتے

دوسرے مصرعے کی ساخت ایسی ہے کہ پڑھتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو خوب دبا دبا کر رگڑیئے۔ فعل کی تکرار "رو رو دیا" اور "دھوتے دھوتے" نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا!

لطف پر اس کے ہم نشیں مت جا کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی

عاشق جواب سراسیمہ و سرگرداں اور بے خانماں پھر رہا ہے۔ اسے دراصل معشوق نے ہی پردۂ التفات میں مٹایا ہے۔ رقیب کو دیکھتا ہے کہ وہ معشوق کے الطاف و عنایات کا مورد ہے تو رشک کی زبان کس بانکے انداز میں کہتی ہے کہ میرا یہ حال درہم جو "عیاں راچہ بیاں" ہے اسی کی مہربانی سے ہوا ہے تو اس کے لطف کا فریب مت کھائیو۔ اس کی عنایتوں پر مت بھولیو۔ یہاں "ہم نشیں" کہا ہے اور رقیب مراد ہے اگر رقیب ہی کہتا تو نصیحت میں ہمدردی کا فقدان ہو جاتا اور صاف ظاہر ہوتا کہ عاشق کو رشک و حسد کی وجہ سے رقیب پر محبوب کی مہربانی گراں ہے۔ یہاں بہت سے شاعر ٹھوکر کھا سکتے تھے۔

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

میں نے اس شعر کو بلا مبالغہ لاکھوں بار پڑھا ہوگا۔ جب پڑھتا ہوں دل میں گرہ سی لگ جاتی ہے اور آنکھیں نم آلود ہو جاتی ہیں۔ سرسری نظر کہتی ہے کہ شعر میں کوئی خاص بات نہیں۔ شاعر صرف اتنی سی بات کہہ رہا ہے کہ ایک پروانے نے خدا جانے شمع کے حضور چپکے سے کیا عرض کیا کہ صبح تک شمع کو وجد آتا رہا۔ لیکن ان چھوٹے چھوٹے دو مصرعوں میں تاثیر و تاثر کی جو دنیا آباد ہے اسے الفاظ و عبارت میں تحویل کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ پہلے شعر کی صناعی اور لفظی خوبیوں کو دیکھیے کہ شمع کی لو کے بھڑکنے اور پھڑپھڑانے کے لیے سر دھننے سے اچھا استعارہ نہیں مل سکتا۔ پروانے کے لیے "پتنگا" ایسا برمحل کہا ہے کہ اس کے ناچیز وجود اور بے حقیقت و اہمیت زندگی کو محیط ہے پھر "التماس" کے اندر ایک عجیب رمز ہے۔ شمع کے حضور میں ایک پتنگے نے کیا التماس کیا ہوگا؟ ذرا غور تو کیجیے۔ جتنا آپ کی سمجھ میں آئے گا اتنا ہی زیادہ حظ اٹھائیں گے!

مجھے میر کا ایک اور شعر بہت پسند ہے۔ ممکن ہے اسے میری پسند کے مطابق اہمیت نہ دی جائے لیکن شعر بہرحال میر کے آرٹ کا ایسا ہی مکمل نمونہ ہے جیسے چند اشعار اوپر نقل کیے گئے ہیں ؎

وہ کھلے بال سوتے ہے شاید
رات کو جی مرا بکھر جا ہے

دن کے شور و شغب میں محبوب کی یاد اتنا نہیں چھیڑتی، جتنا رات کے سناٹے میں۔ رات کو عشق کی بہت سی کیفیات اور بہت سے خوابیدہ احساسات بیدار ہو جاتے ہیں، زخموں میں ٹیس ہوتی ہے۔ دل میں ہوک اٹھتی ہے آنکھوں میں کھٹک ہوتی ہے اور فراق کا دھڑکا سونے نہیں دیتا۔ طرح طرح کے وسواس، واہمے، خیالات، پریشان گوئی اور ذہنی اضطراب و کشمکش میں بھی لاشعور یہ سہارا ڈھونڈتا ہے کہ عاشق کی اس حالت کا تعلق یقیناً محبوب کے ایما و اشارات سے ہے۔ رات کو جی کے بکھر جانے کا ایک سبب شاید یہ ہے کہ وہ بال اس کے شانوں پر لہراتے اور ان کی گھنیری حیات بخش چھاؤں میں قرار ملتا۔ تناسب الفاظ کی یہ صنعت بھی کتنی اتفاقیہ ہے کہ رات کو زلف سے اور زلف کو رات سے شاہد قرار دیا جاتا ہے اور دل کو اسیر دام زلف کہا جاتا ہے۔ بالوں کا کھلنا اور دل کا بکھرنا اس قید کی رعایت سے بھی ہوا کہ دل زلفوں کا قیدی ہے جب زلفیں لہرائیں، دل بکھرا اور یہاں "جی" سے مراد صرف دل نہ لیجیے۔ بلکہ "جی بکھرنا" بہ طور محاورے کے سمجھیے تب بھی شعر بلاغت لفظی اور ندرت معنوی کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہے۔

میر پر جتنا لکھا جائے، جو کچھ لکھا جائے وہ یقیناً کم ہے میں تو یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہیں سمجھتا کہ میر کا ایک ایک شعر پڑھ کر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، جو کیفیت قلب و روح پر گزرتی ہے جو خلش ہوتی ہے اور جو کیف ملتا ہے صرف اس کے بیان کرنے والا ایک عمر درکار ہے اور شاید پھر بھی ڈھنگ سے بیان نہ ہو سکے۔ اب میں میر کے چند ایسے اشعار نقل کروں گا جو اس کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس کے منفرد طرز و اسلوب کا بہترین نمونہ ہیں۔ میرے مذکورہ بالا بیان اور مثالوں کی روشنی میں انھیں پڑھیے اور سر دھنیے ؎

لیٹے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

اشک کی لغزشِ مستانہ پہ مت کیجیو نظر
دامنِ دیدۂ گریاں ہے مرا پاک ہنوز

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے۔ سنو ہو! یہ بستی اُجاڑ کر

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا!

تم نے جوان ہو کر یہ چال کیا نکالی
جب جب چلو ہو دل کو ٹھوکر لگا کرے ہے

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

آنکھوں سے حال پوچھا دل کا
اک بوند ٹپک پڑی لہو کی!

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

ہائے اس زخمیٔ شمشیرِ محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

کیا کہیے داغ دل ہے ٹکڑے جگر ہے سارا
جانے ہے وہ جو ظالم کوئی وفا کرے ہے

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل!
سارے عالم کو میں دکھا لایا

چاہے ہے آج ہوں میں ہفت آسماں کے اوپر
دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں

(دلی کالج میگزین میر نمبر سائز ۲۰×۲۶ صفحات ۲۶۴ قیمت ۱/- حوالہ صفحہ ۱۲۸ تا ۱۲۹)

تلوک چند محروم

غزل

شہرہ تمہارے حسن کا اب عام ہوگیا
رکھیو معاف، گر کوئی بدنام ہوگیا

اے دل ترے طفیل ہوں مشہور عشق باز
تو نے کیا تھا کام، مرا نام ہوگیا

چشمِ بتاں میں ہے کوئی تسخیر کا عمل
جس پر پڑی نگاہ، وہی رام ہوگیا

مر ہی گیا خوشی سے میں سن کر پیام دوست
پیغام وصل موت کا پیغام ہوگیا

پھرنے میں کس لیے نہیں آتے ہیں دن مرے
کیا بند دورِ گردشِ ایام ہوگیا

اے دل یہ کیا فسردگی آغاز عشق میں
گل کیوں ترا چراغ سرِ شام ہوگیا

محروم کو بھی طاعتِ خالق پہ ناز تھا
سنتے ہیں اب تو بندۂ اصنام ہوگیا

شعلۂ نوا طبع دوم سنہ ۶۵ء، ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۲۸۰، قیمت ۶/۵۰ (حوالہ صفحہ ۱۹۸)

مرتبہ:
رشید حسن خاں

باغ و بہار

پیش لفظ

۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء کو کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ اسی سال "ہندوستانی پروفیسر" کی حیثیت سے ڈاکٹر جان بارتھ وک گِل کرِسٹ کا تقرر ہوا۔ گِل کرِسٹ کی کوششوں سے، ہندوستانی زبان کے شعبے میں، اُس زمانے کے لائق ترین نثر نگار جمع ہو گئے تھے۔ انھیں اربابِ قلم میں، دِلّی کے رہنے والے میر امّن لطف بھی تھے، جن کی کتاب باغ و بہار "اردو نثر کی اُن چند کتابوں میں سے ہے جو ہمیشہ رہنے والی ہیں اور شوق سے پڑھی جائیں گی"۔

میر محمد حسین عطا خاں تحسین، اٹاوہ (یوپی) کے رہنے والے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ انھوں نے فارسی کی کتاب قصۂ چہار درویش کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ سنہ ۱۷۷۵ء تک مکمل ہو چکا تھا۔ ترجمے کی زبان، پرانے انداز کی ہے۔ "مقفّیٰ جملوں، مرصّع عبارتوں، اور عربی فارسی کے ثقیل لفظوں کی بہتات ہے۔ تحسین نے اپنے ترجمے کا نام نوطرزِ مرصّع رکھا۔ نام ہی میں اُس کے اندازِ عبارت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔" اسی کا نتیجہ ہے کہ شہرتِ دوام تو یقیناً تحسین کے حصے میں آئی، مگر قبولِ عام سے وہ قطعاً محروم رہے۔"

گِل کرِسٹ نے میر امّن سے فرمایش کی وہ اس کو بول چال کی زبان میں لکھیں۔ مقصد یہ تھا کہ فورٹ ولیم کالج کے انگریز طالب علموں کے لیے نثر کی ایک اچھی کتاب تیار ہو جائے، جس کی مدد سے وہ سادہ اور بامحاورہ زبان سیکھ سکیں۔ میر امّن نے، نوطرزِ مرصّع کے ساتھ ساتھ، اصل فارسی قصے کو بھی سامنے رکھا، اور "اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"۔

جیسا کہ میر امّن نے کتاب کے آخر میں صاف صاف لکھا ہے، انھوں نے ۱۲۱۵ھ کے آخر میں اسے لکھنا شروع کیا تھا، ۱۲۱۷ھ کے شروع میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔ عیسوی سنہ

کے لحاظ سے ۱۸۰۱ء کے شروع میں کتاب کا آغاز ہوا، اور ۱۸۰۲ء کے وسط میں تکمیل ہوئی۔ باغ و بہار تاریخی نام ہے، جس سے سالِ تکمیل (۱۲۱۷ھ) نکلتا ہے۔ شروع میں اس کا نام چہار درویش ہی تھا۔ اور پہلی بار اس کے ۱۰۲ صفحے اسی نام سے چھپے تھے۔ یہ صفحے گل کرسٹ کے مرتب کیے ہوئے ایک انتخاب ہندی مینول میں شامل ہیں۔ یہ انتخابی مجموعہ ۱۸۰۲ء میں چھپا تھا۔ پوری کتاب باغ و بہار کے نام سے پہلی دفعہ ۱۸۰۴ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ میں چھپی۔ یہ اڈیشن کم یاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ اڈیشن میر امّن کی موجودگی میں بلکہ ان کی نگرانی میں چھپا تھا۔ اس لحاظ سے اس کتاب کا معتبر ترین نسخہ یہی ہے۔ میں نے اسی اڈیشن کو نسخہ جامعہ کے متن کی بنیاد بنایا ہے۔

باغ و بہار کا ایک قابلِ ذکر اڈیشن وہ ہے، جس کو مشہور مُستَشرق ڈنکن فوربس نے ۱۸۴۶ء میں لندن سے شائع کیا تھا۔ فوربس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کے نسخے کا متن، دو قلمی نسخوں پر مبنی ہے، جن میں سے ایک مکمل میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا چوتھا اڈیشن لندن ہی سے ۱۸۶۰ء میں شائع ہوا۔ یہ نسخہ میرے سامنے ہے۔ باغ و بہار کی اشاعت اوّل میں اور اس میں بعض معمولی اختلافات ہیں۔ ایسے سارے مقامات پر اشاعتِ اوّل کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔ اشاعتِ اوّل میں خاصا بڑا غلط نامہ شامل ہے، اس کے باوجود، بہت سی غلطیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ان غلطیوں کی تصحیح کے لیے، نسخہ، فوربس کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

مکتبہ جامعہ نے اردو کی معیاری کتابوں کے سستے اڈیشن پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے، یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اس سلسلے کی کتابوں کی ترتیب میں مندرجہ ذیل امور کو خاص طور سے ملحوظ رکھا جائے گا:۔

"(۱) اس بنیادی اصول کے تحت کہ کتاب کا متن معتبر ترین اشاعت پر مبنی ہو، ان کتابوں کے اوّلین اڈیشن یا بصورت دیگر قابلِ ذکر اشاعتیں پیشِ نظر رکھی جائیں گی۔ اور دوسرے قدیم نسخوں سے بھی مدد لی جائے گی۔

(۲) جن کتابوں کے معتبر اڈیشن موجود نہیں، ان کے معتبر قلمی نسخوں کو متن کی بنیاد بنایا جائے گا۔

(۳)　بیش تر کتابوں کے آخر میں ضروری الفاظ کی فرہنگ ہوگی۔

(۴)　عربی، فارسی اور ہندی کے وہ لفظ جو آج کل کم استعمال ہوتے ہیں یا متروک ہو چکے ہیں یا جن کے تلفظ میں کسی غلطی کا احتمال ہو سکتا ہے، اِن کو احتیاط کے ساتھ مع ضبطِ حرکات درج کیا جائے گا۔"

اس کتاب میں بھی ان تمام امور کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ طلبہ، اور اساتذہ دونوں اِس سلسلے سے مستفید ہوں گے۔ عام لوگوں کو اچھی کتابیں صحیح متن کے ساتھ کم قیمت میں دستیاب ہوں گی اس سے ان کے ذوق کی تسکین کے ساتھ ساتھ اردو کی اچھی کتابوں کی اشاعت بھی بڑھے گی۔

دہلی یونی ورسٹی　　　　　رشید حسن خاں
۲۰ راگست ۱۹۶۴ء

سبحان اللہ! کیا صانع ہے، کہ جس نے ایک مُٹھی خاک سے کیا کیا صُورتیں اور مٹی کی مُورتیں پیدا کیں! باوجود دو رنگ کے، ایک گورا، ایک کالا۔ اور یہی ناک، کان، ہاتھ پاؤں سب کو دیے ہیں؛ تس پر رنگ برنگ کی شکلیں جُدی جُدی بنائیں، کہ ایک کی سج دھج سے دوسرے کا ڈیل ڈول ملتا نہیں؛ کروڑوں خلقت میں جس کو چاہیے، پہچان لیجیے۔ آسمان اس کے دریائے وحدت کا ایک بُلبلا ہے، اور زمین، پانی کا بتاشا! لیکن یہ تماشا ہے کہ سمندر ہزاروں لہریں مارتا ہے، پر اُس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ جس کی یہ قدرت اور سکت ہو، اس کی حمد و ثنا میں زبان انسان کی گویا گونگی ہے؛ کہے تو کیا کہے! بہتر یہی ہے کہ جس بات میں دم نہ مار سکے، چپکا ہو رہے ؎

عرش سے لے فرش تک جس کا کہ یہ سامان ہے
حمد اُس کی گر لکھا چاہوں تو کیا امکان ہے!

جب پیمبر نے کہا [illegible] نہ جانا نہیں" پھر جو کوئی دعویٰ کرے اس کا [illegible]
[illegible] بیہودہ ہیں صنعت دیکھتے [illegible] کر

صورت دیدۂ حیران ہے جس کا ثانی اور مقابل ہے، نہ ہووے گا کبھو ایسے
یکتا کو، خدائی سب طرح شایاں ہے لیکن اتنا جانتا ہوں، خالق و رازق
ہے وہ ہر طرح سے مجھ پر اُس کا لطف اور احسان ہے
اور دُرود اس کے دوست پر، جس کی خاطر زمین اور آسمان کو پیدا کیا، اور درجہ رسالت کا دیا
جسمِ پاک مصطفےٰ، اللہ کا اک نور ہے　　　اس لیے پرچھائیں اس قد کی نہ تھی، مشہور ہے
حوصلہ میرا کہاں اتنا، جو نعت اس کی کہوں!　　　پر سخن گویوں کا یہ بھی قاعدہ دستور ہے
اور اس کی آل پر صلوٰۃ و سلام، جو ہیں بارہ امام۔

حمدِ حق اور نعتِ احمدؐ کو بیاں کر بالتمام
اب میں آغاز اس کو کرتا ہوں جو ہے منظور کام
یاالٰہی! واسطے اپنے نبیؐ کی آل کے
کر یہ میری گفتگو، مقبولِ طبعِ خاص و عام

مُنشا اس تالیف کا یہ ہے کہ سنہ ایک ہزار دو سو پندرہ برس ہجری اور اٹھارہ سے ایک سال عیسوی، مطابق ایک ہزار دو سو سات سنہ فصلی کے، عہد میں اشرف الاشراف مارکوس ولزلی گورنر جنرل لارڈ مارننگٹن صاحب کے (جن کی تعریف میں عقل حیران اور فہم سرگرداں ہے۔ جتنے وصف سرداروں کو چاہییں، اُن کی ذات میں خدا نے جمع کیے ہیں۔ غرض قسمت کی خوبی اس مُلک کی تھی، جو ایسا حاکم تشریف لایا، جس کے قدم کے فیض سے، ایک عالم نے آرام پایا۔ مجال نہیں کہ کوئی کسو پر زبردستی کر سکے؛ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں، سارے غریب غربا دُعا دیتے ہیں اور جیتے ہیں) چرچا علم کا پھیلا۔ صاحبانِ ذی شان کو شوق ہوا کہ اُردو کی زُبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفت و شنود کریں، اور مُلکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں؛ اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال، بہ موجبِ فرمائش کے تالیف ہوئیں۔

جو صاحب، دانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں، اُن کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں، کہ یہ قصہ چار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخش، جو اُن کے پیر تھے، اور درگاہ اُن کی دلّی میں قلعے

سے تین کوس، لال دروازے کے باہر، مٹیا دروازے سے آگے، لال بنگلے کے پاس ہے، اُن کی طبیعت ماندی ہوئی، تب مُرشد کے دل بہلانے کے واسطے، امیر خسرو یہ قصّہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انھوں نے غسلِ صحّت کے دن یہ دُعا دی، کہ جو کوئی اس قصّے کو سُنے گا، خدا کے فضل سے تن دُرست رہے گا۔ جب سے یہ قصّہ فارسی میں مُروّج ہوا۔

اب خُداوندِ نعمت، صاحبِ مُروّت، نجیبوں کے قدر دان، جان گل کرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے، جب تلک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اِس قصّے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں، جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ مُوافق حکمِ حُضور کے، میں نے بھی اِسی محاورے سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔

پہلے اپنا احوال یہ عاصی، گنہ گار میر امّن دلّی والا بیان کرتا ہے کہ: میرے بزرگ ہُمایوں بادشاہ کے عہد سے، ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں، پُشت بہ پُشت جاں فشانی بجا لاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے، قدر دانی جتنی چاہیے، فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر کر، مالا مال اور نہال کر دیا، اور خانہ زادِ مورُوثی اور منصب دارِ قدیمی، زبانِ مُبارک سے فرمایا؛ چنان چہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔

جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اُس گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے، عیاں را چہ بیاں! تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا، اور احمد شاہ دُرّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر، ویسے شہر سے (کہ وطن، و جنم بھوم میرا ہے، اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلا وطن ہوا، اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا) غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے، کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا، کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اُکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی، عیال و اطفال کو چھوڑ کر، تن تنہا کشتی پر سوار ہو، اشرف البلاد کلکتے میں آب و دانے کے زور سے آ پہنچا۔ چندے بے کاری گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ

نے بُلوا کر، اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مُقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا، لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔ تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے، حضور میں تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے رسائی ہوئی۔ بارے، طالع کی مدد ایسے ایک جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں، نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر، پانو پھیلا کر سو رہتا ہوں۔ اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر، دُعا اُس قدر دان کو کرتے ہیں، خدا قبول کرے۔

حقیقت اُردو کی زُبان کی بزرگوں کے مُنہ سے یوں سُنی ہے کہ دلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجُگی ہے۔ انھیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندُستان کو لیا۔ اُن کے آنے اور رہنے سے، لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا؛ اِس واسطے شہر کا بازار اُردو کہلایا۔ پھر ہُمایوں بادشاہ، پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہو کر ولایت گئے۔ آخر وہاں سے آن کر پس ماندوں کو گوشمالی دی، کوئی مُفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے مُلکوں سے سب قوم، قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر، حضور میں آکر جمع ہوئے؛ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سُلف، سوال جواب کرتے، ایک زُبان اُردو کی مقرر ہوئی۔

جب حضرت شاہ جہاں صاحبِ قران نے قلعۂ مُبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا اور تختِ طاؤس میں جواہر جڑوا دیا اور دَل بادَل سا خیمہ، چوبوں پر استاد کر، طنابوں سے کھنچوایا اور نواب علی مردان خاں نہر کو لے کر آیا، تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارُالخلافت بنایا۔ تب سے شاہ جہاں آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلّی جُدی ہے، وہ پرانا اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اُردوئے معلّٰے خطاب دیا۔

امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت، بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تک، پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی؛ نِدان زبان اُردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اُس سے ٹکر نہیں کھاتی، لیکن قدردانِ منصف چاہیے جو تجویز کرے۔ سو اب خدا نے بعد مدّت کے جان گلکرسٹ صاحب سا دانا، نکتہ رَس پیدا کیا کہ جنھوں نے اپنے گیان اور اٹکل سے اور تلاش و محنت سے، قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں۔ اس سبب سے ہندستان کی زبان کا ملکوں میں رواج ہوا اور نئے سِرے سے رونق زیادہ ہوئی! نہیں تو اپنی دستار و گفتار و رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار سے پوچھیے، تو شہر والے کو نام رکھتا ہے، اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر، عاقلاں خود میدانند۔

جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا، شاہ عالم پورب کی طرف تھے، کوئی وارث اور مالک مُلک کا نہ رہا، شہر بے سَر ہو گیا۔ سچ ہے، بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی؛ ایک بارگی تباہی پڑی، رئیس وہاں کے، میں کہیں تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہنچے، وہاں کے آدمیوں کی ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا۔ اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلّی میں گئے اور رہے، وہ بھی کہاں تلک بول سکیں گے، کہیں نہ کہیں چُوک ہی جائیں گے۔ اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلّی کا روڑا ہو کر رہا، اور دس پانچ پُشتیں اُسی شہر میں گزریں، اور اُس نے دربار اُمراؤں کے، اور میلے ٹھیلے، عُرس، چھڑیاں، سیر تماشا، اور کوچہ گردی اُس شہر کی مدّت تلک کی ہوگی، اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اُس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا، یہاں تلک پہنچا ہے۔

شروع قصّے کا

اب آغاز قصّے کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سُنو اور منصفی کرو۔ سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے، اور کہنے والے نے کہا ہے، کہ آگے رُوم کے مُلک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت، اس کی ذات میں تھی۔ نام اُس کا آزاد بخت، اور

شہر قسطنطنیہ (جس کو اسٹنبول کہتے ہیں) اس کا پایۂ تخت تھا۔ اس کے وقت میں رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفّہ، غریب غربا آسودہ، ایسے چین سے گزران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید، اور رات شب برات تھی۔ اور جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھائی گیرے، دغاباز تھے؛ سب کو نیست ونابود کر کر، نام ونشان ان کا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے اور دکانیں بازار کی کھلی رہتیں۔ راہی، مسافر جنگل میدان میں سونا اچھالتے چلے جاتے، کوئی نہ پوچھتا کہ تمھارے منہ میں کے دانت ہیں اور کہاں جاتے ہو؟

اس بادشاہ کے عمل میں ہزاروں شہر تھے، اور کئی سلطان نعل بندی دیتے۔ ایسی بڑی سلطنت پر ایک ساعت اپنے دل کو خدا کی یاد اور بندگی سے غافل نہ کرتا۔ آرام دنیا کا جو چاہیے سب موجود تھا؛ لیکن فرزند کہ زندگانی کا پھل ہے، اس کی قسمت کے باغ میں نہ تھا۔ اس خاطر اکثر فکر مند رہتا، اور پانچوں وقت کی نماز کے بعد اپنے کریم سے کہتا کہ "اے اللہ! مجھ عاجز کو تو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا، لیکن ایک اس اندھیرے گھر کا دیا نہ دیا۔ یہی ارمان جی میں باقی ہے کہ میرا نام لیوا اور پانی دیوا کوئی نہیں، اور تیرے خزانۂ غیب میں سب کچھ موجود ہے، ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے، تو میرا نام اور اس سلطنت کا نشان قائم رہے!"

اسی امید میں بادشاہ کی عمر چالیس برس کی ہو گئی۔ ایک دن شیش محل میں نماز ادا کر کر، وظیفہ پڑھ رہے تھے؛ ایک بارگی آئینے کی طرف خیال جو کرتے ہیں، تو ایک سفید بال موچھوں میں نظر آیا، کہ مانند تار مقیش کے چمک رہا ہے۔ بادشاہ دیکھ کر آب دیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر دل میں اپنے سوچ کیا کہ افسوس! تو نے اتنی عمر ناحق برباد کی، اور اس دنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر وزبر کیا۔ اتنا ملک جو لیا، اب تیرے کس کام آوے گا؟ آخر یہ سارا مال اسباب کوئی دوسرا اڑا دے گا۔ تجھے تو پیغام موت کا آچکا، اگر کوئی دن جیے بھی تو بدن کی طاقت کم ہو گی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری تقدیر میں نہیں لکھا کہ وارث چتر اور تخت کا پیدا ہو۔ آخر ایک روز مرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ جانا ہے، اس سے یہی بہتر ہے کہ میں ہی اسے چھوڑ دوں اور باقی زندگی اپنے

خالق کی یاد میں کاٹوں۔

یہ بات اپنے دل میں ٹھہرا کر، پائیں باغ میں جا کر، سب مُجرائیوں کو جواب دے کر، فرمایا کہ کوئی آج سے میرے پاس نہ آوے، سب دیوانِ عام میں آجایا کریں اور اپنے کام میں مُستعِد رہیں۔ یہ کہہ کر آپ ایک مکان میں جا بیٹھے اور مُصَلّا بچھا کر، عبادت میں مشغول ہوئے۔ سوائے رونے اور آہ بھرنے کے کوئی کام نہ تھا۔ اسی طرح بادشاہ آزاد بخت کو کئی دن گزرے، شام کو روزہ کھولنے کے وقت ایک چھہارا کھاتے اور تین گھونٹ پانی پیتے اور تمام دن رات جانماز پر پڑے رہتے۔ اس بات کا باہر چرچا پھیلا، رفتہ رفتہ تمام ملک میں خبر گئی کہ بادشاہ نے بادشاہت سے ہاتھ کھینچ کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ چاروں طرف غنیموں اور مُفسِدوں نے سر اٹھایا اور قدم اپنی حد سے بڑھایا۔ جس نے چاہا ملک دبا لیا اور سرانجام سرکشی کا کیا۔ جہاں کہیں حاکم تھے، اُن کے حکم میں خلل عظیم واقع ہوا۔ ہر ایک صوبے سے عرضی بدعملی کی حضور میں پہنچی۔ درباری اُمرا جتنے تھے، جمع ہوئے اور صلاح مصلحت کرنے لگے۔

آخر یہ تجویز ٹھہری، کہ نواب وزیر، عاقل اور دانا ہے، اور بادشاہ کا مُقرَّب اور معتمد ہے، اور درجے میں سب سے بڑا ہے، اس کی خدمت میں چلیں، دیکھیں، وہ کیا مناسب جان کر کہتا ہے۔ سب عمدہ، امیر، وزیر کے پاس آئے اور کہا: بادشاہ کی یہ صورت اور ملک کی وہ حقیقت۔ اگر چندے اور تغافل ہوا، تو اس محنت کا ملک لیا ہوا، مُفت میں جاتا رہے گا، پھر ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔ وزیر پُرانا، قدیم نمک حلال اور عقل مند، نام بھی خرد مند، اسم بامسمّٰی تھا، بولا: اگرچہ بادشاہ نے حضور میں آنے کو منع کیا ہے، لیکن تم چلو، میں بھی چلتا ہوں، خدا کرے بادشاہ کی مرضی آوے، جو رُوبرُو بلاوے۔ یہ کہہ کر، سب کو اپنے ساتھ دیوانِ عام تک لایا، ان کو وہاں چھوڑ کر، آپ دیوانِ خاص میں آیا، اور بادشاہ کی خدمت میں محلّی کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ یہ پیر غلام حاضر ہے، کئی دنوں سے جمالِ جہاں آرا نہیں دیکھا، اُمیدوار ہوں کہ ایک نظر دیکھ کر قدم بوسی کروں، تو خاطر جمع ہو۔ یہ عرض وزیر کی بادشاہ نے سُنی، ازبس کہ قدامت اور خیرخواہی اور جاں نثاری اس کی جانتے تھے، اور اکثر اس کی بات مانتے تھے،

بعد تأمل کے فرمایا: خردمند کو بلالو۔ بارے جب پروانگی ہوئی، وزیر حضور میں آیا، آداب بجالایا، اور دست بستہ کھڑا رہا۔ دیکھا تو بادشاہ کی عجیب صورت بن رہی ہے کہ زار بہ زار رونے اور دُبلاپے سے، آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں، اور چہرہ زرد ہو گیا ہے۔

خردمند کو تاب نہ رہی، بے اختیار دوڑ کر قدموں پر جا گرا۔ بادشاہ نے ہاتھ سے سر اس کا اٹھایا اور فرمایا: لو، مجھے دیکھا، خاطر جمع ہوئی؟ اب جاؤ، زیادہ مجھے نہ ستاؤ، تم سلطنت کرو۔ خردمند سن کر، دھاڑ مار کر رویا اور عرض کی: غلام کو آپ کے تقدس اور سلامتی سے ہمیشہ بادشاہت میسر ہے۔ لیکن جہاں پناہ کی یک بیک اس طرح کی گوشہ گیری سے تمام ملک میں تہلکہ پڑ گیا ہے، اور انجام اس کا اچھا نہیں۔ یہ کیا خیال مزاج مبارک میں آیا؟ اگر اس خانہ زاد موروثی کو بھی محرم اس راز کا کیجیے تو بہتر ہے! جو کچھ عقل ناقص میں آوے، التماس کرے۔ غلاموں کو جو یہ سرفرازیاں بخشی ہیں، اسی دن کے واسطے کہ بادشاہ عیش و آرام کریں، اور نمک پروردے تدبیریں ملک کی رہیں۔ [illegible] خواستہ جب فکر مزاج عالی کے لاحق ہوئی تو بندے ہائے پادشاہی کس دن کام آویں گے؟ بادشاہ نے کہا: سچ کہتا ہے! پر جو فکر میرے جی کے اندر ہے، سو تدبیر سے باہر ہے۔

سن اے خردمند! میری ساری عمر اسی ملک گیری کے دردِ سر میں کٹی، اب یہ سن و سال ہوا، آگے موت باقی ہے، سو اس کا بھی پیغام آیا کہ سیاہ بال سفید ہو چلے وہ مثل ہے: ساری رات سوئے، اب صبح کو بھی نہ جاگیں؟ اب تلک ایک بیٹا پیدا نہ ہوا۔ جو میری خاطر جمع ہوتی، اس لیے دل سخت اداس ہوا اور میں سب کچھ چھوڑ بیٹھا: جس کا جی چاہے، ملک لے یا مال لے، مجھے کچھ کام نہیں۔ بلکہ کوئی دن میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ سب چھوڑ چھاڑ کر، جنگل اور پہاڑوں میں نکل جاؤں، اور منہ اپنا کسو کو نہ دکھاؤں، اسی طرح یہ چند روز کی زندگی بسر کروں۔ اگر کوئی مکان خوش آیا تو وہاں بیٹھ کر، بندگی اپنے معبود کی بجالاؤں گا۔ شاید عاقبت بخیر ہو۔ اور دنیا کو تو خوب دیکھا، کچھ مزہ نہ پایا۔ اتنی بات بول کر، اور ایک آہ بھر کر، بادشاہ چپ ہوئے۔

خردمند ان کے باپ کا وزیر تھا، جب یہ شہزادے تھے، تب سے محبت رکھتا تھا۔ علاوہ، دانا اور نیک اندیش تھا، کہنے لگا: خدا کی جناب سے ناامید ہونا ہرگز مناسب نہیں۔

جس نے ہیژدہ ہزار عالم کو ایک حکم میں پیدا کیا، تمہیں اولاد دینی اس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے؟ قبلۂ عالم! اس تصوّرِ باطل کو دل سے دور کرو، نہیں تو تمام عالم درہم برہم ہو جاوے گا، اور یہ سلطنت کس کس محنت اور مشقت سے تمہارے بزرگوں نے اور تم نے پیدا کی ہے؟ ایک ذرا میں ہاتھ سے نکل جائے گی، اور بے خبری سے ملک ویران ہو جائے گا۔ خدانہ خواستہ بدنامی حاصل ہوگی۔ اس پر بھی باز پُرس روزِ قیامت کی ہوا چاہے، کہ تجھے بادشاہ بنا کر اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا، تو ہماری رحمت سے مایوس ہوا اور رعیت کو حیران پریشان کیا! اس سوال کا کیا جواب دو گے، پس عبادت بھی اس روز کام نہ آوے گی؛ اس واسطے کہ آدمی کا دل خدا کا گھر ہے۔ اور بادشاہ فقط عدل کے واسطے پوچھے جائیں گے۔ غلام کی بے ادبی معاف ہو، گھر سے نکل جانا اور جنگل جنگل پھرنا، کام جوگیوں اور فقیروں کا ہے، نہ کہ بادشاہوں کا۔ تم اپنے جوگا کام کرو، خدا کی یاد اور بندگی، جنگل پہاڑ پر موقوف نہیں۔ آپ نے یہ بیت سُنی ہوگی ؎

خدا اِس پاس، یہ ڈھونڈھے جنگل میں
ڈھنڈھورا شہر میں، لڑکا بغل میں

اگر مُنصفی فرمایئے، اور اس فِدوی کی عرض قبول کیجیے، تو بہتر یوں ہے کہ جہاں پناہ ہردم اور ہر ساعت دھیان اپنا خدا کی طرف لگا کر، دُعا مانگا کریں۔ اس کی درگاہ سے کوئی محروم نہیں رہا۔ دن کو بندوبست مملکت کا اور انصاف، عدالت غریب غُربا کی فریادیں، تو بندے خدا کے، دامنِ دولت کے سایے میں امن و امان خوش گُزران رہیں۔ اور رات کو عبادت کیجیے، اور دُرُود پیمبر کی رُوحِ پاک کو نیاز کر کے، درویش گوشہ نشین، متوکلوں سے مدد لیجیے۔ اور روز، راتب، یتیم، اسیر، عیال داروں، محتاجوں اور رانڈ بیواؤں کو کر دیجیے۔ ایسے اچھے کاموں اور نیک نیتوں کی برکت سے، خدا چاہے تو اُمید قوی ہے کہ تمہارے دل کے مقصد اور مطلب سب پورے ہوں۔ اور جس واسطے مزاجِ عالی مُکدر ہو رہا ہے، وہ آرزو بر آوے، اور خوشی خاطر شریف کو ہو جاوے۔ پروردگار کی عنایت پر نظر رکھیے، کہ وہ ایک دم میں جو چاہتا ہے، سو کرتا ہے۔ بارے، خرد مند وزیر کے ایسی ایسی عرض معروض کرنے سے، آزاد بخت کے دل کو ڈھارس بندھی۔ فرمایا، اچھا تو جو کہتا ہے

بھلا یہ بھی کر دیکھیں، آگے جو اللہ کی مرضی ہے، سو ہوگا۔

جب بادشاہ کے دل کو تسلّی ہوئی، تب وزیر سے پوچھا کہ اور سب امیر و دبیر کیا کرتے ہیں اور کس طرح ہیں؟ اس نے عرض کی سب ارکانِ دولت، قبلۂ عالم کے جان و مال کو دُعا کرتے ہیں، آپ کی فکر سے سب حیران و پریشان ہو رہے ہیں، جمالِ مبارک اپنا دکھایئے تو سب کی خاطر جمع ہووے، چناں چہ اس وقت دیوانِ عام میں حاضر ہیں۔ یہ سن کر بادشاہ نے حکم کیا: انشاء اللہ تعالیٰ کل دربار کروں گا، سب کو کہہ دو حاضر رہیں۔ خردمند یہ وعدہ سن کر خوش ہوا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا دی کہ جب تلک یہ زمین و آسمان برپا ہیں، تمھارا تاج و تخت قائم رہے۔ اور حضور سے رخصت ہو کر خوشی خوشی باہر نکلا، اور یہ خوش خبری امراؤں سے کہی۔ سب امیر ہنسی خوشی گھر کو گئے۔ سارے شہر میں آنند ہو گئی۔ رعیت پرجا مگن ہوئی کہ کل بادشاہ دربارِ عام کرے گا۔ صبح کو سب خانہ زاد اعلیٰ ادنیٰ اور ارکان دولت چھوٹے بڑے، اپنے اپنے پایے اور مرتبے پر آکر کھڑے ہوئے، اور منتظر جلوۂ بادشاہی کے تھے۔

جب پہر دن چڑھا، ایک بارگی پردہ اٹھا اور بادشاہ نے برآمد ہو کر تختِ مبارک پر جلوس فرمایا۔ نوبت خانے میں شادیانے بجنے لگے۔ سبھوں نے نذریں مبارک بادی کی گزرانیں۔ اور مجرا گاہ میں تسلیمات و کورنشات بجالائے۔ موافق قدر و منزلت کے ہر ایک کو سرفرازی ہوئی۔ سب کے دل کو خوشی اور چین ہوا۔ جب دوپہر ہوئی برخاست ہو کر اندرونِ محل داخل ہوئے، خاصہ نوش جان فرما کر، خواب گاہ میں آرام کیا۔ اس دن سے بادشاہ نے یہی مقرر کیا کہ ہمیشہ صبح کو دربار کرنا، اور تیسرے پہر کتاب کا شغل یا ورد وظیفہ پڑھنا اور خدا کی درگاہ میں توبہ استغفار کر کر، اپنے مطلب کی دعا مانگنی۔

ایک روز کتاب میں بھی لکھا دیکھا، کہ اگر کسو شخص کو غم یا فکر ایسی لاحق ہو کہ اس کا علاج تدبیر سے نہ ہو سکے، تو چاہیے کہ تقدیر کے حوالے کرے، اور آپ کو گورستان کی طرف رجوع کرے، دُرُود بطفیل پیغمبر کی روح کے، ان کو بخشے، اور اپنے تئیں نیست و نابود سمجھ کر، دل کو اس غفلتِ دنیا دی سے ہشیار رکھے، اور عبرت سے

گُودے، اور خدا کی قدرت کو دیکھئے، کہ مجھ سے آگے کیسے کیسے صاحب ملک وخزانہ اس زمین پر پیدا ہوئے، ولیکن آسمان نے سب کو اپنی گردش میں لاکر، خاک میں ملا دیا۔ یہ کہاوت ہے ؎

چلتی چکّی دیکھ کر، دیا کبیرا رو
دو پاٹن کے بیچ آ، ثابت گیا نہ کو

اب جو دیکھیے، سوائے ایک مٹی کے ڈھیر کے ان کا کچھ نشان باقی نہیں رہا، اور سب دولتِ دنیا، گھر بار، آل اولاد، آشنا دوست، نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے چھوڑ کر، اکیلے پڑے ہیں۔ یہ سب ان کے کچھ کام نہ آیا، بلکہ اب کوئی نام بھی نہیں جانتا کہ یہ کون تھے، اور قبر کے اندر کا احوال معلوم نہیں کہ کیڑے مکوڑے، چیونٹے، سانپ ان کو کھا گئے، یا ان پر کیا بیتی اور خدا سے کیسی بنی۔ یہ باتیں اپنے دل میں سوچ کر، ساری دنیا کو کھیل جانے، تب اس کے دل کا غنچہ ہمیشہ شگفتہ رہے گا، کسو حالت میں پژمُردہ نہ ہوگا۔ یہ نصیحت جب کتاب میں مُطالعہ کی، بادشاہ کو خرد مند وزیر کا کہنا یاد آیا اور دونوں کو مُطابق پایا۔ یہ شوق ہوا کہ اس پر عمل کروں، لیکن سوار ہو کر اور بھیڑ بھاڑ لے کر، بادشاہوں کی طرح سے جانا اور پھرنا، مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ لباس بدل کر، رات کو اکیلے مقبروں میں یا کسی مردِ خدا گوشہ نشین کی خدمت میں جایا کروں، اور شب بیدار رہوں؛ شاید ان مُردوں کے وسیلے سے، دنیا کی مراد اور عاقبت کی نجات مُیسّر ہو۔

یہ بات دل میں مقرر کر کر، ایک روز رات کو موٹے جھوٹے کپڑے پہن کر، کچھ روپے اشرفی لے کر، چپکے قلعے سے باہر نکلے اور میدان کی راہ لی، جاتے جاتے ایک گورستان میں پہنچے، نہایت صدق دل سے دُرُود پڑھ رہے تھے، اور اس وقت بادِ تُند چل رہی تھی، بلکہ آندھی کہا چاہیے۔ ایک بارگی بادشاہ کو دور سے ایک شعلہ سا نظر آیا، کہ مانند صبح کے تارے کے روشن ہے۔ دل میں اپنے خیال کیا کہ اس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی حکمت سے نہیں، یا یہ طلسم ہے کہ اگر پھٹکری اور گندھک کو چراغ میں بتی کے آس پاس چھڑک دیجیے، تو کیسی ہی ہوا چلے، چراغ گل نہ ہوگا۔ یا کسو ولی کا چراغ ہے کہ جلتا ہے۔

جو کچھ ہو سو ہو، چل کر دیکھا چاہیے، شاید اس شمع کے نور سے میرے بھی گھر کا چراغ روشن ہو، اور دل کی مراد ملے۔ یہ نیت کر کے اس طرف چلے۔ جب نزدیک پہنچے، دیکھا تو چار فقیر بے نوا، کفنیاں گلے میں ڈالے اور سر زانو پر دھرے، عالم بے ہوشی میں خاموش بیٹھے ہیں، اور اُن کا یہ عالم ہے جیسے کوئی مسافر اپنے ملک اور قوم سے بچھڑ کر، بے کسی اور مفلسی کے رنج و غم میں گرفتار ہو کر، حیران رہ جاتا ہے؛ اسی طرح سے یے چاروں نقش دیوار ہو رہے ہیں۔ اور ایک چراغ پتھر پر دھرا ٹمٹما رہا ہے، ہرگز ہوا اس کو نہیں لگتی، گویا فانوس اس کی آسمان ہے کہ بے خطرے جلتا ہے۔

آزاد بخت کو دیکھتے ہی یقین آیا کہ مقرر تیری آرزو ان مردانِ خدا کے قدم کی برکت سے بر آوے گی، اور تیری امید کا سوکھا درخت ان کی توجہ سے ہرا ہو کر پھلے گا۔ ان کی خدمت میں چل کر اپنا احوال کہہ، اور مجلس کا شریک ہو، شاید تجھ پر رحم کھا کر دعا کریں، جو بے نیاز کے یہاں قبول ہو۔ یہ ارادہ کر کر، چاہا کہ قدم آگے دھرے؛ وہیں عقل نے سمجھایا کہ اے بے وقوف! جلدی نہ کر، ذرا دیکھ لے؛ تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں، اور کیدھر جاتے ہیں؟ کیا جانیں یے دیو ہیں یا غول بیابانی ہیں کہ آدمی کی صورت بن کر، باہم مل بیٹھے ہیں۔ بہ ہر صورت، جلدی کرنا اور ان کے درمیان جا کر مخل ہونا، خوب نہیں۔ ابھی ایک گوشے میں چھپ کر، حقیقت ان درویشوں کی جانا چاہیے۔
آخر بادشاہ نے یہی کیا کہ ایک کونے میں اس مکان کے چپکا جا بیٹھا کہ کسو اس کے آنے کی آہٹ کی خبر نہ ہوئی، اپنا دھیان ان کی طرف لگایا کہ دیکھے آپس میں کیا بات چیت کرتے ہیں۔
اتفاقاً ایک فقیر کو چھینک آئی، شکر خدا کا کیا۔ وے تینوں قلندر اس کی آواز سے چونک پڑے، چراغ کو اکسایا، ٹھیپ تو روشن تھا۔ اپنے اپنے بستروں پر حقے بھر کر پینے لگے۔ ایک اُن آزادوں میں سے بولا: اے یاران ہمدرد و رفیقانِ جہاں گرد! ہم چار صورتیں، آسمان کی گردش سے اور لیل و نہار کے انقلاب سے، دربہ در خاک بہ سر ایک مدت پھریں۔ الحمدللہ! کہ طالع کی مدد اور قسمت کی یاوری سے، آج اس مقام پر باہم ملاقات ہوئی، اور کل کا احوال کچھ معلوم نہیں کہ کیا پیش آوے؛ ایک گت رہیں یا جدا جدا ہو جاویں۔ رات بڑی پہاڑ ہوتی ہے، ابھی سے پڑ پڑ رہنا خوب نہیں؛ اس سے یہ بہتر

ہے کہ اپنی اپنی سرگذشت جو اس دنیا میں جس پر بیتی ہو (بشرطے کہ جھوٹھ اس میں کوڑی بھر نہ ہو) بیان کرے، تو باتوں میں رات کٹ چلے۔ جب تھوڑی شب باقی رہے، تب لوٹ پھوٹ رہیں گے" سبھوں نے کہا: یا ہادی! جو کچھ ارشاد ہوتا ہے، ہم نے قبول کیا؛ پہلے آپ ہی اپنا احوال (جو دیکھا ہے) شروع کیجیے، تو ہم مستفید ہوں

(باغ و بہار، جامعہ اڈیشن، صفحات ۲۸۴ سائز ۳۰×۲۰/۱۶ قیمت ۲/- حوالہ ص ۵ تا ۲۶)

نئی مطبوعات

نام کتاب	مصنف	ناشر	صفحات	قیمت
موجودہ تعلیمی مسائل (تعلیم)	عبداللہ ولی بخش قادری	دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۱۶۰	۲/۵۰
چائے کے باغ (ناولٹ)	قرۃ العین حیدر	بمبئی " " "		۲/۵۰
دلی سے دلی تک (خاکے)	سید ضمیر حسن	دہلی کتب خانہ انجمن ترقی اردو	۱۳۶	۲/۵۰
مومن (ادبی)	احسان دانش	"، قصر اردو	۲۲۴	۳/۵۰
انوار نظر (نظم)	منشی نوبت رائے نظر لکھنوی	دہلی	۱۲۸	۲/۲۵
مطالعہ اور تنقید (تنقید)	اختر انصاری	علی گڑھ، فرینڈز بک ہاؤس	۳۲۰	۵/۵۰
تذکرہ حضرت دیوان شاہ	ڈاکٹر محی الدین	تھانہ بھون		۱/۵۰
لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر عبداللیث شادانی	دہلی، مکتبہ علم و فن	۸۹۶	۱۵/-
تحقیق کی روشنی میں (ادبی)	ڈاکٹر عندلیب شادانی	" ، " "	۵۲۶	۱۰/-
بے باک (ناول)	عظمت رضا	" ، " "	۲۸۸	۵/-
آبلہ پا (")	رضیہ فصیح احمد	" ، " "	۴۰۰	۷/۵۰
شوکت تھانوی کی مزاحیہ شاعری	شوکت تھانوی	"، ہندستان پبلیکیشنز	۱۱۶	۱/-
نقطۂ نظر (تنقید)	عبدالغنی	پٹنہ، کتاب منزل سبزی باغ	۴۱۲	۵/۷۵
تنقید و تحقیق (")	اسلوب احمد انصاری	الہ آباد، انیس اردو		۴/۹۰
رواداری	"	"		۲/۵۰
غالب کے کلام میں الحاقی عناصر	نادم سیتاپوری	لکھنؤ، فروغ اردو		۲/۵۰

ہمیں افسوس ہے صفحات کی کمی کے باعث اس ماہ "شراب کہنہ" نہ پیش کر سکے۔ (ادارہ)

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

از: مالک رام
صفحات: ۳۶۵ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت: ۲۵/۴
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ذکر غالب
(سن اشاعت ۱۹۶۵ء)

غالب کی سیرت یا ان کی شخصیت سے متعلق اُردو میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن میں "ذکر غالب" کو ایک امتیازی اور مستند حیثیت حاصل ہے۔ اس کی مقبولیت و افادیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ۱۹۳۸ء سے اب تک یہ کتاب چار بار چھپ چکی ہے۔

موجودہ ایڈیشن اپنی پچھلی اشاعتوں کے مقابلے میں بسیط، ضخیم نیز تازہ ترین انکشافات اور تحقیقات کا مجموعہ ہے۔

مالک رام صاحب کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کی پہلے اچھی طرح سے چھان بین کر لیتے ہیں، اپنی تحقیقی کاوشوں کو کسی ایک وسیلے یا ایک زبان تک محدود نہیں رکھتے بلکہ موضوع سے متعلق جو مواد یا مسالا جہاں کہیں سے ان کو ملتا ہے اُسے غائر نظر سے دیکھتے ہیں پھر اس کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اگر اس میں صحت و صداقت کا کوئی پہلو ملتا ہے تو اس کا اعتراف اور اظہار کرتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو اس کی طرف لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کو آگاہ اور متوجہ کر دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ دورِ حاضر کے ایک نہایت مستقل مزاج اور وسیع النظر محقق نیز غالبیات کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

"ذکر غالب" ان کی ایک ایسی معقول اور جامع کتاب ہے جس میں غالب کی زندگی کے تمام ضروری حالات و کوائف اور سیرت و شخصیت کو واضح یا نمایاں کرنے والے

جلد واقعات اور نکتے اس ترتیب اور سلیقے کے ساتھ قلم بند کر دیے ہیں کہ اس کو پڑھ کر پھر کسی دوسری کتاب کو پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

موجودہ اڈیشن کی عبارتوں اور عنوانات میں کئی ایک ایسے مفید اور معقول اضافے ہیں جن سے غالب کی عظمت اور ان کی حیثیت زیادہ مستحکم اور مسلّم ہو جاتی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ مکتبہ جامعہ نے کتاب کی اشاعت میں اپنی روایات کے مطابق، حسنِ طباعت کے لوازمات اور بلند معیار کو برقرار رکھا ہے۔

(رشید نعمانی)

نشریاتِ ماجد
(حصہ اول)

از: عبدالماجد دریابادی
صفحات: ۲۶۴ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ۳/۵۰
ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

ریڈیائی تقاریر کی تنگ دامنی اور تنگ نظری مشہور ہے۔ وہاں صرف قلتِ وقت کا ہی مسئلہ نہیں ہوا کرتا بلکہ سرکاری مصلحت اندیشیاں بھی اظہار خیال کے لیے دیوارِ زنداں ثابت ہو جاتی ہیں۔ اس لیے نشریے اپنا ایک مخصوص اور محدود دائرہ رکھتے ہیں۔ لیکن مولانا نے اس خاک ناٸرے سے بھی علم و حکمت کے گوہر لٹائے ہیں اور خوب لٹائے ہیں 'نشریاتِ ماجد' میں ان کا اسلوب و لہجہ اور کردار صاف عیاں ہے۔ اس علمی، دینی، ادبی ۳۳ نشری گفتگوؤں کے مجموعے سے ان کے مزاج و مذاق کی نمائندگی بخوبی ہو جاتی ہے۔

اس مجموعے میں 'قرآن کیا ہے'، 'کربلا اور اسلام'، 'رحمۃ للعالمین'۔ جیسے عنوانات بھی موجود ہیں اور 'فلسفۂ غالب'، 'میر تقی میر'، 'امراؤ جان ادا' بھی۔ یہاں 'مولانا محمد علی'، اور 'مولانا عبدالباری' کی موضوعات ہیں اور 'ظلم در عاشقی' اور 'دہشت' اور 'سہرا گرا ٹوٹ' بھی۔ مولانا نے اپنے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے کہ "یہ جلد وسط ۱۹۵۱ء پر ختم ہو جاتی ہے ۱۰ اس کے بعد کے نشریات انشاء اللہ جلد دوم میں نظر آسکیں گے۔" اور آخر میں ۱۲ر مئی ۱۹۶۵ء تاریخ درج ہے۔ یعنی یہ مئی ۱۹۶۵ء ہے اور پہلی جلد کا تذکرہ؟ کتابت و طباعت کے اعتبار سے یہ کتاب

بھی انشائے ماجد کی طرح معمولی حیثیت رکھتی ہے جو کسی طور مولانا کی نگارشات کے شایانِ شان نہیں کہلائی جا سکتی۔ تاہم یہ نوادرات کم از کم یکجا تو ہو رہے ہیں۔ اس لیے حالات متقضی ہیں کہ ایں ہم غنیمت است کہہ کر ہی اپنے آپ کو بہلا لیا جائے۔

آہ اپنی گوناں گوں خصوصیات و صفات کی بنا پر مولانا کی شخصیت اپنے عہد کی تہذیب کو سموتے ہوئے نظر آتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ"! مولانا کی "ان تحریری گفتگوؤں" سے زبان دانی اور تذکیہ نفس دونوں کا کام لیا جا سکتا ہے۔

(عبداللہ ولی بخش قادری)

نقشِ جاوداں

(سنِ طباعت ۱۹۶۴ء)

شاعر: پرنس نقی علی خاں ثاقب
صفحات: ۱۲۸ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$
قیمت: -/۳
ناشر: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان، حیدرآباد ۲ اے پی

پرنس نقی علی خاں ثاقب نے اپنے دس برس کے شعری سرمایہ کو "نقشِ جاوداں" کے روپ میں بنام "شاہدِ نازک خیالاں" منسوب کیا ہے۔

خورشید احمد جامی اور اختر حسن ایم اے، سابق مدیر "پیام" نے شاعر کے ذہن اور شعری صلاحیتوں کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ سرورق پر فن کار کے چند جملے بھی قابل توجہ ہیں۔

"غموں کی آنچ۔ مسرتوں کے پھول اور مشاہدات و محسوسات کے بے شمار اڑتے ہوئے لمحات ہی میرا فن ہیں" (ثاقب)

"نقشِ جاوداں" کے مطالعے سے قاری کو معلوم ہوگا کہ ان باتوں میں سچائی ہے۔ وطن پرستی، رومان اور سوشلزم کی تعمیر اس شعری تخلیق کے نمایاں نقوش ہیں۔ شاعر کا ذہن رجائی اور لب و لہجہ دل پذیر و اثر آفریں ہے ـــــ نظموں کی فضا غزلوں سے زیادہ بہتر ہے ـــــ اے نگارِ سحر، بلاوا، پتھراؤ، یاد عمدہ نظمیں ہیں۔ بہترین نظم "تلاش" ہے۔

"اپنے بچّے سے" نہایت موثر اور اچھوتی نظم ہے ۔ انداز غزل پہچاننے کے لیے تین شعر کافی ہیں ۔

منزلیں تیرگی میں ڈوب گئیں حادثے بن گئے سفر کے چراغ
خوابوں کی فصیلوں پہ سحر ڈھونڈنے والو تاریک فضاؤں میں نئے زخم اچھالو
بنامِ حُسنِ غزل دلبروں کی آنکھوں سے کچھ اور خواب چراؤ تو بات بن جائے

کتاب کا سرورق فن کارانہ ہے ۔ کاغذ نفیس اور کتابت وطباعت عمدہ ہیں ۔ شاعر کی تصویر "نقش جاوداں" کا ایک حسین جز ہے ۔

(سلمٰی پریمی)

اسباق النحو
(حصہ اول)

از: مولانا حمید الدین فراہی
صفحات: ۵۶ سائز: ۱۸ × ۲۲ / ۸
قیمت: ۱/۲۵
ناشر: دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

مولانا حمید الدین صاحب فراہی کی ذات محتاج تعارف نہیں، وسعت علم، دقت نظر اور اصلاحی مذاق کے اعتبار سے ان کو اپنے معاصرین میں خاص امتیاز حاصل تھا۔ قرآن مجید کی تفسیر کے علاوہ ان کے اور بھی اصلاحی کارنامے یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ عربی کی کئی درسی کتابیں اس غرض سے لکھیں کہ ان سے طلبا کو فن کی تحصیل میں سہولت بھی ہو اور پرانے نقطہ نظر کی جگہ نئے انداز سے واقفیت بھی ہو۔

پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک مفید کتاب ہے اس کتاب کے ذریعہ طلبا نہ صرف عربی قواعد آسانی کے ساتھ سیکھ سکتے ہیں بلکہ ان کے استعمال کی مشق اس طرح ہوجاتی ہے کہ عربی لکھنے اور سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن پچاس ساٹھ سال پہلے شائع ہوا تھا۔ تعلیمی تجربات کی روشنی میں مصنف مرحوم نے اس میں کچھ اصلاحات کیں پھر ان کے لائق شاگرد نے کچھ اضافے کیے۔ ان اصلاحات اور اضافوں کے ساتھ گزشتہ سال یہ کتاب پھر شائع کی گئی ہے امید ہے کہ اب طلبا اس سے پہلے سے زیادہ مستفید ہوں گے۔

(عبدالسلام قدوائی)

ایک ہزار روپیہ کا انعام چنڈی گڑھ، پنجاب کی زبانوں سے متعلق محکمہ نے اُردو کے مشہور نوجوان شاعر نریش کمار شاد کی کتاب "مطالعے" کو اس سال کی بہترین تصنیف قرار دیا ہے۔ اور مصنف کو ایک ہزار روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔

ایک پُرانے پیامی کا خط رسالہ آئینہ میں پیامِ تعلیم کا اشتہار دیکھ کر بے اختیار آپ کو خط لکھنے کو دل چاہا اُمید ہے پیامِ تعلیم اپنے پرانے معیار کے مطابق نکلنے لگا ہوگا۔ ۱۹۴۰ء سے لے کر ہم لوگ ۱۹۴۵ء تک پیامِ تعلیم کے خریدار رہے ہیں اور ہم سب بھائی بہنوں نے پیامِ تعلیم سے بہت کچھ سیکھا ہے ہم لوگوں کے کردار کو بنانے میں جتنا ہاتھ پیامِ تعلیم کا ہے اس کا اندازہ شاید ٹھیک سے ہم لوگ بھی نہیں کرسکتے۔ آپ کا (ڈاکٹر) عبدالمجیب قدوائی۔ لکھنؤ

از: شاہ تراب چشتی

من سمجھاون

مرتبہ: ڈاکٹر عبدالستار دلوی

من سمجھاون مشہور مراٹھی شاعر رام داس کی نظم "مناچے شلوک" کا آزاد ترجمہ ہے جسے ترناپلی (مدراس) کے صوفی شاعر شاہ تراب چشتی نے ۱۱۷۰ھ کے قریب دکنی اردو میں نظم کیا ہے۔

قیمت: ۲/۲۵

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

سالانہ ایک روپیہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵	فی پرچہ ۱۰ پیسے

پرنٹر پبلشر سید احمد دہلوی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

کچھ اچھی کتابیں

نظم

اُردو شاعری کا انتخاب	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ	۶/۵۰
آتشِ گل	جگرؔ مرادآبادی	۶/-
بیکراں	جگن ناتھ آزادؔ	۴/۵۰
بزمِ خیال	سیدہ فرحت	۱/-
جوئے شیر	آنند نرائن مُلّا	۵/-
حدیثِ دل	غلام ربانی تاباںؔ	۲/۲۵
حرفِ تمنا	میکشؔ اکبرآبادی	۲/-
دو نیم	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۲/۲۵
شہرِ آرزو	باقرؔ مہدی	۲/۵۰
صدائے دل	ساحرؔ بھوپالی	۲/-
فروزاں	جذبیؔ	۲/۲۵
متاعِ تسکین	تسکینؔ قریشی	۲/-

Regd. No. D. 58 June, 1965

Kitab Numa

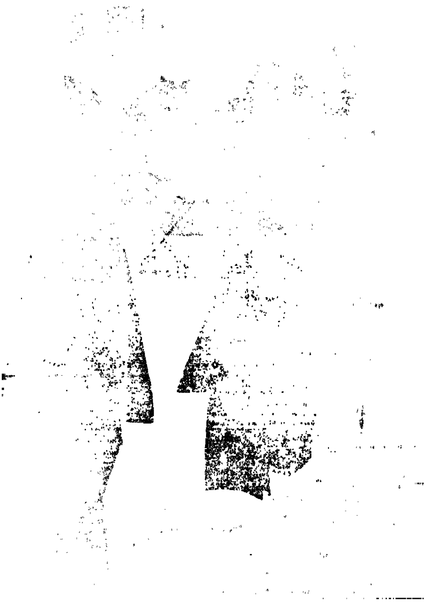
JAMIA NAGAR. NEW DELHI. 25.

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی



صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن پروفیسر محمد مجیب کو پدم بھوشن کا تمغہ عنایت فرما رہے ہیں

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

منیجنگ ایڈیٹر
غلام ربانی تاباں

جلد نمبر ۶ | جولائی ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۷

اشاریہ

آپ کو یاد ہوگا اس سال یوم جمہوریہ کے موقعے پر حکومت ہند کی طرف سے جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب، (وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین) کو بھی ان کی علمی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے "پدم بھوشن" کا معزز خطاب دیے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ۱۲ر مئی کو راشٹرپتی بھون میں ایک مخصوص جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں ملک کے ان تمام حضرات کو جنھیں مختلف اعزازت سے نوازا گیا تھا، مدعو کیا گیا اور صدر جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر رادھا کرشنن صاحب نے اپنے دست مبارک سے تمغے اور سندیں عطا فرمائیں۔ ہم حکومت ہند کو اس صحیح انتخاب پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہم مجیب صاحب کی خدمت میں بھی کارکنان مکتبہ جامعہ کی طرف سے پرخلوص ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ ہم جناب سلام مچھلی شہری کی اس مبارک باد اور دعا میں بھی شامل ہوتے ہیں جو انھوں نے نظم میں پیش کی اور جس کے دو شعر خاص طور سے ان گنت دلوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

"سرکار نے دیا ہے جو اعزاز انھیں سلام
شامل ہے اس میں ان کے لیے جذبۂ عوام
تبریک ہی کے ساتھ مری یہ دعا بھی ہے
بخشے خدائے پاک انھیں عزتِ دوام"

عبداللہ ولی بخش قادری

موجودہ تعلیمی مسائل

(چھوٹے بچوں کی تربیت)

یہ صدی "بچوں کا زمانہ" کہلاتی ہے۔ مہذب دنیا نے بچے کی شخصیت کا احترام سکھایا ہے اور "انسانی حقوق" کے ساتھ ہم آج "بچوں کے حقوق" کا بھی اعلان کرتے ہیں۔ لیکن بچے کی تربیت کے معاملے میں عموماً ہمارا زور اس کے "مطالعے" کی طرف رہا ہے۔ ہم اسے اوپر سے دیکھتے ہیں اور اس کے بارے میں اعداد و شمار اکٹھا کرتے ہیں۔ مثلاً بچہ کتنا لمبا پیدا ہوتا ہے پیدائش کے وقت ایک عام بچے کا وزن کیا ہوتا ہے۔ بچے کا پہلا دانت آٹھ ماہ سے قبل ہی نکل آتا ہے۔ ڈیڑھ سال کا بچہ پانچ لفظ بول لیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور اس طرح کی معلومات کی ذریعے ہم نے تمام بچوں کا حساب جوڑنا شروع کر دیا ہے۔ عام حیثیت کا بچہ کون کہلائے گا؟ بڑھیا کون ہے اور گھٹیا کون؟ اس قسم کی واقفیت حاصل کرنے سے بچے کو سمجھنے میں آسانی یقیناً ہوئی ہے اور مسلسل مطالعے سے واقعات کا ربط کبھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس طرح یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بچے کی نشوونما میں خاص موڑ کب آتے ہیں اور بچہ اپنی زندگی کی مختلف منزلیں کس شان سے طے کرتا ہے، ہر ایک دور میں اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور ہمیں اس سے کیا توقعات ہونی چاہئیں، اس لیے اگر دو تین سال کا بچہ "انکار" کی منزل میں پہنچ جاتا ہے۔ خواہ اس سے کیسی ہی پیار کی بات کیوں نہ کریں، وہ منع ہی کرتا ہے تو ہمیں ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا کیوں کہ ہماری معلومات نے ہمیں باخبر کر رکھا ہے کہ بچے کی یہ بات اس کی عمر کا تقاضا ہے۔ اس خاص زمانے میں اسے ایسا ہی کرنا چاہیئے کیوں کہ عموماً سب بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن ان باتوں کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ہمارا یقین ہو گیا ہے کہ بچے کی ترقی قطعی طور پر بندھی ٹکی ہوتی ہے اس کی نشوونما میں قدرت کے قانون اپنا عمل، دخل چلاتے رہتے ہیں۔ ہم ان اصولوں کو

دیکھیں اور سمجھیں اور انھیں سرکاری قانون کی طرح مان لیں اور بس! اس معاملے میں گویا تعلیم و تربیت صرف سہولت پیدا کرتی ہے اور کچھ نہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے اوپر لازم آتا ہے کہ بچے کی دل چسپیوں پر توجہ دیتے رہیں۔ اس کے حرکات و سکنات کا مطالعہ کرتے رہیں اور اپنے مطالعے کی روشنی میں ہر ایک بچے کو پہچانیں۔

لیکن بچے کو اس طرح سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کو اب زیادہ سراہا نہیں جارہا ہے روز بروز اس کے اس بے تعلق جائزے کے بے جان پن کا احساس بڑھتا جارہا ہے۔ بچے سے نسبت رکھنے والوں اور واقفیت پیدا کرنے والوں میں سے ایک جماعت کا خیال ہے کہ بچے کے بارے میں ہمارا مطالعہ اور اس کا دیدہ یا شنیدہ 'بیان' بذاتِ خود بچے کی طبیعت کی رنگینی، پیچیدگی اور انفرادیت کو پورے طور پر ظاہر نہیں کرتا۔ یہ واقفیت ہمیں صرف 'کیا ہے' تک پہنچاتی ہے اور 'کیوں ہے' کے جواب سے ہم پھر بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ مثلاً ہم کہہ چکے ہیں کہ دو تین سال کا بچہ 'منع' بہت کرتا ہے۔ وہ 'نہیں نہیں' کی رٹ لگایا کرتا ہے۔ لیکن کیا یہ ایک ضروری عمل ہے۔ کیا یہ بچے کی فطرت کا مطالبہ ہے یا کچھ اس کے ماحول کا تقاضہ بھی ہے۔ بچے کی طبیعت کی اس خصوصیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ والدین اور دوسرے متعلقین کا رویّہ اس کے ساتھ کیا ہے۔ دراصل اس کے مزاج کی چاشنی، داخلی اور خارجی دونوں حالات سے مل کر تیار ہو رہی ہے۔ بچوں کے عمل کا بیان، صرف بیان کافی نہیں ہے بلکہ اس کی معقولیت کے بارے میں بھی ہمیں سوچنا ہوگا۔ بچے کا ایک مخصوص عمل، مناسب معتدل یا معقول کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں۔ جیسے ہم نے کہا کہ بچے کا 'منع کرنا' مناسب اور معقول ہے کیوں کہ دو تین سال کے سب بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ بچہ زیادہ 'انکار' کرتا ہے اور بچی کم۔ ایسی صورت میں کیا ہم اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچی کے مقابلے میں بچہ زیادہ معقول ہے؟ اب اگر یہ مان بھی لیں تو ایک انکشاف اور ہوتا ہے۔ کچھ محققین کا ارشاد ہے کہ اونچے گھرانوں کا بچہ زیادہ 'انکار' کرتا ہے اور معمولی گھروں کی بچی۔ اب بتایئے کس کا عمل زیادہ مناسب اور معقول ٹھیرائیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کی یہ "نہیں نہیں" اپنے حالات کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ہر ایک سماج کے اپنے طور طریقے ہوا کرتے ہیں۔ مزاج اور مذاق کا فرق بڑا نمایاں ہوتا ہے۔ اس

لیے بچے کا عمل، وقت، اور جگہ کے تعلق کے بغیر مناسب معنوں میں عام نہیں کہلایا جاسکتا ہے ہمیں بچے کو پہچاننے اور جاننے کے لیے اس کے ماحول کو بھی دیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے شوق میں بچے کو صرف بدیسی لباس ہی نہیں پہناتے ہیں بلکہ اسے بدیسی بچوں کے عادات واطوار کے پیمانے سے ناپنے بھی لگتے ہیں۔ ہم نے غیر ملکی بچے کے حالات پڑھ کر جو ذہنی تصویر بنائی ہے اسے اپنے نور نظر پر چسپاں بھی کرنا چاہتے ہیں اور اپنی نادانی میں اسی کاغذی پیرہن کے مطابق اپنے جیتے جاگتے بچے کو دیکھنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ اس لیے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے پیمانے خود بنائیں اور دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہم حالات کے ربط کے ساتھ ان پیمانوں کو برتیں۔ یہ پیمانے 'وقت' اور 'مقام' دونوں کے لحاظ سے بدلا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک بچہ دہلی میں پلتا بڑھتا ہے اور دوسرا کسی معمولی قصبے یا گاؤں میں۔ ان دونوں بچوں کی بول چال اور رنگ ڈھنگ میں فرق لازمی ہے۔ اسی طرح مجھے سمجھنا چاہیئے کہ میرے بچپن اور میرے نرسری اسکول جانے والے بچے کے بچپن میں تیس سال کا زمانہ حائل ہے۔ اس لیے تیس سال پہلے کا عام انداز غالباً آج کا عام انداز نہ رہا ہو۔ اور مناسب و معتدل رویّے کا حساب لگاتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ اس بنا پر بچوں کے برتاؤ کو سمجھنا دشوار ہے جب تک کہ ہم اسے کسی ماحول سے مطابقت دے کر نہ سمجھیں۔ ایک مغربی دیس کے بچے میں اور ہمارے بچے میں جو فرق ہے، وہ دراصل سماج کا ہے جس کے وہ دونوں بچے ہیں۔ اس لیے اس سماج اور تہذیب پر توجہ دینی ہوگی جو شروع سے ہی بچہ پاتا ہے۔ اگرچہ اس نظریے میں بچے کی ترقی کے اصولوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا لیکن یہ نظریہ ان تعلقات پر زور دیتا ہے جن سے بچے کی زندگی وابستہ ہے۔ ہم اسی قدر اس معاملے میں دل چسپی رکھیں کہ دوسرے لوگ بچے کے ساتھ اور بچے کے لیے کیا کرتے ہیں جس قدر ہمیں اس بات میں دل چسپی ہے کہ بچہ خود کیا کرتا ہے

نشوونما کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک متعینہ شکل میں بچہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہے بلکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو اپنے سماجی اور طبعی حالات کے تحت رونما ہوتا ہے۔ ایک بچہ کیا ہے اور وہ کیا کرتا ہے۔ اس کا انحصار حالات پر ہے لیکن کیا یہ نظریہ بچے کو ایک کھلونا نہیں بنا دیتا جسے حالات بناتے، بگاڑتے ہیں؟ کیا اس کا سارا عمل،

محض حالات کی دین ہے ؟ ہمارا جواب ہے 'نہیں' ہمیں بچے اور اس کے ماحول، دونوں کو دیکھنا چاہیے۔ بچہ ایک ذی روح کی حیثیت سے کچھ صلاحیتیں اور استعداد رکھتا ہے۔ یہ بچہ کسی مخصوص سماج میں جنم پاتا ہے، اس کی ترقی، دونوں کے ردِّ عمل کا نتیجہ ہے۔ اسے کچھ کرنے کا موقع ملے گا اور کچھ کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ وہ کچھ کرتا ہے۔ شاید تنہا چھوڑ دیا جاتا تو نہ کرتا۔ اس طرح وہ اپنے سماج کے طور طریقوں کو سیکھتا ہے اور بالآخر اپنے سماج کا ایک ذمہ دار رکن بن جاتا ہے۔ اس عمل میں بچہ، سیکھنے والا ہے اور اس کے والدین، اساتذہ اور ماحول کے دوسرے عناصر سیکھنے کا ذریعہ۔ لیکن اصل دشواری انتخاب کی پیش آتی ہے۔ بچے کے سامنے بہت سی چیزیں آتی ہیں لیکن اسے اچھے، بُرے، کی تمیز نہیں ہوتی اس لیے بچے کو اچھا ماحول اور مناسب محرکات دینے کی ذمہ داری سماج پر آتی ہے۔ ایک نرسری اسکول، اسی ذمہ داری کو نباہنے کا ایک ذریعہ ہے۔

ہمارے دیس میں صدیوں سے "کنھیا کا بال پن" گایا جاتا ہے۔ لیکن ہمارا بالک آج بھی گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم اپنے بڑوں کے بچپن پر خواہ ایک اچھی سی کتاب چھاپ لیں، لیکن بچے کے لیے ایک اچھی کتاب کو فضول خرچی ہی سمجھتے ہیں۔ ہم نے دھرتی کے لال کو وبال ہی مانا ہے اور اس کی ضرورتوں کو اس کی خاطر شاید ہی کبھی پورا کرنے کا خیال آتا ہو اگر بچے پر لاڈ آجاتا ہے تو اسے ضدی، اکل کھُرا، تانا شاہ یا مرزا پھویا بنا کر چھوڑتے ہیں ورنہ اس کی طرف اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ وہ ندیدے، جھگڑالو، اور روتیاں بنتے رہتے ہیں۔ اور مٹتے رہتے ہیں۔ ان کی تربیت کا کیا سوال۔ انھیں ہم اپنا تن پیٹ کاٹ کر کھلاتے تو ہیں اور کیا چاہیے! لیکن یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ اب ہم چونک رہے ہیں اور ابتدائی مدرسے سے پہلے کی تعلیم پر توجہ دی جانے لگی ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں صرف اٹھائیس ہزار کے قریب یہ چھوٹے بچے تربیت پا رہے تھے لیکن پانچ سال بعد یہ تعداد کچھ ہزار ہوگئی اور اب تین لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں پانچ ہزار بال واڑیاں، قائم ہیں جن میں سے تقریباً نصف مرکزی اور ریاستی سرکار سے امداد پاتی ہیں۔ اس تیسرے پنج سالہ قومی منصوبے میں بال سیوکاؤں کی تربیت کے لیے چھ مرکزوں کا قیام طے پایا ہے۔ بچوں کی دیکھ ریکھ کے کاموں کے لیے مرکزی حکومت نے تین کروڑ

روپیہ منظور کیا ہے اور ایک کروڑ روپیہ ریاستوں کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ سماجی ترقی (کیونٹی ڈولپمنٹ) اور سماج سیوا پروگرام (سوشل ویلفیر پروگرام) کے اداروں کے وسائل بھی اس کام کے لیے موجود ہیں۔ ایسی صورت میں اب امداد کی کمی کا سوال بہت اہم نہیں ہے۔ پہلے تو یہ کام صرف رضاکارانہ طور پر ہی انجام پاتا تھا۔ اب تو قومی حکومت بہرحال دست گیری کر رہی ہے۔ اس وقت دراصل سب سے زیادہ ضرورت چھوٹے بچوں کی نگہداشت کرنے والی بال سیوکاؤں کی تعلیم کی ہے۔ اس کے بعد بچے کی تربیت کے جدید نقطۂ نظر کے پیش نظر اس کے ماحول کی مطابقت اور اس کی ضرورت کے مطابق، اس کے لیے سامان فراہم کرنے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یوں تو ہم سب بچے کی زندگی میں کھیل کی اہمیت سے واقف ہیں لیکن اس کی حیثیت اور نوعیت کا سوال کچھ کم ہی ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ ہم اوّل تو کھیل کی چیز کو بس کھیل سمجھتے ہیں یعنی ناقابل توجہ اور اگر کسی قدر کرتے بھی ہیں تو محض قیمت کے اعتبار سے۔ سچ تو یہ ہے کہ عموماً ہم بچے کو اپنی پسند کے مطابق کھیل کھلاتے ہیں اسے کھلونا دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ہماری خواہش کے مطابق اسے استعمال کرے۔ آپ نے غالباً ایسے بھی محتاط والدین دیکھے ہوں گے جو بچوں کے کھلونوں کو بہ حفاظت تمام سجا کر رکھتے ہیں اور بچوں کو ان سے کھیلنے نہیں دیتے، انھیں کھلونے کے ٹوٹنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور بچے کے دل کو ٹھیس پہنچاتے وقت ذرا تامل نہیں کرتے وہ اس بات پر خفا ہوتے ہیں کہ بچے نے ایک قیمتی کھلونا توڑ ڈالا۔ گویا ان کے نزدیک بچے نے کوئی نہایت ہی نامعقول کام کیا ہے۔ غالباً بچے کے لیے لازم تھا کہ اس کھلونے کو محفوظ رکھتا اور پچیس تیس سال بعد ایک بڑے منافع کے ساتھ اسے فروخت کرتا۔ غرض یہ کہ ہم بچے کے کھیل اور کھلونے کے بارے میں تجاہل اور تغافل دونوں ہی کا شکار ہیں۔ ہمارے نرسری اسکول، اس طرف توجہ تو ضرور کرتے ہیں لیکن عموماً ان کے پاس انمل بے جوڑ بدیسی سامان زیادہ نظر آتا ہے۔ اس بنا پر اس سامان کی حیثیت بہت کچھ نمائشی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے اس معاملے میں خاص توجہ کی ضرورت ہے چھوٹے بچوں کی ضروریات اور ان کے مطابق کھیل کا سامان فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش ہمیں کرنی چاہیے۔

جامعہ نرسری اسکول میں برابر کوشش ہوتی رہی ہے کہ بچوں کا تربیتی سامان، مقامی طور پر تیار ہوتا رہے۔ اس طرح ایک طرف لاگت بھی کم آتی ہے اور دوسری طرف سامان اپنی ضرورت کے مطابق تیار ہو جاتا ہے۔ اس معاملے میں اگرچہ ہم نے دوسرے ممالک کی چیزوں کو پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنایا ہے لیکن ان کے رنگ روپ میں آپ کو خانہ سازی کی سادگی کے ساتھ ساتھ افادیت کا پہلو بھی نظر آئے گا۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ سب اس معاملے میں ہمیں مشورہ دیں۔ ہمارا خیال ہے کہ چھوٹے بچوں کے لیے تربیتی سامان کے مقامی مرکز کھلنے چاہیئں اور ان کی رہنمائی کے لیے ہمارے ماہرانِ تعلیم کو قدم اٹھانا چاہیے۔ نرسری اسکول کے اندر ہم تربیتی سامان کو نہ صرف ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اس کو کافی بھی خیال کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا یقین رہا ہے کہ بچے کو اس منزل پر باقاعدہ پڑھانے لکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کھیل کود اور ذہنی بیداری کے لیے مناسب سامان، سمجھ داری کے ساتھ دیا گیا تو بچے کی ذہنی ترقی بخوبی ہو سکے گی اور وہ اپنی عمر کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو یقیناً بیدار کر سکے گا لیکن ہمارا یہ احساس ان احباب کو گراں گزرتا ہے جو بچے کی انگلی پکڑ کر اسے ناک کی سیدھ لے جانا چاہتے ہیں تاکہ زندگی کی مسافت کم سے کم طے کرنی پڑے۔ ان کے نزدیک نرسری اسکول کا زمانہ تضیعِ اوقات کی حیثیت رکھتا ہے۔ کھیل کود اور دوسرے مشغلوں میں بلاوجہ بچے کا قیمتی وقت خراب کیا جاتا ہے۔ اسے جلد سے جلد کتاب خواں، اور حساب داں بنانا چاہیے۔ سیدھی سی بات ہے جس قدر جلد بچہ طفلِ مکتب بنے گا، اسی قدر پہلے فارغ التحصیل ہوگا۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ بات نہ حقیقت اندیشی ہے اور نہ دور اندیشی۔ نرسری اسکول میں بچے کی بے ضابطہ تربیت، اس کی صلاحیتوں کے ابھارنے میں زیادہ مددگار ہوگی اور ابتدائی مدرسے کی تعلیم کے لیے وہ زیادہ موزوں طور پر تیار ہو سکے گا۔ ہمارے اس مدرسے میں ایک ہی بستی کے بچے آتے ہیں اور قریب قریب سب کا تہذیبی سرمایہ یکساں ہے۔ ہم نے ان کی ضرورتوں کے مطابق ہی اس مدرسے کو بنانے کی کوشش کی ہے۔ غالباً ہماری یہ روش، بچے کی تربیت میں ماحول کی مطابقت پر زور دینے والوں کو پسند آئے گی۔

("مجموعہ تعلیمی مسائل" سائز $\frac{30 \times 20}{16}$ صفحات ۱۴۰ قیمت ۲/۵۰ حوالہ صفحہ ۱۲۱ تا ۱۲۸)

سردار جعفری

غزل

میں جہاں تم کو بلاتا ہوں وہاں تک آؤ
میری نظروں سے گزر کر دل و جاں تک آؤ

پھر یہ دیکھو کہ زمانے کی ہوا ہے کیسی
ساتھ میرے مرے فردوسِ جواں تک آؤ

حوصلہ ہو تو اڑو میرے تصور کی طرح
میرے تخئیل کے گل زارِ جناں تک آؤ

تیغ کی طرح چلو چھوڑ کے آغوشِ نیام
تیر کی طرح سے آغوشِ کماں تک آؤ

پھول کے گرد پھرو باغ میں مانندِ نسیم
مثلِ پروانہ کسی شمع تپاں تک آؤ

لو وہ صدیوں کے جہنم کی حدیں ختم ہوئیں
اب ہے فردوس ہی فردوس جہاں تک آؤ

چھوڑ کر وہم و گماں حسنِ یقیں تک پہونچو
پر یقیں سے بھی کبھی وہم و گماں تک آؤ

اسی دنیا میں دکھا دیں تمہیں جنت کی بہار
شیخ جی تم بھی ذرا کوئے بتاں تک آؤ

(ایک خواب اور" مجموعہ کلام سائز ۱۸x۲۲/۸ صفحات ۲۰۲ قیمت ۷/- حوالہ ...)

سید ضمیر حسن دہلوی

بی عورت کی کہانی
بُوا صداقت کی زبانی

اللہ رکھے صداقت بوا کسی تعارف کی محتاج نہیں اور اگر ان کا تعارف کرانا ہو تو پھر کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا ہوگا جس نے ان کی جوانی دیکھی ہو چڑھ چڑھاؤ دیکھا ہو۔ ان کی اپنی کہن تو یہ ہے کہ جوانی میں باپ اور بھائیوں کے علاوہ کسی نے ان کی پرچھائیں تک نہ دیکھی تھی۔ بس پہلے پہل، اللہ بخشے، ان کے میاں نے دیکھا اور شاید وہ تاب نہ لا سکے، کیوں کہ بے چاری صرف سات سال سہاگن رہ کر رانڈ ہو گئیں۔ مگر صاحب یہ انھیں کا جامہ تھا کہ سارا رانڈاپا اسی وضعداری سے کاٹا اور آج تک برٹیوں کے کٹہرے کے پاس جامن والے مکان میں بڑی آن بان سے رہتی ہیں۔ میں نے تو ان کا زوال ہی دیکھا مگر سچ کہتا ہوں اس گھٹتی کے زمانے میں بھی مغلوں کے وقار کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔

کوئی اسّی بچاسی برس کی عمر ہوگی۔ سفید سر، کمر میں ہلکا سا خم، پوپلا منہ جس میں اب صرف عقل ڈاڑھیں ہی باقی بچی ہیں۔ چہرے پر معمولی سی جھرّیاں مگر رنگ ایسا جیسے انڈے کا چھلکا۔ سفید سفید کھال میں سرخی یوں جھلکتی ہے جیسے دودھ کی نہر میں سیندور گھلا ہو۔ ہاڑ کباڑ بھی ماشاء اللہ خوب ہے۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، چوڑی تختہ سی کمر، اور آواز کا تو کہنا ہی کیا، بس جیسے شیر کی گرج۔ اللہ جانے اگر ہم چیخ کر بولیں تو ان کے آگے ممینے لگیں۔ جامنوں کے موسم میں بچے اکثر ان کی چھت پر یورش کر دیتے ہیں مگر انھوں نے ایک دھاڑ ماری اور بچوں کی نوتھ میں کھلبلی مچی۔ کوئی اِدھر دوڑا کوئی اُدھر بھاگا، کیا مجال کہ ایک بھی کمر آ رہا ہے۔ کبھی پچکے چپکے غیبت کرتی ہیں تو سات گھر پرے آواز جاتی ہے یوں تو

بوا صداقت میں ہزاروں خوبیاں ہیں مگر دوسروں کو بُرا بھلا کہنے سے انہیں بادشاہ بھی نہیں روک سکتا۔ خود کہا کرتی ہیں ''اے بوا خلق کا حلق کس نے پکڑا ہے، بات منہ تک آتی ہے تو کہی جاتی ہے۔ اس میں کوئی بُرا مانے یا بھلا۔ واہ جی یہ خوب بات ہے کہ دل میں رکھو تو کینہ ور کہلاؤ، منہ پر کہو تو دل آزاری کا ڈر۔ پیٹ پیچھے کہو تو غیبت کا الزام۔ میں تو جنت میں جاؤں یا دوزخ میں کہے بغیر نہیں رہا جاتا۔''

بی صداقت زمانے سے ہمارا دور پرے کا رشتہ ہے اور بچپن میں انھوں نے مجھے الف، بے، تے، بھی پڑھائی تھی اس لیے ہفتے عشرے میں ان کے ہاں چلا جاتا ہوں۔ انسان وہ جو تنکا اٹھائے کا احسان مانے اور سچ پوچھو تو مجھے بوڑھوں سے رغبت بھی ہے۔ سب کہتے ہیں کہ مجھ میں کوئی بوڑھی روح ہے۔ مگر میں کہتا ہوں پرانے آدمی اور پرانی چیز کی بات ہی کچھ اور ہے۔ آج کل کے آدمی بھی کوئی آدمی ہیں جن کا دین نہ ایمان بے نتھے بیل، چڑھتے سورج کے پجاری۔ بڑوں کو دیکھو کیسی ساکھ بنائے بیٹھے ہیں، جان جائے پر آن نہ جائے۔ اب بوا صداقت ہی کو لے لو جتنی دیر ان کے پاس بیٹھتا ہوں پرانی دلی کی شستہ اور شیریں زبان سننے میں آتی ہے۔ ان کا گھر بار، رہن سہن اور وضعداری دیکھتا ہوں تو مرحوم دلی کے نقش و نگار آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ زمانہ بدل گیا دنیا بدل گئی مگر وہ ہیں کہ اپنے طور طریقوں کو اسی طرح نبھائے جاتی ہیں۔ پرانی قدروں پر یوں بیٹھی ہیں جیسے دولت پر سانپ۔ میں جب بھی ان کے ہاں جاتا ہوں کچھ لے کر ہی جاتا ہوں۔ کبھی کوئی اچھا بول کانوں میں پڑ گیا، کبھی کسی پیر فقیر اللہ والے کا قصہ سنا، کبھی کوئی سبق آموز حکایت سن لی۔ پھر بھلا بتلایئے وہاں جانے میں کیا برائی ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اچھوں کی صحبت میں بیٹھے کہ دو اچھے بول کانوں میں پڑیں۔

بی صداقت بھی میری بڑی مداح ہیں۔ ذرا مجھے گئے ہوئے کچھ دن ہوتے اور انھوں نے تقاضا کر دیا ''اے دیکھنا اسے ضرور بھیج دینا، میری آنکھیں لگی رہتی ہیں، ہمیشہ کا آنے والا کچھ دن نہ آئے تو دل پریشان رہتا ہے۔'' میں گیا اور انھوں نے ادھر اُدھر کی سنانی شروع کیں۔ بڑی بی پھونس کی گٹھری ہیں۔ ادھر میں نے چنگاری پھینکی، اُدھر شعلے بھڑکے۔ کبھی مائیکروسکوپ کی شان میں قصیدہ ہوا، کبھی بناسپتی اور چائے زیر

بحث آئی، کبھی اگلے زمانے کی ارزانی کی داستان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سنائی۔ آج کل کی بے دینی کا دکھڑا رو یا۔ اور میں ہوں کہ سراپا سماعت بنا بیٹھا ہوں۔ اِدھر انھوں نے کسی کو ملامت کا نشانہ بنایا اور میں نے نفرین نفرین پکارا۔ اُدھر انھوں نے کسی کی تعریف کی اور میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ آمنّا و صدقنا کہا۔ غرض وہ ہفتہ پندرہ دن کی بھڑاس ہی ایک ہی دن میں نکال لیتیں اور میں پرانی زبان کا رسیا سنتا اور درود بھیجتا جاتا۔ اللہ اللہ ایسی زبان دنیا میں کہاں ہو گی۔ سنو تو یوں لگے جیسے کسی نے کانوں میں رس گھول دیا۔ ہزار باتیں، ہزار کہانیاں، ہر بات پر نت نئی مثل قرآن و حدیث کی مثالیں یوں دی جاتی ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ گلستاں بوستاں ازبر۔ فارسی شاعروں کے دیوان کے دیوان حفظ۔ اور گفتگو میں ایسی روانی کہ سانس تک نہیں لیتیں۔ میری خاموشی اور توجہ پر نہال نہال ہوتی ہیں۔ اور میری سعادت مندی کا قصیدہ سارے خاندان کو سناتی پھرتی ہیں۔

مرد لاکھ عیبی سہی مگر اللہ کا فضل ہے کہ عیب جو اور عیب بین نہیں۔ میں نے آج تک کسی مرد کو مردوں کی برائی کرتے نہیں سنا۔ خواہ تمام مرد جھوٹ بولیں لیکن مردوں کا قول ضرب المثل ہے۔ شاید اسی صفت نے مرد کے عیبوں پر پردے ڈال رکھے ہیں مگر عورتوں کے لیے نہ تو مرد اچھے نہ عورتیں۔ ان لوگوں میں انگشت نمائی اور نکتہ چینی اس قدر عام ہے کہ الٰہی توبہ، ماں سے بیٹی کی برائی سن لو اور بیٹی سے ماں کی خوبیاں۔ ایک گھر میں چار عورتیں ہوں تو کیا مجال کہ چاروں ایک دوسرے کو اچھا سمجھیں۔ جب دیکھو نوک جھونک، ہر پھوہڑ ایک میں کیڑے ڈالے گی محلے بھر کی رپورٹ ان کے دل پر لکھی ہوتی ہے۔ فلاں کی بیٹی کا فلاں سے معاشقہ ہے۔ فلاں کی ساس نے بیٹے کے کان بھر کر بہو کو گھر سے نکلوا دیا، فلانے گھر میں فلاں عیب ہے۔ غرض جتنے شیطانی کام ہوں سب کی داستان اس خدائی فوجدار سے سن لو، ہاں اگر کسی کی نیکی کا ذکر کیجیے تو بے نیازی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بس نہیں چلتا، کانوں میں روئی ٹھونس لیں۔ جو کچھ کہا بھی تو بس یہ کہ ہم کیا جانیں نیکی کرتی ہوں گی تو اپنے لیے کوئی ہمیں تھوڑی دے جائیں گی۔

صد افسوس کہ ان نیکیوں کی نیک سہی مگر ہیں تو آخر عورت ہی۔ انھیں بھی اپنی قوم سے اللہ واسطے کا بیر ہے اور سب باتوں سے زیادہ عزیز آج کل والیوں کا رونا ہے سو کبھی

ان کی رگ رگ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جب کبھی فرصت ہوتی ہے اور ان کی شعلہ بیانی سے لطف اندوز ہونے کو جی چاہتا ہے تو کہیں دکہیں سے بات نکال نکول کر اسی موضوع پر لے آتا ہوں، دادی اب تو لڑکیوں نے بھی بڑی ترقی کر لی ہے۔ ہزاروں لاکھوں کالجوں میں پڑھتی ہیں، ہر کام میں مردوں سے آگے ہیں ؛ میں تو اتنا کہہ کر چپ ہوا۔ اور وہ آئیں تو جائیں کہاں، "ے نابیٹا ہمارے زمانے میں تو لڑکی کا گھر سے نکلنا عیب سمجھتے تھے، ہم کیا جانیں موئے لڑکوں کے ساتھ کالج میں پڑھنا اور پھر نوکری کے لیے جوتیاں چٹخاتے پھرنا۔ پہلے تو ادھر میٹھا برس لگا اور اُدھر ماں باپ نے آدمی پاؤں کا مزدور دیکھ ہاتھ پیلے کیے۔ لو جی لڑکی پرائے گھر کی ہوئی۔ اے نوج جو ہمیں کمانا پڑتا۔ ہمارے میاں، اللہ بخشے، کہتے تھے کہ عورت کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی، جو کبھی کبھار میں نے وقت گزارنے کو دو ٹکے کی گجائی بھی لپیٹی تو انھوں نے سینکڑوں صلواتیں سنا دیں۔ میں کہتی تھی کہ خالی سے بیگار بھلا۔ مگر وہ اللہ بخشے، ایسے بنکارتے کہ کیا بتاؤں۔ اور بھئی وہ مثل ہے ناکہ خدا کی طرف سے بھی شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر۔ تو ہمیں کبھی پیسے کوڑی کی تکلیف بھی نہیں ہوئی۔ جب تک وہ رہے، خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، بیگموں کی طرح راج کیا۔ صبح اٹھے حلوائی کے ہاں سے دَرد نا کھرا حلوا پوڑی کا لے آئے لو بھئی دونوں نے ناشتہ کر لیا۔ چائے ولائے کا ان دنوں رواج ہی نہ تھا۔ موئے انگریز مفت بانٹتے تھے مگر لوگوں نے بڑیا لی اور نالی میں الٹ دی۔ اے ہاں کون بیٹا کڑوا کسیلا جوشاندہ سا۔ اب دیکھو تو کوئی چائے بغیر ہلتا ہی نہیں۔ ناشتہ کر وہ تو اپنے کام پر چلے جاتے اور میرے پاس آنے جانے والیوں کا تانتا لگتا۔ ذرا دیر میں اچھی خاصی محفل ہو جاتی۔ پڑاری کی جو کی گھسیٹ بیچ میں رکھی سب نے کلّے تازے کیے اور بھی باتیں شروع ہو گئیں۔ جھاڑو بُہارو پکانے ریندنے کو ماما ملازم تھی۔ بس یونہی باتوں باتوں میں دن کٹ جاتا۔ بھلا ہم کیا جانیں بازار والیوں کی طرح مارے مارے پھرنا۔ آج کل والیوں کے تو پر نکل گئے ہیں۔ پیروں میں بلّیاں بندھی ہیں میرے تو دیکھ دیکھ کے ہوش اڑتے ہیں۔ یا اللہ عورتیں کیا ہوئیں خوش خصال بتاشا ہو گئیں، دو برقعے والیاں ہیں وہ صبح سے شام تک برقعے پھڑکاتی پھرتی ہیں اور جنھوں نے اتار دیا انھیں تو خیر دیکھ ہی کون سکتا ہے۔ خدا کا خوف نہ دنیا کی شرم ...

میں پہلے تو خاموش بیٹھا مُٹر مُٹر سنتا رہا پھر آہستہ سے شہ دی "کیا کیا جائے دادی مرد بھی تو تمہارے وقتوں کے نہیں۔ اب تو انھوں نے بھی ساری ذمہ داری عورتوں پر ڈال دی ہے۔ اگر بے چاریاں تمہاری طرح گھر کی چار دیواری میں بیٹھی رہیں، تو سارا گھر چوپٹ ہو جائے" میری حمایت کا اثر ان پر وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ جوش و خروش دوبالا ہو گیا اور بڑی تلملا کر بولیں "نہیں جی مرد بے چاروں کا اس میں کوئی قصور نہیں انھیں تو یہ کالے سروالیاں جس طرح چاہیں نچالیں (ذرا شرما کر) اللہ بخشے ان کی حیات میں جب میں کسی بات پر اڑ جاتی تھی تو پوری کرا کے ہی چھوڑتی تھی۔ وہ کھسیانے ہو کر کہتے تم تو جھاڑ کا نٹا بن گئی ہو۔ اچھا جو چاہو کرو میں تو تمہارے بھلے کی کہتا تھا مگر تم جیسی موٹی عقل والی سے کون بحث۔ بیٹا تیری تو خیر عمر ہی کیا ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے، تجھے پیدا ہوئے۔ لوگ مرتے گئے پر اس ذات کو نہ سمجھنا تھا نہ سمجھے مثل مشہور ہے کہ عورت کے سر میں جتنے بال اس سے زیادہ اس میں چلتر۔

اس بندی کی عجیب خصلت ہے نہ اِس کل چین ہے نہ اُس کل۔ وہ جو کہتے ہیں کہ گیدڑ کی شامت آئے تو شہر کا رخ کرے۔ میں پوچھتی ہوں اس خیلا خیلن پر مصیبت کیا پڑی تھی جو اچھا خاصا گھر چھوڑ نگوڑی ناٹی سڑکوں پر دھول پھانکنے لگی۔ سو ٹہل کرتی ہے تو دو روٹیاں میسر آتی ہیں۔ آگ لگے ایسی کمائی کو۔ عزت آبرو سب ملیا میٹ کر دی اور بھئی دیکھنا آرام کے تو سب ہی رسیا ہیں۔ مردوں نے جو دیکھا کہ اس عقل کی ماری نے بھارا جوا بھی اپنے اوپر لا دلیا تو جھٹ الگ ہو گئے لو جی اب کماؤ بھی تم اور بچوں کو بھی پالو۔ یہ بے وقوف اپنی دانست میں خوش ہے کہ چلو آزادی تو ملی۔ میں کہتی ہوں کہ اس سے تو وہ غلامی ہزار گنا اچھی تھی۔ بھٹ پڑے وہ سونا جس سے پھٹیں کان۔ میں تو سچی بات کہوں گی، چراغِ سحری ہوں۔ گور گڑھا سامنے نظر آ رہا ہے جوانی میں تو خیر جو چاہا کیا مگر اس سفید چونڈے پر جھوٹ نہیں بولا جاتا آخر اللہ کے پاس جاؤں گی تو کیا جواب دوں گی۔ مرد بے چاروں نے کیا نہیں کیا۔ خود بعد میں کھایا ان نیک بختوں کو پہلے کھلایا۔ ہزار طرح کے عیش کرائے۔ لونڈی باندی، انا چھوچھو اور غلام پیچھے پیچھے پھرائے جب کہیں جانا ہوا تو ڈولی چڑھیں ٹھُک ٹھُک وہاں جا پہنچیں۔ اچھے سے اچھا کپڑا، لتا، گہنا، پاتا

گھر بیٹھے حاضر، زربفت، زری، اطلس، کم خواب، تاش، تمامی، سونا چاندی، ہیرے جواہرات کون سی چیز تھی جو انھیں میسر نہ ہو۔ آٹھ آٹھ گز کے غرارے۔ جہاز کے جہاز گہنے کا یہ عالم کہ سونے میں لدی پڑی ہیں۔ ہاتھوں میں دس دس تولے کے کنگن۔ کانوں میں یہ بڑی بڑی جھلنیاں کہ سنبھالے نہ سنبھلیں۔ گلے میں مالا، گلو بند، ہنسلی۔ ماتھے پر جھومر ٹیکہ اور دس طرح کے زیور، مجھے تو، اللہ کی سنوار، نام بھی یاد نہیں۔ پھر بھی یہ آفت زادیاں مردوں کو بُرا کہتی ہیں۔ ان کے دیے کا پاپ نہ پُن۔ سچ ہے گدھے کی آنکھوں میں نون دیا گدھا کہے میرے دیدے پھوٹے۔ غیرت دار ہوں تو مردوں کے پیر دھو دھو کر پئیں۔ اور جاؤ میں کہے دیتی ہوں کہ جو مرے مردوں کے بل بوتے پر کر لیے وہ بھلا النصیب تو ہو جائیں اب انھیں۔ آخر اللہ رسول نے جو مرد کو حاکم بنایا ہے تو کیا نعوذ باللہ غلط بنایا ہے۔ جس نے نہ لی بڑوں کی سیکھ اس نے مانگی در در بھیک۔"

اب دیکھ لو اس خانہ خراب آزادی نے کچھ ہی دن میں کیا حال بنایا ہے۔ گاڑھے گزی کی کرتیاں اور وہ بھی کم بخت بندروں کی سی سرنگی کے غلاف، شلواریں ہیں تو وہ اچکوا آزادی سے بیٹھنے دیں نہ اٹھنے۔ اور پھر اس پر نہ پیک، نہ گوٹہ نہ ٹھپا نہ مسالہ نہ گیانی نہ مقیش موئی ڈیڑھ ڈیڑھ گز کی اوڑھنیاں گلے میں پھانسی کی طرح پڑی ہیں۔ نہ سینا ڈھکے نہ سر۔ غیرت تو جانے کہاں بیچ کھائی ایک سے ایک زیادہ چالاک، نٹرت پھرت، ناکھنی نا، اللہ معاف کرے، ہمارے زمانے میں ایسی بے غیرتیں ہوتیں تو دیوار میں چنوائی جاتیں۔

میرا تو دیکھ دیکھ کر کلیجہ خاک ہوتا ہے۔ روز بروز نت نئے سوانگ۔ نت نئے فیشن کبھی دیکھو تو کانوں میں یہ بڑے بڑے سپیروں کے سے بالے۔ ہاتھوں میں موٹی موٹی سادی چوڑیاں۔ اور کبھی ہاتھ بھی خالی، کان بھی خالی۔ لوٹھا کی لوٹھا مردنی پھر رہی ہیں۔ کپڑے ہیں تو آج کے بنے کل بیکار۔ کبھی اتنے ڈھیلے کہ ایک میں چار سما جائیں۔ بھوسی ٹکڑے والیوں کی چولیاں، کبھی کسے تو ایسے کہ گاؤ تکیہ کا غلاف بنا دیا۔ اب ایک پہنے تو دوسرا پہنائے۔ چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا مشکل سونے چاندی کا انھیں شوق نہیں۔ زری زردوزی یہ نہ پہنیں۔ بس ایک مصیبت ہے کہ پیٹے جاتی ہیں۔ خیر جی ابھی تو نہ جانے کیا کیا دیکھنا پڑے قرب قیامت ہے۔ ان نینوں کا یہی بسیکھ وہ بھی دیکھا

یہ بھی دیکھ۔

اور اس کے بعد بی صداقت پٹاری کی طرف مڑیں۔ ایک پان بنا کر میرے آگے کھسکایا ایک خود کھایا۔ زردے کا جنگا انگلیوں میں دبا ڈاڑھ کے نیچے رکھا اور چپاچپ منہ چلانے لگیں مجھے ان کی باتوں میں مزا آ رہا تھا۔ جھٹ اگال دان اٹھا آگے رکھ دیا۔ وہ بھی اشارہ پاتے ہی پیک تھوک تیار ہوگئیں۔ میں یوں تو ان کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا مگر کبھی کبھی بھڑکانے کے لیے خلاف بھی بول دیتا "دادی تم تو بے چاری لڑکیوں کے خلاف بھری بیٹھی ہو۔ اب دیکھو نا مردوں کے ظلم زیادتی کا کچھ ذکر ہی نہیں۔ تم نے تو سارا الزام عورتوں پر ڈال دیا بُرے بھلے سب میں ہوتے ہیں۔ ایک تھکاڑے میاں کیا سیدھے تھے تم سمجھتی ہو سب ہی کے ایسے ہوں گے۔ سچ پوچھو تو مردوں نے بھی کیا نہیں کیا۔ لونڈی باندی بنا کے رکھا۔ یاں نہ جھانک، واں نہ دیکھ، یاں نہ جا واں نہ جا یہ نہ کر وہ نہ کر۔ ایک بات ہو تو کہوں پوری غلامی تھی غلامی اور چار چوٹ کی مار دی سو الگ۔ ایسا غزہ ایسا غزہ کہ اللہ کی پناہ۔ بے چاری عورتیں کہاں تک سہتیں۔ جب کچھ نہ بن پڑی تو بغاوت کر دی۔

ہوں! میری ساری تقریر انھوں نے ایک لفظ میں اڑا دی اور اس طرح دیکھا جیسے میں کچھ اول جلول بک رہا ہوں۔ پھر پان ایک کلے میں سمیٹ دوبارہ شروع ہوگئیں۔ "سچ میاں یہ بغاوت دغاوت کچھ نہیں۔ عورت کی ذات ہی ایسی ہے کہ سونے کا نوالہ کھلاؤ تو بھی اپنی نہ ہو۔ اس پر احسان کرنا سانپ کا پالنا ہے۔ اور پھر چندری ایسی بے چین کہ جنت میں بھی کل نہ آئے۔ تم تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے ہو سب جانتے ہوگے۔ باوا آدم بے چاروں پر جو مصیبت پڑی سب اسی کی وجہ سے نہیں تو اچھے خاصے جنت میں رہتے تھے۔ پھر دنیا میں آ کر اس نے کیا نہیں کیا۔ لڑائیاں معرکے اس کی وجہ سے ہوئے۔ پیر پیغمبروں پر اس نے الزام لگائے۔ ہائے ہائے یوسف کو رسوا کرتے اسے غیرت نہ آئی۔ ڈوب نہ مری کسی کنویں کھائی میں۔ میں تو جب زلیخا کا قصہ پڑھتی ہوں دھارم دھار روتی ہوں۔ زمین اس آفت کی پرکالہ نے ہزار فتنے بپا کیے اور پھر ہے کہ معصوم کی معصوم۔ وہ تو یہ کہو کہ مرد بے چاروں کی عقل پر پتھر پڑے ہیں جو آج تک اس کی فطرت کو نہ سمجھے۔ اگر سمجھ جاتے تو قسم کھا کر کہتی [illegible] دیکھو

بات پھر اس جگہ آ گئی جہاں میرے کچھ کہے بغیر آگے بڑھنے کی گنجائش نہ تھی۔ میں تو تیار ہی بیٹھا تھا جھٹ خدنگا چھوڑا۔ "دادی تمھارا کہنا بھی ٹھیک ہے مگر عورتوں میں کچھ اچھی بھی تو ہوتی ہیں۔ پانچوں انگلیاں ایکساں نہیں"۔ بی صداقت نے عورتوں سے نہ جانے کیا زک اٹھائی تھی کہ ان کی تعریف میں آدھی بات سننے کو تیار نہ تھیں۔ آنکھوں آنکھوں میں میری عقل کا مضحکہ اڑایا اور گویا ہوئیں۔

"اے بس رہنے بھی دو۔ ان ناس پیٹیوں میں اچھائی ہوتی تو کوئی نہ کوئی پیر پیغمبر ضرور ہوتی۔ خدا نے بھی دیکھ کر ہی پٹخا ہے۔ جیسا منہ ویسی تھپیڑ، مجھے تو، سچ کہتی ہوں، اپنے آپ سے بھی نفرت ہے۔ اللہ بخشے مرنے والے نے کیا نہیں کیا پر میں نے سدا ٹکڑے ہی توڑے۔ اچھا کھایا اچھا پہنا اور کہا ہمیشہ یہی کہ تمھارے گھر آکر عیش کرنا نصیب نہ ہوا۔ سو نہلیں کر دجب رو کھی سوکھی میسر آتی ہے۔ وہ خدا بخشے مرتے مرگئے پر میں نے کبھی شکر کا کلمہ نہ ادا کرنا تھا نہ کیا۔ اب مرنے پیچھے قدر ہوئی بھی تو کیا۔ بس خدا سے توبہ کرتی ہوں۔ دیکھو بھی بخشی جاؤں جب بات ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے ایک لمبا سانس کھینچا اور مرحوم کی یاد میں ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ میں نے بھی چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے انھیں دیکھتا رہا۔ ناک اور آنکھوں کو دوپٹے سے مسلتے ہوئے انھوں نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ چند کلمات اپنے مرحوم شوہر کی تعریف میں ادا کیے۔ مجھے نہ تو ان رسمی ٹسوؤں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی یہ کچھ بات ہے، اس موضوع سے، اس لیے ذہنی طور پر فرار حاصل کیا اور دل ہی دل میں غالبؔ کا یہ شعر گنگنانے لگا۔ ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حالاں کہ اس واقعہ کو بہت عرصہ ہوا لیکن آج بھی جب میں کسی عورت کو دیکھتا ہوں یا عورت ذات کے بارے میں کچھ سوچتا ہوں تو صداقت بوا معہ اپنی دھواں دھار تقریر کے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں پھر بتایئے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اسے مخلص اور معصوم سمجھ سکوں البتہ اگر کبھی فطرت نے کسی کی جانب مائل بھی کیا تو سینکڑوں شک گزرے، ہزاروں اوہام نے آگھیرا۔ کچھ ایسی کیفیت ہوگئی کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر

میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ بدگمانی میرا شعار نہیں اور نفرت سے مجھے سخت نفرت ہے۔ اب اگر کوئی اس بدگمانی کا جرم میرے سر لاد دے تو میں اسے بدگمانی کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں۔ جہاں تک میری نیک نفسی کا تعلق ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے کبھی اس خیال کو ہوا نہ دی کبھی اس موضوع پر غور کرنہ سوچا۔ جب ذرا ذہن کو الجھتے دیکھا تو سنسکرت کا یہ شلوک کہہ کر بات ٹال دی۔

استری چرترم پرشس بھاگیم[1]

دیوو نہ جاناتی کت منشں

"دلی سے دلی تک" سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۳۶ قیمت ۲/۵۰ حوالہ صفحہ ۶۵ سے ۷۰ تک)

---

[1] عورت کا چلتر اور مرد کا مقدر دیوتا بھی نہیں جانتے انسان کیا جاننے لگا۔

شرابِ کہنہ

جانؔ صاحب

۱۸۱۸ء ——— ۱۸۷۹ء

میر یار علی نام، جان صاحب تخلص، والد کا نام میر امن، فرخ آباد میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے تھے، ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعر کہنے کے لیے جو استعداد اور صلاحیت چاہیے وہ ان کے یہاں پوری پوری موجود تھی، نواب عاشور علی خاں کے شاگرد تھے، شاعری کے علاوہ جوتش کے فن سے بھی واقف تھے مخصوص طرز سخن کی بنا پر مرتے دم تک مشہور و مقبول رہے اور آج بھی لوگ انھیں خصوصیتوں کے تحت ان کو جانتے اور یاد کرتے ہیں۔ دیوان دو باران کی زندگی ہی میں چھپا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے باوجود مالی پریشانیوں نے کبھی آخر دم تک ساتھ نہ چھوڑا، ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی اور بھوپال کے چکر بھی لگائے تھے۔ کام نہ بنا تو پھر کر لکھنؤ واپس آ گئے۔ مٹی رام پور کی تھی، وقت کے بعض مشہور عالموں اور شاعروں کی طرح نواب کلب علی خاں کی سرپرستی اور ان کی ریاست کے وظیفے سے کچھ دن یہ بھی فیض یاب ہو لیے۔

ریختی کے معاملے میں جان صاحب کی مستقل مزاجی اور جی بھر کے اس کو اپنائے رہنا قابلِ داد ہے، اس سے پہلے رنگینؔ اور انشاؔ بھی اس طرف رجوع ہو چکے تھے مگر صرف تفننِ طبع کی خاطر، جان صاحب کے بعد بھی ریختی گوئی کا رواج رہا مگر اس استادی اور استحکام کے ساتھ نہیں، جان صاحب کا کلام ہر صنف میں موجود ہے، ایک کامیاب اور خوش فکر شاعر کی طرح اپنے دور کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی جھلکیاں بھی ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ جان صاحب کی یہ ایک ناقابلِ فراموش خدمت ہے کہ ان کی

ے جان صاحب کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی اس لحاظ سے سن ہجری ۱۲۳۴ — ۱۲۹۷ زیادہ صحیح ہے۔

بدولت بیگماتی زبان کا ایک مخصوص اور کمیاب سرمایہ محفوظ ہوگیا ہے۔ چوں کہ انھوں نے بحیثیت مجموعی ہر طبقے کی عورت کے خیالات، جذبات اور مشاغل وافکار کی عکاسی وترجمانی کی کوشش کی ہے اس واسطے ان کے شعروں میں بعض ناپسندیدہ باتیں بھی آگئی ہیں۔ اس سے قطع نظر ان کے یہاں بلند پایہ مضامین اور لطیف جذبات کی بھی کمی نہیں ہے۔ معقول اور شائستہ انداز کے شعر بھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔

جان صاحب نے شعرگوئی کے لیے عورتوں کی زبان ضرور اپنائی اور پڑھتے وقت عورتوں کے سے انداز و اطوار اور لب و لہجہ بھی اختیار کر لیا کرتے تھے جسے ان کی حسن اداکاری سے منسوب کرنا زیادہ مناسب ہوگا کبھی کبھی لطف محفل کی خاطر مشاعروں یا دربار میں ان کے سر پر دوپٹہ بھی ڈال دیا جاتا تھا باقی اس کے علاوہ رہن سہن، لباس اور وضع قطع میں اپنے دور کے شریف، ثقہ اور مہذب قسم کے مردوں کے طور طریقوں کے ہمیشہ پابند رہے۔ سیرت و کردار میں کہیں سے بھی زنانہ پن یا نسائیت کا شائبہ تک نہیں آنے دیا۔ ایک معتبر راوی کا بیان ہے کہ وہ خاصے متقی اور پرہیزگار قسم کے آدمی تھے۔ اور زندگی کے آخری دن زیادہ تر عبادت گزاری میں بسر کیے۔

انتخاب

سوتی ہیں اب وہ چین سے مخمل کے فرش پر　　　گھٹّا ہوا نصیب نہ جن کو پیال کا

گرگٹ کی طرح کالا کبھی لال ہو گیا　　　غصّے سے مردوے کا عجب حال ہوگیا

کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت　　　سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں ہوتا

کھا تا چرا کے خوب نہیں ماں سے پان کا　　　منہ کی کہیں کھلاتے نہ چسکا زبان کا

کھلا جنگل میں آ کے حال ان چڑیلوں کی چوں چوں کا
ہر اک عاشق کو دیتی ہیں یہ پرسا اپنے مجنوں کا

دل لے کے رنج دے گا سراسر کسی کو جو
بی اپنے دیدے گھٹنے کے آگے وہ پائے گا

سوکن نے پائجامہ پہنا ہے گل بدن کا
پھولوں میں تُل رہا ہے کانٹا مرے بدن کا

خدا غنی ہے حقیقت میں اور کُل ہیں فقیر
کسی کو رکھتا نہیں ہے خدا سے محتاج

مٹتا نہیں کسی کا مٹائے سے جان لے
پیشانی پر جو لکھ چکا پروردگار خط

جو کہ معشوق کا مذہب ہے وہ ہے عاشق کا
حق تو یہ بات ہے کافر ہے نہ دیں دار ہے عشق

منہ زرد، آنکھیں لال، پھٹے کپڑے جی اداس
عاشق کے بوجھنے کے ہوا ہیں یہ چار رنگ

دال آٹے کا سنو بھاؤ ہے اُس دم کھلتا
چاہنے والے اجی جب کہ بچھڑ جاتے ہیں

لاکھ تدبیر کرو ایک نہیں بنتی ہے
دن مقدر کے جب اے جاںؔ بگڑ جاتے ہیں

ناحق نہ کرو پاس تم اس کا مرے بھیّا
ماں باپ کا ہے مرتبہ جورو سے زیادہ

منہ سے تو کچھ کہیں پہ کریں نابکار کچھ
مردوں کی بات کا نہیں بی اعتبار کچھ

دیکھی جو اپنی چوٹی کی پرچھائیں رات کو
رسّی سمجھ کے بھاگی میں اک چیخ مار کے

اور کیا چھٹی کہوں بن آئے ہولنگوڑے سے
داڑھی منڈواؤ میں باز آئی خدا کے نور سے

بی بنا آتی ہے بگڑی ہوئی تقدیر کسے
اچھی سوجھی ہے بُرے وقت میں تدبیر کسے

ایک چُپ ٹالتی ہے لاکھ بلا
میں نہ بولوں کوئی ہزار اُلجھے

بُرا نہ کہتی کسی کو تو کیوں بُرا سنتی
خراب کرتی ہے خود مجھ کو یہ زبان میری

چڑھ کے منبر پہ عبث اوہی بھری محفل میں
واعظو مغز یہ کیوں کرتے ہو اپنا خالی

کیا دمڑی کہہ کے کیا نام ہے پیدا
اے جاںؔ ترا عیب بھی بہتر ہے ہنر سے

کچھ نایاب کتابیں

ـــــــ جن کی صرف ایک ایک دو دو کاپیاں موجود ہیں

داستان ریختہ خواجہ محمد عبدالمجید -/۵۰
میر محمد علی خاں سید مراد علی -/۲۵
کسان اور مزدور انعام اللہ خاں -/۷۵
علم اللسان سید احمد -/۳۷
قانون مکافات ۱/-
لوہیا سلاخوں کے پیچھے -/۵۰
انقلابی انگارے جی۔ آر سہگل ۱/۵۰
لسان الامت عبدالرحمان -/۵۰
ابن بطوطہ آسان زبان میں مقبول احمد ۱/۵۰
آسان زبان میں ابن بطوطہ کا سفرنامہ 〃 ۱/۳۱
کتاب مالا بدمنہ مولانا ابوالطیب ۱/-
لاڈلا اکبر شجاع احمد قائد ۱/۵۰
اردو کی پانچویں انجمن ترقی -/۸۸
سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم محمد اجمل خاں ۲/-
ناموران عالم میر مہدی حسین -/۷۵
روس کا مستقبل مترجمہ اقبال اختر -/۵۰
قرآن کی چار بنیادی اصلاحیں ابوالاعلیٰ مودودی ۱/۵۰
رسول مقبول مصطفےٰ حسین منظر ۱/۲۵

شبلی نعمانی انوار الحسن -/۳۱
مویشیوں کی پرورش لالہ نانک چند -/۷۵
رسول اکرم سید سلیمان ندوی -/۲۲
رحمت کا دربار حافظ سعید الدین -/۱۲
مشرق بعید شاہد حسن رزاقی ۱/۲۵
سبیل الرشاد خواجہ عبدالحیٰ فاروقی ۱/-
مشاہدات عالم چنڈی پرشاد ۱/-
شہادت حق سید ابوالاعلیٰ مودودی -/۳۱
تعلیم اسرار تصوف 〃 〃 -/۷۵
اعجاز جیومیٹری سید ممتاز علی -/۶۲
کربلا کی شیر دل خاتون الحاج محمد عباس ۱/۵۰
کنیڈا خواجہ محمد شمس الدین -/۵۰
گلدستۂ میلاد ضیا رجالوی شمسی ۱/۸۸
سیر عالم میر مہدی حسن -/۶۲
ہندوستان میں برطانوی حکومت ڈاکٹر زین العابدین -/۵۰
معاون ورکشاپ سید برکات الحسن ۱/۵۰
ہر قسم کی بیڑیاں 〃 〃 ۳/-
سیرت خاتم الانبیاء مولانا محمد شفیع ۲/-
جمال کربلا جمال قریشی احمد آبادی ۱/۵۰

(باقی ص ۲۵ پر)

پاکستانی مطبوعات

کلاسیکی ادب (مطبوعات مجلس ترقی ادب لاہور)

مسافران لندن مرتبہ سر سید احمد خاں ۳/-
قواعد زبان اردو مشہور بہ رسالہ گلکرسٹ ۲/-
توتا کہانی حیدر بخش حیدری ۲/۵۰
بہار دانش مرزا جان طپش ۳/-
یادگار غالب مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ۹/-
شکنتلا از کاظم علی جوان ۲/۲۵
ملک العزیز ورجنا ، مولانا عبدالحلیم شرر ۵/۵۰
وکرم اروسی مرتبہ عشرت رحمانی ۱/۷۵
واسوخت از آغا حسن امانت ۲/۷۵
مرقع لیلیٰ مجنوں ، مرزا ہادی رسوا ۲/۵۰
فردوس بریں ، مولانا عبدالحلیم شرر ۲/-
جوہر اخلاق مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر ۱/-
باغ اردو میر شیر علی افسوس ۵/-
حیات سعدی خواجہ الطاف حسین حالی ۲/۵۰
موعظۂ حسنہ ڈپٹی نذیر احمد ۲/-
جامع الحکایات ہندی شیخ صالح محمد عثمانی ۳/-
سوانح مولانا روم از شبلی نعمانی ۲/۵۰
اخلاق ہندی میر بہادر علی حسینی ۳/-
ابن الوقت مرتبہ سید سبط حسن ۳/۵۰
گل مغفرت حیدر بخش حیدری ۲/۵۰
فسانۂ مبتلا مرتبہ پروفیسر افتخار احمد صدیقی ۲/۵۰

بچوں کی نفسیات اور تعلیم

بچوں میں جذبہ عداوت ۱/۷۵
〃 کی بدتمیزیاں ۱/۸۷
〃 〃 سیکھنے کی قابلیت بڑھانا ۱/۷۵
〃 〃 جنسی تعلیم ۱/۸۷
〃 〃 دلچسپیاں ۱/۷۵
〃 کے خوف ۱/۷۵
〃 〃 کھیل ۱/۷۵
〃 〃 سمجھنے میں نفسیاتی امتحانوں کی اہمیت ۱/۷۵
〃 〃 جذباتی مسائل ۱/۸۷
بچے کی اخلاقی قدریں ۱/۷۵
〃 〃 جماعتی زندگی ۱/۷۵
آیئے دوست بن جائیں ۱/۷۵
انتخاب معاش ۱/۷۵
تمہارا رویّہ اور متعلقہ مسائل ۱/۷۵
کامیاب باپ ۱/۵۰
فرصت کے مشغلے ۲/-
بیماری کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو ۱/۷۵
والدین اور معلمین ۱/۷۵
میں نے جو کچھ سیکھا بچوں سے سیکھا ۱/۵۰
مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی ۱/۷۵
آپ کے بچے کی صحت ۱/۷۵

منطقی فکر کی طرف رہنمائی ۱/۸۷
دوست بنانا اور دوستی نبھانا ۲/۵۰
خودشناسی ۱/۸۷
تم اور تمہارے مسائل ۱/۷۵
آپ کے بچے کی وراثت ۱/۸۷
معاشرتی زندگی میں بچوں کی رہنمائی ۱/۷۵

اساتذہ کے لیے تحقیق کی روشنی میں

ابتدائی مدارس میں سائنس ۱/۵۰
فوقانی مدرسے میں خواندگی ۱/۵۰
پڑھنا کیسے سکھایا جائے ۱/۵۰
والدین اور استاد میں رابطہ ۱/۵۰
ثانوی مدارس میں سائنس کی تدریس ۱/۵۰
خوش خطی کی تدریس ۱/۵۰
تدریس کے لیے جماعتی تنظیم ۱/۵۰
طلبہ کی ترقی اس کا جائزہ اور رپورٹ ۱/۵۰
مضمون نویسی کی تدریس ۱/۵۰
بچے کی شخصیت اور ماحول مطابقت ۱/۵۰
خداداد ذہانت رکھنے والے بچے ۱/۵۰
تعلیم حاصل کرنے کا عمل ۱/۵۰
سمعی بصری آموزش ۱/۵۰
حساب کی تدریس ۱/۵۰
معاشرتی علوم کی تدریس ۱/۵۰

بچوں کی تدریس ۱/۵۰
اجتماعی تعلقات ۱/۵۰
کنڈرگارٹن کی تعلیم ۱/۵۰
ہائی اسکول میں تدریس ریاضی ۱/۵۰
زیر نگرانی مطالعہ اور گھر کا کام ۱/۵۰
نوعمروں کی جرم پسندی ۱/۵۰
ابتدائی اردو ثانوی مدارس میں گروہی کارروائیاں ۱/۵۰
بھائی بہنوں کا مل جل کر رہنا ۲/۵۰
مطالعے کے بہتر طریقے ۲/۵۰
ابتدائی فن تدریس ۵/-
تعلیمی نفسیات ۱۲/-

متفرق کتابیں

بچے کی تعلیم میں گھر اور مدرسے کا تعاون ۹/-
تعلیم کے مقاصد ۶/۵۰
ابتدائی مدارس میں تدریس ۵/-
جامع نفسیات تعلیمی ۸/-
تاریخ کیسے پڑھائیں ۴/۲۵
بچوں میں جرائم پسندی ۴/-
بچے اور ان کے والدین ۵/۵۰
تعلیم کا عمل ۲/۵۰
ثانوی مدارس میں دستکاریوں کی تعلیم ۳/-

یہ کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶ سے مل سکتی ہیں

نئی مطبوعات

			ضخامت	قیمت
میرانیس (بچوں کے لیے)	محمد حسین حسان	دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۸۰	۱/۲۵
آشفتہ بیانی میری (نیا ایڈیشن)	پروفیسر رشید احمد صدیقی	،، ،، ،، ،،	۲۱۲	۲/۵۰
مرحوم دلی کی ایک جھلک	شمیم احمد	،، ادارہ ادبیات	۱۲۸	۲/۵۰
بہروپیہ (ناول)	شوکت تھانوی	،، شہزاد بک ڈپو	۱۱۲	۲/۵۰
سیاہ گلاب (،،)	اے۔ حمید	،، ،، ،،	۱۸۸	۳/۷۵
دیکھا جائے گا (،،)	عظیم بیگ چغتائی	،، ،، ،،	۸۰	۱/۵۰
بیگم (،،)	زبیدہ خاتون	،، چچا بک ڈپو	۲۰۰	۴/-
جگر کے پار ہوتا (،،)	عظمت رضا	،، مکتبہ علم و فن	۱۸۴	۳/۷۵
فسانہ (،،)	زبیدہ خاتون	،، ناز پبلشنگ ہاؤس	۳۲۰	۶/۵۰
آندھی اور چراغ (،،)	رئیس احمد جعفری	،، ،، ،،	۱۶۸	۳/۵۰
سرچشمہ (مجموعہ کلام)	چندن بھارتی	،، قصر اردو	۲۴۰	۵/-
دل مگر اکیلا (نظم)	مرتبہ وشوا ناتھ	،، دلی پریس	۱۱۲	۴/-
نشیمن (ناول)	رضیہ بٹ	،، سہیل پبلشنگ ہاؤس	۲۴۸	۵/-
آبلہ (،،)	،،	لکھنؤ، عیدو خاں	۴۶۴	۸/-
تحریریں (ادب)	ڈاکٹر گیان چند	،، فروغ اردو	۳۲۸	۴/۵۰
جائزے (تنقید)	پروفیسر انور سیوانی	،، ،، ،،	۱۶۸	۳/-
چہرے (خاکے)	آغا شورش کاشمیری	کراچی، مکتبہ ماحول		۵/-
دیواریں (افسانے)	حمید کاشمیری	،، ،، ،،		۵/-
فانی اور ان کی شاعری	مرتبہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	،، ،، ،،		۴/۵۰
باقیات فانی	فانی بدایونی	،، ،، ،،		۲/-
محمد حسین آزاد	ڈاکٹر اسلم فرخی	،، انجمن ترقی اردو، اوّل ۸/- دوم		۱۲/-
انسان کی کہانی	علاء الدین خالد	،، اردو اکیڈمی سندھ		۴/۵۰

تلامذہ میر (تحقیق و تنقید)		راولپنڈی افقر اکادمی	
مجمی اور بھوت (بچوں کے لیے)	مولانا امداد صابری	〃 〃 〃	۱/۲۵
نیلی آنکھیں (ناول)	مصطفیٰ صحرائی	〃 〃 〃	-/۳۷
مقدمہ سراجین (ادبی)	زبیر گنجاہی	〃 〃 〃	زیر طبع
	〃 〃	〃 〃 〃	〃

(باقی صـ۳۱ کا)

زینت کربلا	سید آغا شہر لکھنوی		نورالدین زنگی	مولانا صادق حسین	۲/۵۰
غیبی آواز	شبیر حسن چشتی	۳/۰	کشمیر جنت نظیر	عبدالقدیر	۲/۵۰
نرگس	ایم اسلم	۲/۵۰	آئینہ حیرت	حیرت شملوی	۲/۰
کیا دیکھا	سید ابوالحسن ندوی	۱/۷۵	اشرف الفوائد	محمد یعقوب	-/۲۲
فضائل امت محمدیہ	مولانا عاشق علی	-/۵۰	عروج	لالہ دیوی دیال	۱/۲۵

ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

شعلۂ نوا

شاعر: تلوک چند محروم
(طبع دوم ۶۵ء)
صفحات: ۲۸۰ سائز ۱۸×۲۲/۸
قیمت: ۶/۵۰
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

میں نے حضرت محروم کی نظم 'خدا کے جلوے'، سب سے پہلی بار چھٹی جماعت میں پڑھی تھی۔ امسال میرے لڑکے نے ان کی نظم اپنی ساتویں جماعت کی درسی کتاب میں پڑھی۔ شاید ہی اس کی اپنی زندگی میں کسی شاعر کا کلام دو نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنا ہو۔

حضرت محروم نے رباعی، نظم، غزل سب کی مشاقی کی ہے۔ انھوں نے بچوں کو بھی بہت کچھ دیا ہے۔ لیکن ان کا میلان طبع، اخلاق وحکمت کی طرف ہی رہا ہے۔ ان کے کلام میں متانت، سنجیدگی، اور خلوص کی گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے۔ دراصل یہ ان کی زندگی کا پرتو ہے۔ ان سے ملنے کے بعد ان کی شرافتِ نفس کا احساس کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ پھر ان کا کلام پڑھیے تو شخصیت اور فن، کا تعلق بخوبی اجاگر ہو جاتا ہے۔ وہ آج بڑی سادگی اور انکساری کے ساتھ ایک عہد کی تہذیب کو اپنی ذات میں سمیٹے ہوئے نظر آتے ہیں وہ ۱۸۸۶ء میں میاں والی (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ پنجاب ہی ان کی جولاں گاہ رہا۔ لیکن آزادیٔ وطن نے دہلی پہنچا دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت اور سینکڑوں آئے۔ جان پرنی لیکن دل کا رنگ، پھر بھی زرانہ میلا ہوا۔ وہی کج کلاہی آج بھی ہے۔ قومی اتحاد کے پیرو، مذہبی تفریق سے بے نیاز، اردو کے مربی اور پرستار، شرافت اور مروت کے پتلے، وضع داری اور پاس داری کی تفسیر۔ ان کی اس کج کلاہی سے اُردو کا بانکپن ٹپکتا ہے۔ وہ اس تہذیب کا ایک زندہ جاوید شاہکار ہیں جسے "اردو تہذیب" کے نام سے ہی پکارا جا سکتا ہے۔

"شعلہ نوا" حضرت محروم کی غزلوں کا مجموعہ ہے جسے ہمارے مقبول و معروف شاعر اور ان کے فرزند ارجمند جگن ناتھ آزاد نے ترتیب دیا ہے۔ "شعلہ نوا" کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ۱۹۶۰ء میں چھپا تھا۔ کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اور مجموعے کا آغاز تیسرے دور سے ہوتا ہے جس میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک غزلیں موجود ہیں۔ اس طرح گویا "معلوم سے نامعلوم" کی طرف جانے والے تعلیمی اصول کو انھوں نے ملحوظ رکھا ہے۔ یہاں اپنے اس بزرگ و محترم شاعر کی پیرانہ سالی اور مزاجی کیفیت بالکل عیاں ہے۔

محروم اب تو جاگیے غفلت کی نیند سے — ایّامِ زیست آخری منزل میں آگئے

ایسے ہی اشعار اس دور کی نمائندگی کرتے ہیں یا پھر کہیں کہیں حالاتِ حاضرہ کا تاثر ابھر آتا ہے

بدل گئی ہے کچھ ایسی ہوا زمانے کی — خوشی کسی کو نہیں فصلِ گل کے آنے کی

کیا ہے خون لاکھوں بے گناہوں کا مگر پھر بھی — اہنسا برہمن کی، شیخ کا ایمان باقی ہے

دوسرے دور میں اگرچہ "دل میں بتوں کا اُنس بھی، یادِ خدا بھی ہے" لیکن ایسے اشعار مل ہی جاتے ہیں۔

اچھی نہیں ہے یاد کسی بدنصیب کی — اچھا کیا جو آپ نے مجھ کو بھلا دیا

وہ ہے ناکام جو انھیں چاہے — جس کو چاہیں وہ کامگار کریں

دل مجھ سے پوچھتا ہے کہ جائیں گے اب کہاں — میں دل سے پوچھتا ہوں کہ آئے کہاں سے ہم

دور اول ۱۹۰۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۱ء پر ختم ہوتا ہے۔ یہ نقشِ اول ہے اور عمر کے تقاضوں کی غمازی کرتا ہے۔

کچھ نئے داغ، کچھ پرانے ہیں — آج ان کو سبھی دکھانے ہیں

ملنے کا جب مزا ہے کہ دل آپ کا ملے — ظاہر میں آپ مجھ سے ملے بھی تو کیا ملے

مگر اس وقت بھی "اٹھان" کا پتہ چل جاتا ہے۔ ایسے شعر اس وقت بھی نکلتے رہے ہیں۔

یہ آرزو ہے اب نہ رہے کوئی آرزو — یہ مدعا ہے اب دلِ بے مدعا ملے

دراصل حضرت محروم کی غزل گوئی، ہمیشہ شراب و شباب کی تندی سے کتراتی رہی ہے اور ان کی نگاہ نے شروع سے ہی مجاز میں حقیقت کی جھلک دیکھ لی ہے۔

بہر حال ہمیں آزاد صاحب کا شکر گزار رہنا چاہیے کہ انھوں نے حضرت محروم کی غزلیات کو حسن سلیقگی کے ساتھ ہم تک پہنچا دیا ہے۔ حضرت محروم کا کہنا ہے کہ میرے اشعار کی توصیف ہوتی ہے میرے ہوتے نہیں معلوم میرے بعد کیا ارشاد ہوتا ہے

کیا پرستاران اُردو کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنے حسن عمل سے دوسرے مصرعے کے شکوک پنہاں کو آج رفع کریں ؟

عبداللہ ولی بخش قادری

فیض میر

مصنف: میر تقی میر
مرتبہ: سید مسعود حسن رضوی ادیب
صفحات: سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت: 1/50
ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

میر تقی میر کی تصانیف میں جہاں چھے ضخیم دیوان غزلیات (اُردو)، ایک دیوان فارسی، متعدد مثنویاں، ذکر میر (فارسی) شامل ہیں، وہاں ایک رسالہ فیض میر بھی ہے جو انھوں نے فارسی زبان میں لکھا تھا۔ اس رسالے کا ذکر آزاد نے اپنی مشہور کتاب "آب حیات" میں کیا ہے، لیکن لوگوں نے اُسے بھی آزاد کی داستان طرازی سمجھا۔ بعدازاں جب اس کا قلمی نسخہ دریافت ہوا تو لوگوں نے آزاد کے بیان کی سچائی کو تسلیم کیا ــــــ لیکن اسی حد تک کہ بغیر پڑھے اس کے بارے میں رائے دینی شروع کی جیسا کہ رام بابو سکسینہ اور مرزا عسکری کی مشہور و معروف "تاریخ ادب اُردو" میں لکھا ہے "ایک رسالہ بزبان فارسی موسوم بہ فیض میر جس کے آخر میں چند لطیفے و حکایات ہیں۔ ان میں بعض بہت فحش ہیں، اس سے اس زمانے کا مذاق معلوم ہوتا ہے"۔

اب جبکہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے توسط سے فیض میر چھپ چکی ہے حقیقت

یہ ہے کہ اس میں پانچ حکایتیں بیان کی گئی ہیں، ان حکایتوں میں میرتقی میر نے بزرگوں درویشوں اور فقیروں کی کرامات کا ذکر کیا ہے۔ اس میں محض لطائف و حکایات کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔

میر صاحب نے "ذکر میر" میں تفصیل کے ساتھ اپنے درویش باپ میر علی متقی اور ایک دوسرے درویش سید امان اللہ کا ذکر کیا ہے۔ میر صاحب نے سید امان اللہ کو "ذکر میر" میں ہمیشہ عم بزرگوار کہہ کر یاد کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ ان کی تربیت انھیں بزرگ کے زیر سایہ ہوئی۔ چنانچہ تیس سال بعد جب آگرے آئے تو ان کی قبروں کی زیارت کی۔ چنان چہ "ذکر میر" سے ہی میر کے عقائد کا اندازہ ہوتا ہے اور "فیض میر" ان عقائد پر مہر ثبت کرتی ہے۔ جس میں فقیروں کی کرامات کا ذکر بڑے جذبِ دل کے ساتھ کیا ہے۔

"فیض میر" کی اہمیت اس اعتبار سے بھی زیادہ ہے کہ اردو کے اس عظیم اور باکمال شاعر کی سیرت کی ایک تصویر ان پانچ حکایتوں کے ذریعے کسی حد تک اُبھرتی ہے۔

پہلی حکایت میں ایک درویش کی زبانی کہتے ہیں "یہ دنیا ایک دل کش کارواں گاہ ہے۔ یہاں سے حسرت کے سوا کچھ نہیں جاتا۔ افسوس ہے اس شخص کی اوقات پر کہ جو جلد آگاہ نہیں ہوتا بشیرانہ زندگی بسر کرو، اور آخرت کی فکر کرو۔ وقت جو بھاگا جا رہا ہے اسے ضائع نہ کرو"۔ آخری حکایت میں میاں سعید خاں کے بارے میں لکھتے ہیں "ایک دفعہ کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی چیز اپنی چادر میں باندھ کر لا رہے ہیں۔ میں (میر) آگے بڑھا اور پوچھا کہ آپ کیا لائے ہیں۔ کہنے لگے کہ اس محلے میں ایک بڑھیا ہے، جو بڑی تلخی سے اپنی زندگی گزارتی ہے اور خاک پر پڑی ہوئی بھیک مانگا کرتی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے مٹھائی بھیجی ہے۔ آؤ چل کر اس کو یہ مٹھائی کھلا آئیں۔ میں بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ ایک بڑھیا کو سر راہ اسی حال میں دیکھا وہ اس کے سامنے جا کر کہنے لگے کہ اٹھ اور مٹھائی کھا۔ اس ضعیفہ نے مدت سے مٹھائی کا نام بھی نہ سنا تھا، کھانے کا ذکر کیا۔ گھبرا کے اس نے اپنا سر اٹھا لیا۔ فقیر نے وہ سب مٹھائی اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے خوب پیٹ بھر کر کھائی اور سو رہی۔ انھوں نے میری طرف منہ کیا اور کہا "راحت بدل رساں کہ ہمیں منزل است و بس"۔

اس سے تیر کی انسان دوستی کی بنیادوں پر روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس فیضان کا سرچشمہ کہاں ہے۔
پروفیسر مسعود حسن رضوی کا یہ کلام ان کی تخلیقی تصانیف سے کسی طرح کم نہیں اور اردو ادب میں ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

اطہر پرویز

ادبی خبریں

مرتبہ: مرتضیٰ حسین بلگرامی

اُردو سے متعلق میمورنڈم

نئی دہلی ۴ جون ۱۹۶۵ء سہ پہر چار بج کر بچاس منٹ پر کانگریسی ایم، ایل، اے جناب جمیل الرحمٰن قدوائی اور مولانا عبدالرؤف ایم، ایل، سی نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن سے ملاقات کی اور انھیں یو پی اسمبلی اور کونسل کے ۲۰۴ ممبروں کا دستخطی میمورنڈم اُردو کے سلسلے میں پیش کیا۔

ثقافتی ادب کا کل ہند مقابلہ

ثقافتی ادب کے چوتھے کل ہند مقابلہ میں جس کا اہتمام مرکزی وزارت کیمونٹی ڈیولپمنٹ کی جانب سے کیا گیا تھا، ہندوستان کے دس مصنفین کے لیے ایک ایک ہزار روپے کے دس انعامات کا اعلان کیا گیا۔ چودہ زبانوں کے اس کل ہند مقابلہ میں اُردو کے دو مصنفین جناب سید محمد ابراہیم صاحب فکری اور کشور زیدی صاحبہ کو ان کی تصنیف "پنچایتی راج" پر مبلغ ایک ایک ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔

بزمِ فروغ ادب کا مشاعرہ

بھوپال ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء ۱۰ بجے شب میں بزم فروغ ادب ہیوی الیکٹریکل لمیٹڈ بھوپال کی جانب سے آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی یاد میں محفل مشاعرہ زیر صدارت جناب ایم، عرفان منعقد ہوئی۔ مشاعرہ کے آغاز سے قبل صدر موصوف نے آنجہانی نہرو کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مشاعرہ کا آغاز جناب فضل تابش کی نظم "مگر مچھ کے آنسو" سے ہوا۔ جسے سامعین نے بہت پسند کیا۔ حضرت واحد علی بانکے، قاسم نیازی، وقا صدیقی، شفق بھوپالی ظفر صہبائی، انصار النظر، نغاں بھوپالی، مظفر رئیس وغیرہ شعرائے کرام خاص طور سے پسند کیے گئے۔

جناب قمر تاباں اور شفق بھوپالی نے اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔

رضی مجیدی

لوک گیتوں پر تحقیقی کام

جناب اظہر علی فاروقی آج کل "اللہ تری مہجؔ کے نام" سے ایک کتاب ترتیب دینے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ جو ہندوستانی مسلمانوں کے لوک گیتوں پر مشتمل ہوگی۔ موصوف اس سلسلے میں اتر پردیش میں کام پورا کر چکے ہیں اور اس وقت بہار راج کے دیہاتوں میں گھوم گھوم کر لوک گیت جمع کر رہے ہیں۔ اس کہن سالی اور شدت گرما کو دیکھتے ہوئے ان کی یہ محنت شاقہ لائق ستائش ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کام اردو زبان اور ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا۔

(ملک نذیر احمد)

علامہ وحشتؔ کی نویں برسی

بزم شاکری کلکتہ کی طرف سے اُردو کے عظیم شاعر علامہ رضا علی وحشتؒ کی نویں برسی ۱۳ر جون ۶۵ء کو بزم کے دفتر میں شان دار طریقے سے منائی گئی۔ عصر کے بعد سے مغرب تک قرآن خوانی ہوئی۔ اس کے بعد نماز مغرب و چائے نوشی کے لیے ایک گھنٹہ کا وقفہ کیا گیا پھر ساڑھے سات بجے سے غیر طرحی مشاعرے کا آغاز ہوا جو تقریباً رات کے دس بجے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

مشاعرے میں کئی نوجوان شعراء کے علاوہ جانشین وحشتؒ حضرت شاکر کلکتوی، حضرت جرم محمد آبادی (صدر مشاعرہ)، پروفیسر عباس علی خاں بیخود، حضرت رضا مظہری، حضرت ناوک لکھنوی اور پروفیسر آثر صدیقی نے شرکت فرمائی۔

(سفیر الدین کمال)

وفیات

اُردو کے ممتاز شاعر اور مرثیہ گو جناب سرفراز حسین خبیر لکھنوی کا ۷ر جون ۶۵ء کو بریلی میں دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ خبیر صاحب مرزا دبیر کے بیٹے اور مرزا اوج لکھنوی کے شاگرد تھے اور دبیر اسکول کے بہت ممتاز علم بردار تھے۔

سید جعفر حسین منظر لکھنوی کا ۲۸ر مئی ۶۵ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۷۰ سال تھی اور آپ کا لکھنؤ اسکول کے چند آخری تابناک چراغوں میں شمار ہوتا تھا۔

سالانہ ایک روپیہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵	فی پرچہ ۱۰ پیسے

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر۔ نئی دہلی سے شائع کیا

کچھ اچھی کتابیں

ڈرامے

اوپر کی منزل	کرتار سنگھ دگل	۲/-
آزمایش	پروفیسر محمد مجیب	۱/-
آئینۂ ایّام	پریسٹلے	۲/۵۰
آذر کا خواب	بیگم قدسیہ زیدی	۱/۵۰
بند لفافہ	اشتیاق حسین قریشی	-/۳۱
جان ہار	بیگم قدسیہ زیدی	۱/۳۷
خالد کی خالہ	بیگم قدسیہ زیدی	۱/۷۵
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۲/۵۰
دل سے قریب	انتصار حسین	۱/۷۵
سراج الدّولہ	سچین سین گپتا	۱/۵۰
کھیتی	پروفیسر محمد مجیب	-/۷۵
موت پر فتح	جیالال ساز	۱/۵۰

Regd No. D. 58

July, 1965

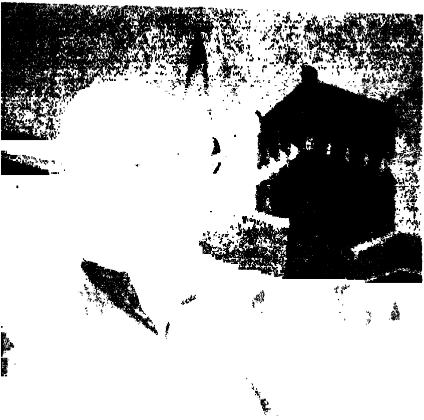
Kitab Numa

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25.

ماہنامہ کتاب نما

نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی



اختر حسین فاروقی مرحوم

غلام ربانی تاباں

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۶ | اگست ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۸

اشاریہ

ہمیں خوشی ہے کہ مکتبہ جامعہ کا شائع کردہ میرامّن دہلوی کا شاہکار "باغ وبہار" کا قابلِ ذکر اڈیشن جسے جناب رشید حسن خاں صاحب نے مرتب کیا تھا، اپنی افادیت اور صحتِ الفاظ و بیان کی وجہ سے ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور سب ہی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے ہماری یہ کتاب مختلف اسکولوں کے نصابوں میں اور خاص طور سے مدراس کے ایس۔ایس۔سی کے نصاب میں درسی کتاب کی حیثیت سے شامل کرلی گئی۔ اور تو اور اب روسی زبان میں بھی اس مخصوص اڈیشن کے ترجمہ کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ یہ ترجمہ تاشقند یونیورسٹی کے ہندوستانی مہمان جناب ڈاکٹر قمر رئیس صاحب فرمارہے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ختم ہوچکا ہے اور اب ہم دوسرے اڈیشن کی تیاری میں لگے ہیں۔ اُمید ہے صاحبانِ ذوق کو اس کے لیے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔

افسوس جامعہ کے ایک پُرانے رفیق اور استاد جناب اختر حسن فاروقی صاحب کا حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ۱۵ جولائی ۶۵ء کو لکھنؤ میں اچانک انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اختر صاحب مرحوم نہایت وضع دار اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ جامعہ ۱۷ جولائی کو کھل رہی تھی۔ اختر صاحب لکھنؤ سے ۱۵ کی رات کی گاڑی سے روانہ ہونے والے تھے۔ سیٹ بھی ریزرو ہوچکی تھی۔ چلنے سے پہلے سہپر میں نہانے کے لیے غسل خانے گئے اور پھر وہیں سے بجائے اس مختصر سفر کے اس طویل سفر پر چلے گئے جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا۔

اختر انصاری دہلوی

اُردو نثر کے اسالیب اور پریم چند

اردو نثر کے تمام معنوی اکتسابات سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر ہم صرف طرز ادا اور انداز بیان ہی کے زاویے سے اُردو انشاپردازوں کی تخلیقات کا جائزہ لیں، تب بھی ہماری نظر ایک بے پناہ رنگارنگی اور بے پایاں تنوع سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یقیناً اُردو کی انشاپردازی بیان و ادا اور اظہار و ابلاغ کی لاکھوں نزاکتیں اور بے شمار لطافتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اردو کا نثری ادب بلاشبہ اسالیب و صور کا ایک حیرت انگیز طلسم خانہ ہے۔ اس کے باوجود طرز و اسلوب کی روایت اردو نثر کی کوئی بہت پرانی روایت نہیں ہے اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سو سال کی سمجھنی چاہیے، درآں حالیکہ خود اُردو زبان کی عمر ہزار نو سو سال کے لگ بھگ ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی میں اردو زبان نے شمالی ہندوستان میں جنم لیا۔ چودھویں صدی سے دکن میں اردو نثر کی کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں۔ اور اٹھارھویں صدی اختتام تک سینکڑوں تصانیف وجود میں آگئیں۔ اُدھر اٹھارھویں صدی کے شروع میں اردو کا مرکز ثقل پھر دکن سے شمالی ہندوستان منتقل ہوا۔ اور شمالی ہندوستان میں بھی اردو نثر کے کچھ نمونے وجود میں آئے۔ لیکن دکن اور شمالی ہندوستان کی ان حقیقی کوششوں اور کم و بیش پانچ سو سال کی ادبی و تصنیفی کاوشوں کے باوجود نثر کا کوئی قابل ذکر اسلوب ابھر کر سامنے نہیں آیا۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کی منظم تحریک کے زیر اثر اُردو نثر نے بہت ترقی کی اور نثر نگاروں کی ایک اہم جماعت نے بہت بڑی تعداد میں کتابیں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کیں۔ اس گروہ کے بعض مصنفوں اور اس سلسلے کی بعض کتابوں کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ پھر اسی زمانے میں جب کہ فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کا محکمہ جاری تھا، اور اس کے بعد

بھی کالج اور کلکتے سے باہر بے شمار لکھنے والے انفرادی طور پر کتابیں لکھنے میں مصروف ہے اور صدیوں صدہا مصنفین کے صدہا نثری کارنامے منظر عام پر آئے۔ نثر کی اس کثیر اور وافر مقدار میں بھی صرف تین مصنفین یعنی میر امن، یا رجب علی بیگ سرور اور مرزا غالب کی تحریریں تھیں جو آج بھی زندہ و باقی ہیں، اور اگر ایک طرف اردو نثر کے ارتقائی سفر کی اہم منزلیں خیال کی جاتی ہیں تو دوسری طرف ادبی نشاط و اہتزاز کا سرچشمہ بھی۔ گویا انیسویں صدی کے ابتدائی ساٹھ ستر برسوں میں 'اور حالی اور سرسید کا دور شروع ہونے سے پہلے تک انشا پردازی کے صرف تین اہم اسلوب نمایاں ہوسکے اس کے بعد نثر نگاری کے میدان میں روش خاص پیدا کرنے کی ایک روایت بنی شروع ہوئی اور اسلوب بیان کی داغ بیل پڑی۔

انیسویں صدی کا نصف سے زیادہ حصہ گزر جانے کے بعد سرسید اور ان کے رفقا و معاصرین کی ادبی سرگرمیوں کے ذریعے جدید اُردو نثر کی بنیاد پڑی۔ اس وقت سے اب تک تقریباً ایک سو سال کی مدت میں بے شمار تصانیفِ نثر کے ساتھ ایک بہت بڑی تعداد اسالیبِ نثر کی وجود میں آچکی ہے"۔ داستان تاریخ اردو" کے مصنف نے ان تمام اسالیب پر مجموعی حیثیت سے تبصرہ کرتے ہوئے چند بڑے کام کی باتیں کہی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

"پرانی تعلیم کے زیر سایہ اور نئی روشنی کی صبح صادق میں جتنے بہتر سے بہتر اسالیب بیان پیدا ہوسکتے تھے وہ سرسید سے شبلی و سرشار تک پیدا ہو گئے۔ اس امر میں سرسید کی جامعیت حیرت انگیز ہے۔ اکیلے سرسید کی تحریریں عالمانہ و فلسفیانہ، متین و مزاحی، نرم و گرم ہر طرح کا اسلوب موجود ہے شبلی اپنے اسلوب کے توازن و تناسب، صحت و پختگی میں سب معاصرین سے بڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن سرسید کے جوش کی اُن میں کمی ہے۔ حالی ان دونوں کے درمیان ہیں۔ اگرچہ جوش ان میں بھی نہیں ہے حالی نے سرسید کی صحت و صفائی کو آگے بڑھایا لیکن حسن و موزونیت میں شبلی سے پیچھے ہے۔ نذیر احمد اور آزاد اپنے اپنے رنگ رنگ کے موجد و خاتم ہوتے۔ سرشار و سجاد حسین بھی طرز ظرافت کے خداوند تھے۔ بیسویں صدی میں اقسام کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ اسالیب بیان ایجاد ہوئے۔ اور تقریباً سب انگریزی زبان و علوم سے متاثر ہیں۔

عصر حاضر میں مغربی تعلیم سے اُردو کو جو سب سے بڑا فیض پہنچا اور زبان و ادب کی اصلی خدمت ہوئی وہ یہ ہے کہ فلسفہ و سائنس، تاریخ و سیرت، ادب و انشا، تبصرہ و تنقید، ناول و افسانہ وغیرہ مختلف موضوعات کے لیے الگ الگ مناسب و موزوں اسالیب مخصوص ہوگئے۔ اب سے پہلے یہ بات نہ تھی یا خال خال تھی۔

سردست اُن اسالیب سے بحث نہیں جو فلسفہ و سائنس، تاریخ و سیرت ادب و انشا، تبصرہ و تنقید اور نثر کے دوسرے شعبوں کے ضمن میں منظر عام پر آئے۔ بلکہ صرف ان اسلوبوں کا تذکرہ مقصود ہے جو افسانہ و ناول کے ضمن میں ایجاد ہوئے۔ تاکہ ان کے پس منظر میں پریم چند کے اسلوب کی نوعیت اور قدر و قیمت متعین کی جاسکے۔

ہر چند کہ داستان گوئی اور قصہ نویسی کا سلسلہ اُردو میں بہت پرانا ہے، لیکن جدید انداز کا ناول ایک مختلف چیز ہے جس کی ابتدا نذیر احمد نے کی۔ نذیر احمد کے بعد اردو ناول سرشار، شرر، رسوا اور دوسرے اہم اور غیر اہم ناول نگاروں کے ہاتھوں سے گزرتا ہوا پریم چند تک پہنچا۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے دور حاضر کے ناول نگاروں سے قطع نظر کرلیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُردو ناول ایک ایسا ادبی جادہ ہے جس کے ایک سرے پر نذیر احمد ہیں اور دوسرے سرے پر پریم چند پھر یہ امر بھی محتاج وضاحت نہیں کہ ایک کامیاب و بلند پایہ ناول نگار ہونا اور بات ہے اور صاحب طرز ادیب یا انشا پرداز ہونا بالکل دوسری بات ہے دوسرے الفاظ میں یہ ضروری نہیں کہ ہر اچھا ناول نگار ایک صاحب طرز انشا پرداز بھی ہو۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن ناول نگاروں کا ذکر ابھی آیا ہے۔ ان میں صرف نذیر احمد۔ سرشار، اور ایک خاص معنی میں پریم چند ایسے ہیں جن کو صاحب طرز ادیب ہونے کا امتیاز بھی حاصل ہے۔ نذیر احمد کا طرز خاص جن عناصر سے مرکب ہے اُن میں دلی کی ٹکسالی زبان، گھریلو محاورہ، نسائی روزمرہ، ٹھیٹھ ہندی الفاظ کے پہلو بہ پہلو عربی الفاظ و مرکبات کا استعمال، محاورات و ضرب الامثال کی بھرمار، خطیبانہ تکرار اور شوخی و ظرافت کی آمیزش خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح اگر سرشار کے منفرد اسلوب کا تجزیہ کیا جائے تو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان، مختلف طبقوں کا مخصوص محاورہ اور لب و لہجہ، جملوں کا تیز بہاؤ، فقروں کا کرارا پن، مکالموں کا

میں جب نہ صورت

پھر تیلاپن، مزاحیہ انداز اور طنزیہ پیرایہ اس کے اجزائے ترکیبی قرار پاتے ہیں۔

ان دو کلاسیکی اسلوبوں بلکہ ان جیسے بے شمار اسالیب کی طرح ہم پریم چند کے اسلوب کی بھی چھان پھٹک کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ پریم چند کے اسلوب کا جائزہ لیتے وقت ہماری نظر اس کے جزوی پہلوؤں پر پڑنے کی بجائے سب سے پہلے اس کے ایک مجموعی وصف پر پڑتی ہے۔ وہ مجموعی وصف یا جامع و ہمہ گیر خصوصیت اس کا جمہوری دعوامی انداز ہے۔ اسی ایک حاوی خصوصیت کی بنا پر پریم چند کا اسلوب ایک منفرد اسلوب اور ان کا طرز ایک خاص طرز ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہی وہ چیز ہے جس نے پریم چند کے منفرد اسلوب کو نہایت درجہ منفرد بنا دیا ہے۔ یہ اجمال شاید کسی قدر تفصیل چاہتا ہے۔ ظاہر ہے ہر منفرد اسلوب تمام دوسرے اسالیب سے نمایاں اور واضح طور پر مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بدیع و منفرد کیوں کہلائے؟ لیکن اس کے باوجود بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بہت سے منفرد اسالیب ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں، گویا ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں۔ اور یوں ان میں اختلاف و تنوع کے باوجود اتحاد و اشتراک کی کارفرمائی بھی پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک بہت اچھی مثال ہمیں اپنے ادب لطیف کے لکھنے والوں میں ملتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایک منفرد اسلوب کا مالک ہے، مگر پھر بھی ان کے اسالیب آپس میں ایک گونہ مماثلت رکھتے ہیں۔ یا پھر ہمارے آج کے بعض افسانہ نگاروں کی مثال ہے کہ اپنی اپنی جگہ صاحب طرز ہونے کے باوجود وہ ایک طرح کی یگانگت یا یک رنگی و ہم آہنگی کے اسیر نظر آتے ہیں مگر گاہے گاہے ہم ایسے اسلوب سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں جو کسی سلسلے کی کڑی ہونے کی بجائے اپنی نظیر آپ ہوتا ہے۔ نہایت درجہ منفرد اسلوب سے میری مراد اسی قسم کا اسلوب ہے۔ پریم چند کا اسلوب اسی نوعیت کی چیز ہے جس کو حد درجہ منفرد اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی جمہوری دعوامی خصوصیت کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ دوسرے اہم اسالیب میں اس خصوصیت کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ پریم چند کے ہم عصر یا پیش رو ادیبوں کے اسالیب اس رنگ سے بالکل عاری ہیں۔

اس بات کو واضح کرنے کے لیے میں غیر ملکی ادبیات سے ایک مثال پیش

کروں گا۔ میکسم گورکی، لوہسون اور پریم چند ان تینوں کا انتقال ایک ہی سال یعنی ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ یہ ایک عجیب و غریب اتفاق تھا۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگیاں بھی بڑی حد تک ہم آہنگ تھیں۔ ہم عصر ہونے کے علاوہ یہ تینوں مصنف ادب کی ایک ہی صنف کے لکھنے والے تھے۔ تینوں نے اپنی اپنی زبان کے افسانوی ادب کو ایک یکساں قسم کے عبوری دور سے گزارا۔ تینوں نے اپنے اپنے ملک میں ادبی نشاۃ ثانیہ کی قیادت، رہبری اور سرپرستی کی، اور ذہنی و فکری زندگی کے دھارے کا رخ نئے انقلابی زمانے کے داعیات و مطالبات کی طرف موڑا۔ تینوں نے ادب کو ہیئت پرستی، انفرادیت پسندی، رومانیت، تصوریت، لامقصدیت فراریت اور جاگیردارانہ دور کے دوسرے رجعت پرورانہ تصورات سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کی۔ اور عوامیت، جمہوریت، اجتماعیت، ارضیت، مادیت، انسان دوستی، مقصدیت اور دوسری ترقی پسندانہ قدروں کو رائج کیا، اور آگے بڑھایا، گورکی کی تحریروں میں روس کا پرولتاری طبقہ پہلی دفعہ کسی زمین دوز دنیا سے برآمد ہو کر ایک آتش فشاں کی طرح پھٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لوہسون کے خاکوں، افسانوں اور طنزیہ مقالوں میں چینی عوام الناس کی زندگی کے مختلف پہلو بے شمار بھیانک زخموں کی شکل میں پہلی دفعہ ہماری نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں ہندوستان کے گونگے دیہات، صدیوں کی بے زبانی کے بعد پہلی مرتبہ اپنے بے پناہ دکھوں کی دل خراش داستان کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان تینوں مصنفوں کی زندگیاں ادبی، فنی اور کلچری خدمات کے اعتبار سے بڑی حد تک ہم آہنگ تھیں۔ شاید اسی ہم آہنگی کا لحاظ کرتے ہوئے حیات جاوداں نے بھی اپنا دروازہ ان تینوں کے لیے بیک وقت وا کیا۔

اس وقت پریم چند کے اسلوب کی شدید اور غیر معمولی انفرادیت کو واضح کرنے کی کوشش میں لوہسون سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف گورکی اور اس کی ناول نگاری کی مثال سے کام لوں گا۔ گورکی کی کوئی نمائندہ تخلیق لیجیے۔ جیسے اس کا شہرۂ آفاق ناول 'ماں'۔ اس ناول کا مطالعہ ایک نہایت درجہ نئے، اچھوتے، شدید اور عظیم جذباتی تجربے سے گزرنے کے مترادف ہے۔ یہ ایک نئی دنیا

ایک نئی انسانیت، ایک نئے تمدن اور ایک نئے سماج کی آواز ہے۔ عالمی ادب کے ایوان میں یہ ایک نادر اور فقید المثال نوائے بیداری کی گونج ہے۔ دوسری طرف وہ بے شمار افسانوی شاہکار ہیں جو مغرب کے کلاسیکی ادب کا شان دار ورثہ ہیں۔ ان شاہکاروں کے خالق عظیم اور برگزیدہ مصنف ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنا جدا گانہ رنگ رکھتا ہے۔ اور اپنے رنگ کا بلاشرکت غیرے مالک ہے۔ یہ شاہ کار باہمی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے اس قدر مختلف نہیں ہیں جس قدر گورکی کا ناول، ماں ان سب سے مختلف ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ گورکی کے ناول ماں کے مقابلے میں اگر ان کو دیکھا جائے تو یہ سب ایک دوسرے سے کچھ ملتے جلتے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مصنف، چارلس ڈکنز اور ڈی۔ ایچ لارنس جیسے دو ایک لکھنے والوں کے سوا، سب کے سب خوش حال، تعلیم یافتہ، حقوق یافتہ، ذی ثروت اور ذی جاہ متوسط طبقے کے افراد ہیں۔ وہ اپنے ناولوں میں متوسط طبقے ہی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی اور مصوّری کرتے ہیں۔ یہ زندگی ہماری دیکھی بھالی اور جانی پہچانی زندگی ہے۔ ہم اس کے "انداز قد" سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور یہ چاہے جس رنگ کا جامہ پہن کر ہمارے سامنے آئے ہم اس کو جانے اور پہچانے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کے برعکس گورکی کے ناول ماں میں ہم انسانوں کے جس طبقے سے روشناس ہوتے ہیں وہ ہمارے لیے بالکل نیا ہے، اور اب تک شاید ہمارے فکر و تصور کی حدود سے بھی باہر تھا۔ اس طبقے سے روشناس ہوتے وقت ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ گویا ہم ایک نئی دنیا، ایک نئی زندگی، ایک نئی طاقت یا ایک نئے پیغام اور ایک نئی بشارت سے متعارف ہو رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ طبقہ بھی دو بڑے حصوں میں منقسم ہے، ایک حصہ اُن مزدوروں پر مشتمل ہے جو ابھی بیدار نہیں ہوئے، یہ ابھی اسی حیوانیت کے شکار ہیں جو عام انسانوں کے لیے منظم سرمایہ داری کی دین ہے۔ دوسرے حصے میں وہ مزدور ہیں جو بیدار ہو چکے ہیں، جو طبقاتی شعور رکھتے ہیں۔ اُن کے پاس زندگی کا ایک جامع فلسفہ ہے یہ ایک چٹان جیسی مضبوط منطق سے مسلح ہیں ان کے جمالیاتی خوابوں پر ہزاروں جنتیں قربان ہوتی نظر آتی ہیں۔ یہ انسانیت کو ایک نیا مزاج، ایک نیا وجدان، ایک نئی سرشت اور ایک نئی فطرت عطا کرنے

کرول گا۔ میکسم گورکی، لوہسون اور پریم چند ان تینوں کا انتقال ایک ہی سال یعنی ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ یہ ایک عجیب و غریب اتفاق تھا۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگیاں بھی بڑی حد تک ہم آہنگ تھیں۔ ہم عصر ہونے کے علاوہ یہ تینوں مصنف ادب کی ایک ہی صنف کے لکھنے والے تھے۔ تینوں نے اپنی اپنی زبان کے افسانوی ادب کو ایک یکساں قسم کے عبوری دور سے گزارا۔ تینوں نے اپنے اپنے ملک میں ادبی نشاۃ ثانیہ کی قیادت، رہبری اور سرپرستی کی، اور ذہنی و فکری زندگی کے دھارے کا رُخ نئے انقلابی زمانے کے داعیات و مطالبات کی طرف موڑا۔ تینوں نے ادب کو ہیئت پرستی، انفرادیت پسندی، رومانیت، تصوریت، لامقصدیت فراریت اور جاگیردارانہ دور کے دوسرے رجعت پرورانہ تصورات سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کی۔ اور عوامیت، جمہوریت، اجتماعیت، ارضیت، مادیت، انسان دوستی، مقصدیت اور دوسری ترقی پسندانہ قدروں کو رائج کیا، اور آگے بڑھایا، گورکی کی تحریروں میں روس کا پرولتاری طبقہ پہلی دفعہ کسی زمین دوز دنیا سے برآمد ہو کر ایک آتش فشاں کی طرح پھٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لوہسون کے خاکوں، افسانوں اور طنزیہ مقالوں میں چینی عوام الناس کی زندگی کے مختلف پہلو بے شمار بھیانک زخموں کی شکل میں پہلی دفعہ ہماری نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں ہندوستان کے گونگے دیہات، صدیوں کی بے زبانی کے بعد پہلی مرتبہ اپنے بے پناہ دکھوں کی دل خراش داستان کہتے ہوئے سُنائی دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان تینوں مصنفوں کی زندگیاں ادبی، فنی اور کلچری خدمات کے اعتبار سے بڑی حد تک ہم آہنگ تھیں۔ شاید اسی ہم آہنگی کا لحاظ کرتے ہوئے حیاتِ جاوداں نے بھی اپنا دروازہ اِن تینوں کے لیے بیک وقت وا کیا۔

اس وقت پریم چند کے اسلوب کی شدید اور غیر معمولی انفرادیت کو واضح کرنے کی کوشش میں لوہسون سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف گورکی اور اس کی ناول نگاری کی مثال سے کام لوں گا۔ گورکی کی کوئی نمائندہ تخلیق لیجیے۔ جیسے اس کا شہرۂ آفاق ناول "ماں"۔ اس ناول کا مطالعہ ایک نہایت درجہ تیز، اچھوتے، شدید اور عظیم جذباتی تجربے سے گزرنے کے مترادف ہے۔ یہ ایک نئی دنیا

ایک نئی انسانیت، ایک نئے تمدن اور ایک نئے سماج کی آواز ہے۔ عالمی ادب کے ایوان میں یہ ایک نادر اور فقید المثال نوائے بیداری کی گونج ہے۔ دوسری طرف وہ بے شمار افسانوی شاہکار ہیں جو مغرب کے کلاسیکی ادب کا شاندار ورثہ ہیں۔ ان شاہکاروں کے خالق عظیم اور برگزیدہ مصنف ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنا جدا گانہ رنگ رکھتا ہے۔ اور اپنے رنگ کا بلاشرکت غیرے مالک ہے۔ یہ شاہ کار باہمی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے اس قدر مختلف نہیں ہیں جس قدر گورکی کا ناول، ماں ان سب سے مختلف ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ گورکی کے ناول ماں کے مقابلے میں اگر ان کو دیکھا جائے تو یہ سب ایک دوسرے سے کچھ ملتے جلتے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مصنف، چارلس ڈکنز اور ڈی۔ ایچ لارنس جیسے دو ایک لکھنے والوں کے سوا، سب کے سب خوش حال، تعلیم یافتہ، حقوق یافتہ، ذی ثروت اور ذی جاہ متوسط طبقے کے افراد ہیں۔ وہ اپنے ناولوں میں متوسط طبقے ہی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی اور مصوّری کرتے ہیں۔ یہ زندگی ہماری دیکھی بھالی اور جانی پہچانی زندگی ہے۔ ہم اس کے "انداز قد" سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور یہ چاہے جس رنگ کا جامہ پہن کر ہمارے سامنے آئے ہم اس کو جانے اور پہچانے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کے برعکس گورکی کے ناول ماں میں ہم انسانوں کے جس طبقے سے روشناس ہوتے ہیں وہ ہمارے لیے بالکل نیا ہے، اور اب تک شاید ہمارے فکر و تصور کی حدود سے بھی باہر تھا۔ اس طبقے سے روشناس ہوتے وقت ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ گویا ہم ایک نئی دنیا، ایک نئی زندگی، ایک نئی طاقت یا ایک نئے پیغام اور ایک نئی بشارت سے متعارف ہو رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ طبقہ بھی دو بڑے حصوں میں منقسم ہے، ایک حصہ اُن مزدوروں پر مشتمل ہے جو ابھی بیدار نہیں ہوئے، یہ ابھی اسی حیوانیت کے شکار ہیں جو عام انسانوں کے لیے منظم سرمایہ داری کی دین ہے۔ دوسرے حصے میں وہ مزدور ہیں جو بیدار ہو چکے ہیں، جو طبقاتی شعور رکھتے ہیں۔ اُن کے پاس زندگی کا ایک جامع فلسفہ ہے یہ ایک چٹان جیسی مضبوط منطق سے مسلح ہیں ان کے جمالیاتی خوابوں پر ہزاروں جنتیں قربان ہوتی نظر آتی ہیں۔ یہ انسانیت کو ایک نیا مزاج، ایک نیا وجدان، ایک نئی سرشت اور ایک نئی فطرت عطا کرنے

کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ جب گورکی جیسا فن کار اپنے فن کی جگمگاتی روشنی ان پر، ان کے عزائم پر اور ان کی جدوجہد پر ڈالتا ہے تو ہماری آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ایک نئی دنیا بے نقاب ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اسی باعث گورکی کا اسلوب مغرب کے دوسرے ناول نگاروں کے اسالیب سے غیر معمولی طور پر ممتاز ہو جاتا ہے۔ اور اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ گورکی کا اسلوب نہ صرف منفرد بلکہ حد درجہ منفرد اور چونکا دینے کی حد تک منفرد ہے۔ بالکل انھیں معنوں میں پریم چند کا اسلوب بھی اردو نثر کے دوسرے اسالیب سے یکسر مختلف ہے۔ اور اسی بنا پر ہم اس کو بھی نہ صرف منفرد بلکہ حد درجہ منفرد قرار دے سکتے ہیں (یہاں ضمناً یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گورکی اور پریم چند کی مذکورہ خصوصیت کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ دونوں اپنی اپنی زبان کے عظیم ترین ناول نگار ہوئے ہیں یقیناً ٹالسٹائے گورکی سے بڑا فن کار ہے۔ اور اسی طرح مرزا ہادی رسوا رتبۂ فن کے لحاظ سے پریم چند پر فوقیت رکھتے ہیں)۔

اسی سلسلے میں میرا ذہن نظیر اکبرآبادی کی طرف جاتا ہے۔ اردو شاعری میں نظیر کا طرز جن معنوں میں انوکھا اور خاص ہے بالکل انہیں معنوں میں پریم چند کا طرز اردو نثر میں نرالا اور منفرد ہے۔ جس طرح نظیر نے اردو کی معروف و متداول شاعری سے انحراف کر کے اپنے لیے ایک روشِ خاص پیدا کی، اور ایک نئے شاعرانہ اسلوب کی تخلیق کی، اسی طرح پریم چند نے اردو نثر نگاری کی روایتی قدروں سے منہ موڑ کر اپنے لیے ایک روشِ خاص وضع کی اور ایک نیا نثری اسلوب پیدا کیا۔ اور یہ ان دونوں کی محض جدت طرازی یا نری اختراع پسندی یا خالی خولی تغیر آرائی نہیں تھی۔ عام روش سے بچ کر چلنے اور ایک چونکا دینے والا انداز اختیار کرنے کی خواہش اگر کسی تعمیری مقصد کے ماتحت نہ ہو تو وہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے والی بات ہو کر رہ جاتی ہے۔ اکل کھرا پن یا اپنے آپ کو سارے زمانے سے مختلف سمجھنے اور ثابت کرنے کا جذبہ کم از کم ادب کی دنیا میں تو کبھی مفید و موثر نتائج کا باعث یا ضامن ثابت نہیں ہوا۔ نظیر اور پریم چند کی ادبی فتوحات کسی کھوکھلی، نراجی اور غیر سماجی انفرادیت پسندی کی پیداوار ہونے کی بجائے دونوں کے شعور میں

تصورحیات اور نظریۂ فن کا نتیجہ تھیں۔ گویا تصورحیات اور نظریۂ فن نظیر کے یہاں اتنا شعوری نہیں تھا جتنا پریم چند کے یہاں تھا۔ نظیر کے زمانے میں اردو شاعری ایک ٹھہراؤ اور تعطل کے دور سے گزر رہی تھی اور ان تمام سقیم و فاسد رجحانات کا شکار تھی جو ٹھہراؤ اور تعطل سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک زوال پذیر جاگیردارانہ سماج کی شاعری تھی۔ چند انحطاط زدہ طبقے اس پر قابض و متصرف تھے۔ عام انسانوں اور حقیقی انسانی زندگی سے اس کے تمام رشتے منقطع ہو چکے تھے۔ فرار پسندی، انفرادیت پسندی، روایت زدگی، ہیئت پرستی اور دوسرے منفی و مریضانہ عناصر کا زہر اس کی رگوں میں پوری طرح سرایت کر چکا تھا۔ نظیر نے ایک بے مثال ذہنی توانائی اور ایک حیرت انگیز فنی جرأت سے کام لے کر اس شاعری کو خانقاہوں اور شبستانوں سے گھسیٹ کر باہر نکالا اور عام انسانوں کے مجمعوں میں لاکھڑا کیا۔ یہی وہ بے باکانہ اقدام تھا جس نے اردو شاعری کو ایک ایسا اجتماعی شعور اور جمہوری و عوامی انداز بخشا جس سے وہ اس وقت تک محروم تھی۔ پریم چند نے اپنے زمانے کی اُردو نثر کے ساتھ یہی عمل دہرایا۔ اور یہی سلوک کیا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز اس صدی کے ابتدائی سالوں میں ہوا تھا۔ اس وقت تک اردو نثر غالب، سرسیّد اور حالی کی خراد پر چڑھ کر تراش اور خراش اور صفائی ستھرائی کے آخری مدارج طے کر چکی تھی۔ پریم چند ہی کے زمانے میں ادب لطیف اور انشائے جمیل اور شعر منثور کے لکھنے والے اپنے رنگین شاعرانہ تخیل کی گل فشانیوں سے اردو نثر کے دامن کو دامانِ باغبان بنانے اور خوب صورتی و دل فریبی کی لاکھوں اداؤں سے اردو انشا کو سنوارنے اور چمکانے میں مصروف تھے۔ مگر پریم چند نے تمام مروجہ علمی، کتابی، ادبی اور شاعرانہ اسالیب نثر سے روگردانی کی، اور اس تمام طہارت و نفاست، رعنائی و زیبائی، حسن کاری و صناعی اور شعریت و ادبیت سے انحراف کیا جو ان اسالیب کی تعمیر میں صرف ہوئی تھی۔ اپنے گہرے اجتماعی شعور اور سماجی احساس کے زیر اثر انھوں نے زبان کو اعلیٰ و سربرآوردہ اشخاص و طبقات کی اجارہ داری سے نکالا اور اسے عام انسانوں کی ملکیت بنایا۔ اور یوں وہ ایک جمہوری و عوامی اسلوب کے پیدا کرنے اور پروان چڑھانے میں کامیاب ہوئے۔

نظیر اکبر آبادی اور پریم چند کے درمیان موازنہ مقصود نہیں، لیکن اس امر کی طرف اشارہ کرنا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو، کہ اس ادبی جہاد میں نظیر تو صرف بعض اوقات عوامیت اور عامیانہ پن میں امتیاز کرنے سے قاصر رہے (اور غالباً یہی وہ چیز تھی جس کے پیش نظر شیفتہ نے انہیں "شاعر سوقی" قرار دیا تھا۔ لیکن پریم چند نے اپنی عوامیت کو کبھی عامیانہ پن یا سوقیت بننے کی اجازت نہیں دی۔

پریم چند کا مخصوص جمہوری و عوامی اسلوب ان کی کہانیوں اور ناولوں کے جسد میں روح کی طرح دوڑا ہوا ہے۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو خاص خاص مقامات پر یا خاص خاص جملوں میں پائی جائے۔ اس لیے نمائندہ اقتباسات کی شکل میں مثالیں پیش کرنا نہ ممکن ہے نہ ضروری۔ پریم چند کی تخلیقات کا مجموعی حیثیت سے مطالعہ کرکے ہی ہم ان کے مخصوص اسلوب سے کامیابی کے ساتھ دوچار ہو سکتے ہیں۔

("مطالعہ و تنقید" سن اشاعت ۱۹۶۵ء صفحات ۳۲۰، قیمت ۴/۵۰، حوالہ ص ۱۹۵ تا ۲۰۵)

فیض احمد فیض

غزل

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رو سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

(دوستِ تہہ سنگ: ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۹۶، قیمت ۲/۵۰، حوالہ صفحہ ۵۹۹)

بشیشر پردیپ

دشمن

وقت دولت ہے۔ ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے۔ اور اپنے اسی ایک ایک منٹ کا حساب کرتے ہوئے لاجپت رائے نے جیسے اچانک ایک نئی چیز دریافت کرلی۔ دن بھر کے چوبیس گھنٹوں میں چھ گھنٹے دفتر کے نکال کر باقی وقت میں سے اگر کوئی کام سب سے زیادہ وقت لے لیتا ہے تو وہ ہے نیند۔ پورے سات گھنٹے اور کبھی کبھی ساڑھے سات یا آٹھ گھنٹے یعنی دن بھر کا تیسرا حصہ انسان کی زندگی کا تیسرا حصہ! اور یہ کتنا بڑا نقصان ہے۔ وہ آج تک جان ہی نہ سکا کہ یہ وقت آخر جاتا کہاں ہے۔ چوبیس گھنٹے اتنی جلدی کیسے گزر جاتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ سب اس کی نیند کی وجہ سے ہے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمکنے لگیں۔ جیسے اس نے اپنے کسی دشمن کی کھوج لگالی ہو۔ گھر میں چھپے دشمن کی! ــــــ وہ آج کئی دن سے پریشان تھا۔ اس بات سے کہ جتنے کام وہ دن بھر میں کرڈالنا چاہتا تھا ان کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں بچتا تھا۔ وہ کام کہ جن سے روپیہ پیدا ہوسکے۔ محنت سے، دوڑ دھوپ سے کام پورے نہ ہوپاتے اور دن ختم ہوجاتا اور کیلنڈر پر دوسری تاریخ بدل دینی پڑتی۔ دفتر کے بعد وہ ایک دوسری جگہ جہاں وہ پارٹ ٹائم ملازمت کرتا تھا چلا جاتا۔ دو گھنٹے وہاں کام کرنے کے بعد بھاگا بھاگا گھر آتا۔ جلدی جلدی کھانا کھاتا اور پھر اپنا تھیلا اٹھا کر اپنے بزنس کے لیے آرڈر حاصل کرنے مارکیٹ چلا جاتا۔ اس نے ایک کیلنڈر بنانے والی فرم کی ایجنسی لے رکھی تھی۔ ایک چھوٹی سی اپنی کمپنی بھی کھول رکھی تھی جس میں کچھ چیزیں اس نے اپنی تیار کی تھیں، مثلاً چوہے مار گولیاں، کھٹمل مار پوڈر اور مکھی پرانتد فینائل اور اب ان چیزوں کو مارکیٹ میں چلانا چاہتا تھا۔ ان چیزوں کا آرڈر لینے

ایجنسی کے کیلنڈروں کا آرڈر لینے، پچھلے لیے آرڈروں کا مال سپلائی کرنے اور اپنے گاہکوں سے پیسے وصول کرنے وہ رات کے آٹھ بجے سے دس ساڑھے دس بجے رات تک مارکیٹ کے چکر لگاتا ہوا اس وقت لوٹتا جب دکانیں بند ہونے لگتیں۔ گھر آکر وہ سونا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ اسے ٹائپ کا کام کرنا ہوتا تھا۔ یونی ورسٹی کے طلبا کی تھیس ٹائپ کرنے کا کام جو وہ چھٹی کے دن ان کے ہوسٹلوں میں چکر لگا کر مناسب معاوضہ طے کرکے خود ہی لے آتا تھا۔ وہ یہ کام رات کو مارکیٹ سے واپس آنے کے بعد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت کو نہ پاتا تھا۔ نیند اپنی پوری طاقت سے اس پر حملہ کرتی اور وہ اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا۔ وہ سو جاتا اور ٹائپ کا کام صبح کے لیے رہ جاتا حالاں کہ صبح اسے اپنے بزنس کا حساب کتاب کرنا ہوتا تھا۔ خطوط لکھنے ہوتے تھے۔ صبح پانچ ساڑھے پانچ بجے اٹھتا کچھ وقت ٹائپ میں خرچ کرتا اور کچھ اپنی کمپنی کے کام میں اور دفتر کا وقت ہو جاتا اور پھر وہ جلدی جلدی تیار ہو کر دفتر چل دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ انسان نہ ہو ایک مشین ہو نہ تھکنے والی مشین ایک ہی قاعدہ کے مطابق چلنے والی مشین۔ دفتر کے علاوہ دوسرے کاموں سے لاجپت کی آمدنی ابھی تک ساٹھ ستر روپے ماہوار ہی ہو سکی تھی۔ دفتر میں وہ لوئر ڈویژن کلرک تھا اور تنخواہ بھی کچھ زیادہ نہ تھی گھر کے اخراجات نکال کر وہ بہت تھوڑا سا روپیہ جمع کر سکا تھا۔ لیکن اس تھوڑے سے جمع شدہ روپیے نے بھی اس کی حرص تیز کر دی تھی۔ وہ اسے جلد سے جلد اور بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی آمدنی کیسے بڑھائے؟ وہ اپنا بینک بیلنس کیسے بڑھائے؟ یہی فکر اسے ہر وقت لگی رہتی لیکن مشکل تو یہ تھی کہ جس طرح کا وہ بزنس کرتا تھا۔ اس میں نفع کی گنجائش بہت کم تھی۔ صرف زیادہ کام کرنے سے ہی زیادہ آمدنی ہو سکتی تھی اور زیادہ کام کرنے کے لیے زیادہ وقت درکار تھا۔ کتنا ہی ٹائپ کا کام دھرا کا دھرا ہی رہ جاتا اور دفتر کا وقت ہو جاتا۔ کتنی ہی دکانیں بغیر گھومے رہ جاتیں اور دکانیں بند ہونے کا وقت ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب وقت کی تنگی کی وجہ سے تھا۔ اگر اس کے پاس اور وقت ہوتا تو وہ اس سے زیادہ کئی گنا زیادہ کام کر سکتا تھا آمدنی بڑھا سکتا تھا لیکن چوبیس گھنٹے ہی کا تو دن ہوتا ہے اس سے زیادہ کا تو نہیں ہوتا وہ کرے تو کیا کرے۔ ہاں البتہ ان چوبیس گھنٹوں

کو۔ ایک ایک منٹ کو ایک ایک لمحہ کو روپیے میں بدل ڈالے تو اس کی آمدنی یقیناً بڑھ سکتی ہے۔ اور یہی سوچتے ہوئے روپیہ اور وقت کا حساب لگاتے ہوئے اس نے نیند کی "کھوج" لگائی تھی۔ نیند اس کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ انسان سوتا کیوں ہے؟ وہ چوبیس گھنٹے جاگتا ہی کیوں نہیں رہتا؟ کیا نیند اس کی صحت کے لیے اتنی ضروری ہے؟ اور وہ بھی چھ۔ سات گھنٹے کی نیند؟ یہ سوالات تھے جو ان دنوں لاجپت رائے کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ اسے اچانک نیند سے شدید نفرت ہوگئی تھی۔ وہی نفرت جو ایک دشمن کے لیے ہوتی ہے۔ وہ اپنی نیند کو اپنی زندگی سے نکال دینا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ نیند ہی ہے جو اس کے روپیہ کمانے کے راستہ میں ایک زبردست رکاوٹ ہے اور اب اس نے نظریہ قائم کرلیا تھا کہ نیند محض ایک عادت ہے۔ ضرورت نہیں، وہ بھول گیا کہ بچہ پیدائش کے بعد بیس بائیس گھنٹے سوتا رہتا ہے۔ اس وقت یہ اس کی ضرورت ہوتی ہے عادت نہیں اور پھر جوں جوں عمر بڑھتی ہے نیند کم ہوتی جاتی ہے۔ یہ ضرورت کم ہوتی جاتی ہے۔ حیرت کی بات یہ نہیں کہ انسان سوتا کیوں ہے بلکہ یہ ہے کہ انسان سترہ اٹھارہ گھنٹے جاگتا کیوں ہے۔ جب کہ پیدائش کے بعد وہ بیس بائیس گھنٹے سوتا ہے۔ یعنی اب اس کی یہ قدرتی ضرورت چھ۔ سات گھنٹے ہی کیوں رہ جاتی ہے۔ لیکن جتنی بھی نیند رہ جاتی ہے وہ انسان کے لیے اس کے اعصاب کے لیے یقیناً ضروری ہوتی ہے۔ اشد ضروری اس میں شک کی گنجائش ہی کہاں ہے لیکن لاجپت رائے نے یہ نہیں سوچا اس پر تو دھن سوار تھی کہ نیند کو کس طرح کم کیا جائے اور کس طرح ختم کردیا جائے۔ کچھ دنوں کی سوچ نے آخر اسے ایک ترکیب سجھا ہی دی۔ وہ پہلے ایک ماہ میں نیند سے ایک گھنٹہ کی تخفیف کرے گا پھر دوسرے ماہ آدھا گھنٹہ اور گھٹا دے گا۔ تیسرے ماہ بھی آدھا گھنٹہ اور اس کے بعد ہر ماہ پندرہ منٹ گھٹاتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ نیند کا وقت بہت تھوڑا رہ جائے گا نہ ہونے کے برابر اور ہوسکتا ہے کہ وہ نیند پر مکمل فتح پالے۔ اسے اپنی عادت ہی تو بدلنی ہے ایک غلط عادت اور اسے یہ پلان سوچ کر بہت خوشی ہوئی صرف یہی نہیں کہ وہ نیند میں ضائع ہونے والے وقت کا فائدہ اٹھا سکے گا بلکہ یہ اس کا ایک انوکھا تجربہ ہوگا۔ انوکھا لیکن کامیاب تجربہ۔

لاجپت رائے نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی حالاں کہ اس کی عمر اس وقت چھبیس برس کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شادی سے پہلے اس کا کچھ بینک بیلنس ضرور ہونا چاہیے۔ اور اس وقت وہ اکیلا ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہ رہا تھا۔ اب جب اس نے یہ پلان بنایا تو اسے اطمینان ہوا کہ اس کی غیر شادی شدہ زندگی اس پلان کو کامیاب بنانے میں معاون ثابت ہوگی۔ اتنا اہم تجربہ اکیلے رہ کر ہی اچھی طرح کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی اچھا ہے کہ گھر کے دوسرے لوگ اس کے پاس نہیں ہیں۔ ورنہ وہ شاید اس کی ہمت کم کرنے کی کوشش کرتے۔ پلان کو عمل میں لانے کے لیے اس نے ایک ٹائم پیس خریدا۔ جس کے الارم کی مدد سے وہ وقت مقررہ پر جاگ سکے، ایک سستا سا سٹوو خریدا جس پر چائے بنا کر وہ وقت ضرورت خود کو تازہ دم کر سکے اور چوبیس گھنٹوں کا ایک نیا ٹائم ٹیبل مرتب کیا اور دوسرے دن سے اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ اپنے دشمن کو سر کرنے کی مہم شروع کر دی۔

اپنے پلان کے مطابق لاجپت رائے پہلے تین ماہ میں اپنی نیند کو چار گھنٹے تک لے آنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن یہاں پہنچ کر اس نے اپنے پلان میں تھوڑی سی تبدیلی کی۔ اس نے نیند کو مزید کچھ عرصہ کے لیے اسی حد تک رکھنا مناسب سمجھا۔ وہ اگلے دو ماہ میں بھی چار ہی گھنٹے سوتا رہا۔ وہ سنبھل سنبھل کر آہستہ آہستہ بڑھنا چاہتا تھا کہ کہیں جلد بازی اس کا سارا پلان ہی چوپٹ کر دے۔ تیسرے ماہ وہ آگے بڑھا۔ اب اسے پندرہ منٹ فی ماہ کم کرنے تھے۔ اگلے دو ماہ میں وہ نیند کو ساڑھے تین گھنٹے تک لے آیا۔ یہاں اس سے یہ حد مستقل طور پر قائم نہیں ہو پا رہی تھی۔ بیچ بیچ میں اسے چار گھنٹے اور کبھی کبھی پانچ گھنٹے کی حد تک ہٹنا پڑتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی زبردستی اسے آگے بڑھنے سے روک رہا ہو۔ تین ماہ اور گزر گئے اور وہ ساڑھے تین گھنٹے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس نے ان دنوں اپنی خوراک کا زیادہ خیال رکھا۔ ہلکی اور صحت بخش غذا کھا رہا تھا۔ کچھ اس احتیاط کی وجہ سے اور کچھ ان دنوں بینک بیلنس کے تھوڑا سا بڑھ جانے کی وجہ سے ابھی تک اس کی صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا تھا۔ اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ وہ ایک بار پھر ایک نئے عزم سے

اپنی مہم پر چلا۔ اس نے سوچا کہ پندرہ منٹ فی ماہ کی بجائے اب وہ دس منٹ فی ماہ کم کرے گا۔ آخر نیند کو زندگی بھر کے لیے ختم تو ہو ہی جانا ہے۔ لینے دو اسے کچھ عرصہ۔ وہ یوں سوچ رہا تھا جیسے کوئی حراست میں آئے ہوئے دشمن کے متعلق سوچتا ہے۔ اسے مار تو دینا ہی ہے، جی لینے دو اسے کچھ عرصہ اور۔
دس دس منٹ کم کرتے ہوئے وہ اگلے تین ماہ میں نیند کو تین گھنٹے تک لے آیا لیکن یہاں پہنچ کر اسے ایک عجیب سی تھکن محسوس ہونے لگی۔ آنکھوں کے گرد سیاہی مائل حلقے پڑ گئے جو اس کے سانولے رنگ کے باوجود نمایاں نظر آنے لگے تھے۔ لیکن وہ گھبرایا نہیں۔ دشمن کے ساتھ جنگ کے وقت کچھ زخم تو لگتے ہی ہیں۔ اور اس نے اس تھکن کی اِن سیاہ حلقوں کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اس نے جبر سے کام لیا۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ کسی دن ٹائم پیس کا الارم بج بج کر خاموش ہو جاتا اور اٹھنا چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھ نہ پاتا۔ اس دن وہ تین گھنٹے کے بجائے چار ساڑھے چار گھنٹے چارپائی پر پڑا رہتا نہ وہ پوری نیند ہوتی اور نہ مکمل جاگنے کی حالت۔ بعد میں اسے افسوس ہوتا وہ اپنے آپ کو کوستا لیکن پھر اپنے آپ کو تسلی بھی دے دیتا۔

کتنے ہی دن بیت گئے اور لاجپت رائے اپنی اس تین گھنٹے کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس بات کا اسے بہت دکھ تھا۔ ہلکی ہلکی تھکاوٹ جو وہ اکثر محسوس کرتا تھا اس کے اس دکھ کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ ایک دن اس نے ایک بھرپور وار کرنے کی سوچ لی۔ آج وہ تین گھنٹے کی بجائے صرف دو گھنٹے سوئے گا۔ صرف دو گھنٹے چاہے کچھ بھی ہو جائے صرف دو گھنٹے!

وہ ایک بجے تک جاگتا رہا۔ آنکھیں بند ہونے لگتیں تو وہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار لیتا۔ ڈیڑھ بجا اور پھر دو بج گئے اور اس نے چار بجے کا الارم لگایا اور چارپائی پر لیٹ گیا — لیکن یہ کیا —!؟ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ یہ نیند کہاں چلی گئی؟ وہ آدھا گھنٹہ لیٹا رہا لیکن نیند نہیں آئی۔ ایک گھنٹہ گزر گیا لیکن نیند کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ اس نے محسوس کیا کہ آج اچانک اس میں نیند کی زبردست خواہش بیدار ہو گئی تھی۔ لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے

جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھیں جلتی ہوئی سی لگیں اور دماغ بوجھل سا۔ جیسے کسی نے اس کے دماغ میں سیسہ بھر دیا ہو بہت سارا سیسہ! آج۔ آج۔ نہ جانے کیا بات تھی وہ سونا چاہتا تھا لیکن سو نہیں پا رہا تھا ـــــ یہ کیا تھا؟ اور وہ صبح دفتر نہ جا سکا۔

متواتر تین دن دفتر سے چھٹی لینے کے بعد ایک منٹ بھی نہ سو سکنے کے بعد کوئی کام بھی نہ کر سکنے کے بعد جب وہ شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو ڈاکٹر بولا۔ مسٹر تمہیں انسومنیا (INSOMNIA) ہو گیا ہے۔ سخت قسم کا انسومنیا۔ دماغ میں نیند کے مرکز بری طرح خراب ہو گئے ہیں اور انھیں ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ کافی عرصہ بس یوں سمجھو کہ نیند تم سے روٹھ گئی ہے۔

("کاجل اور دھواں" صفحات ۲۳۲، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۲/۵۰
حوالہ صفحات ۱۳ تا ۲۰)

شراب کہنہ

وحید

۱۸۲۹ء ——————— ۱۸۹۲ء

نام، وحیدالدین، تخلص، وحید، وطن کرار ضلع الٰہ آباد، اتر پردیش) ان کے والد مولوی امیرالدین، الٰہ آباد میں وکالت کرتے تھے، نہایت خوش اخلاق اور فیاض آدمی تھے، ہر حلقے میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

وحید کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقت اور ماحول کی رعائت سے انھوں نے اپنا بچپن نہ تو تنگی و عسرت میں گزارا اور نہ جوانی میں وہ زاہد خشک بن کر رہے۔ راگ رنگ سے شوق تھا اور عشق و عاشقی سے لگاؤ۔ انھیں راہوں سے گزر کر بالاخرہ تصوف کی منزل تک جا پہنچے۔ منکسرالمزاج اور مرنجان مرنج قسم کے لوگوں میں سے تھے نوک جھونک، تلخی ترشی، طنز و ہجو سے نہ کبھی زبان آلودہ کی اور نہ قلم۔ اسی طرح غلو خوشامد اور قصیدہ گوئی سے بھی کلام، پاک صاف نظر آتا ہے۔

شعروں کی تعداد تقریباً چوبیس ہزار ہے اندازہ ہوتا ہے کہ سن شعور کی ابتدا ہی سے یہ شغل اختیار کر لیا تھا۔ ایک ہم وطن بزرگ شیخ بشیر علی بشیر (شاگرد آتش) سے تلمذ تھا، لسان العصر سید اکبر حسین اکبر اور چند عظیم آبادی حضرات ان کے شاگرد تھے۔

وحید کا پورا کلام ایک ایسا مرقع ہے جس میں صاف ستھری اور بامحاورہ زبان میں، جستہ جستہ عہد شباب کی رنگینیاں اور معاملات، زمانے کی نیرنگیاں اور انقلابات، تصوف کے مسائل اور اکثر شعروں میں سوز و گداز اپنے کیف و اثر کے ساتھ موجود ہے، ان خصوصیتوں کے علاوہ اس دور کے مطابق طرح طرح کی تشبیہوں، تجنیسوں اور دوسری شعری صناعیوں سے بھی کلام کو جا بجا آراستہ

کر دیا ہے ۔

اپریل (۱۸۹۲ء) کا دوسرا ہفتہ تھا، روزوں کے دن اور دوپہر کا وقت، ناگاہ پڑوس میں کہیں آگ لگ گئی، ذرا دیر میں شعلے ان کے گھر تک بھی آپہنچے، یہ مردانے مکان میں سو رہے تھے، شور ہوا، آنکھ کھل گئی، فوراً زنان خانے میں پہنچے، عورتوں کو وہاں سے باہر نکال کر دوسری محفوظ جگہ پر پہنچایا۔ پھر خیال آیا ایک کوٹھری میں دیوان رکھا ہے، دوڑ کر کسی طرح اس میں داخل ہوگئے، مگر دھوئیں اور گھٹن کی وجہ سے باہر نہ نکل پائے۔ سارے گھر کی آگ بجھانے کے بعد لوگوں نے جاکر کوٹھری کا دروازہ کھولا تو دیکھا حضرت وحید زانو پر دیوان رکھے ایک مونڈھے پر قبلہ رو بیٹھے ہیں۔ قریب گئے تو پتا چلا کہ روح، جسم سے پرواز کر چکی ہے —— دیوان کے شروع میں ایک عبارت یا وصیت درج تھی، جس کے خاص جملے یہ ہیں: "...... اس پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ غلطیاں کثرت سے ہیں..... جو صاحب اسے چھپوائیں، لازم ہے کہ کسی اچھے شاعر کو دکھالیں......" نیک نفسی اور عالمانہ انکسار کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

دو دیوان مولانا کی یادگار ہیں۔ ایک مرتب دوسرا غیر مرتب۔ ان میں کسی ایک کے بھی طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

سید علی حسین زیبا کا مرتب کیا ہوا "انتخاب وحید" انجمن ترقی اردو کی طرف سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔

انتخاب

حلاوت سے، مزے سے، لطف و شیرینی سے مملو ہے
زباں اپنی، سخن اپنا، کلام اپنا، بیاں اپنا

آنکھ بھی چاہیے نظارہ وحدت کے لیے بُت کو آسان نہیں منہ سے خدا کہہ دینا
کس کی ہولت شوق نے بھڑکائی دل کی آگ
جلتا ہوا چراغ ہوں میں کس کی راہ کا

سب وہ مجنوں ہی کے دم تک تھی تری آبادی ۔۔۔ کوئی لیتا نہیں اب نام بیاباں تیرا

اے دل تجھے رونا ہے تو جی کھول کر رو لے ۔۔۔ دنیا سے نہ بڑھ کر کوئی ویرانہ ملے گا

قیس نے صحرا لیا، فرہاد نے کہسار کو ۔۔۔ بعد میرے سب علاقہ لُٹ گیا جاگیر کا

دیکھ لیتا جو تری شادابی ۔۔۔ دھوپ سے پھول نہ کھلا سکتا

اب ہیں جہاں میں اپنے یہ القاب اے وحید ۔۔۔ غربت نصیب، خاک بستر، خانماں خراب

مُسکرائے اس گھڑی بے طور آپ ۔۔۔ کچھ سوالوں کا مرے سوچا جواب

کیا پوچھتے ہو کہ جو دل پر لگی ہے چوٹ ۔۔۔ ایسا نہ درد ہوتا تھا، اکثر لگی ہے چوٹ
پہلے سے ہم کو صدمۂ دل کی خبر تھی کیا ۔۔۔ بتلایئے کسی کے کبھی کہہ کر لگی ہے چوٹ

یاد آگیا ابرو کے قریں زلفوں کا آنا ۔۔۔ آیا جو وحید ابر مہِ نو کے برابر

پر سچ یہ ہے پسِ مرگ کہاں اُلفتِ احباب ۔۔۔ آنے کو تو آئیں گے سرِ قبر کئی روز

کیا جی کو ہجرِ یار میں ترسا رہی ہے یاس ۔۔۔ دیکھو جدھر اُٹھا کے نظر چھا رہی ہے یاس

کرتے ہیں آپ کچھ گلہ کوئی کہے تو کہنے دو ۔۔۔ پھیر کے منہ کو پھر کہو "ان سے ہے مجھ کو کیا غرض"

دیکھے دلِ شیدا کا تڑپنا، کوئی کب تک ۔۔۔ ہاتھوں سے پکڑ لے نہ کلیجا، کوئی کب تک

دکھلا رہے ہو لطفِ بہار و خزاں تمھیں گل ہو تمھیں چمن ہو تمھیں، باغباں تمھیں

دل کو روندے ہوئے پانو کے تلے جاتے ہیں
اُن سے کہہ دو کوئی، آگے جو چلے جاتے ہیں

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

کہ چلے جی سے جب گزرنے کو اب نہ کہیے گا صبر کرنے کو

عشق کا نام لیا ہے تو ہو بہتر انجام اب تو بدنام نہ ہونے میں بھی رسوائی ہے

خواب سوجھی ہے مری آنکھوں کو عُمر بھر اُن کی راہ تکنے کی
رہ گیا راز دل کا سربستہ یہ کلی اب نہیں چٹکنے کی

کہا عُمر بھر ہم نے دل کا فسانہ کبھی آخری داستاں تک نہ پہنچے

دنیا کے دوراہے سے کدھر جاتے ہیں دیکھیں
لائی ہوئیں وحشت، وہ جدھر ہے بھی، نہیں بھی

آپ کے عشق نے دکھلائے دونوں کے سلوک
اب گلہ کچھ ہے نہ اپنے سے نہ بیگانے سے

خیر اِسی بات کی قسم کھاؤ
آج سے کیا کبھی نہ بولو گے!

نئی مطبوعات

نام کتاب	مصنف یا مرتب	ناشر یا ملنے کا پتہ	ضخامت	قیمت
آدمی کا مقدر (ناول)	میخائیل شولوخوف مترجم قرۃ العین حیدر	دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۵۴	/-
میرے گزشتہ روز و شب	جگن ناتھ آزاد	" " " "	۶۴	/۲۵
برگ سبز (شعری مجموعہ)	طالب چکوالی	" " " "	۲۲۴	۲/-
اشتر و سوزن (تنقید)	قاضی عبدالودود	" " " "	۱۳۶	۲/-
جواہرات (آنجہانی نہرو کے حالات)	کمال احمد صدیقی	" " " "	۲۷۲	۵/-
من سمجھاون (ادب)	ڈاکٹر سیدہ جعفر	حیدرآباد، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ		۱/-
رات گئی دن نکلا (ناول)	اودن وسٹر	دہلی، انڈین اکیڈمی		۲/-
نسلیات اور جنسی انتخاب	محشر عابدی	علی گڑھ، انجمن ترقی اردو	۱۷۲	۲/-
کرل (اخلاقی)	ترودلّور مترجم حسن سہروردی	دہلی، ساہتیہ اکیڈمی	۱۵۲	۵/-
دلہن کے راگ (نظم)	مرتبہ مظفر شاہ	" " "	۱۶	-/۳۰
عشق اور خون (ناول)	رائیڈر ہیگرڈ مترجم عابد جعفر	" خرام پبلیکیشنز	۳۶۴	۴/-
شرارت (")	جمیل انجم	" " "	۱۵۶	۳/-
اردو کے چار مزاحیہ شاعر (حالات اور کلام)	مرتبہ احمد جمال پاشا	لکھنؤ، مکتبہ دین وادب	۲۰۸	۳/۵۰
مطالعہ امیر (ادب)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	" ، نسیم بک ڈپو		۸/-
ہمارے نثر نگار (")	سید صفی مرتضیٰ	" " " "		۱/۵۰
تصوف اور اسلام (")	عبدالماجد دریابادی	" " " "		۳/-
رات کا کالا کفن (ناول)	مظہر الحق علوی	" " " "		۸/-

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

مرحوم دلّی کی ایک جھلک

مرتبہ: شمیم احمد ایم، اے
صفحات: ۱۲۸، سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ۲/۵۰
سن اشاعت
ایجنسی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی ۶

یادش بخیر دہلیٔ مرحوم کا جب کوئی ذکر کرتا ہے تو دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ ایکسا بھرا پرا شہر تھا اور کیسی ستھری تہذیب تھی یہاں کی! یہ تہذیب صدیوں میں بنی تھی۔ مسلمان بادشاہوں نے اسے سنوارا تھا اور اولیاء اللہ کا اس پر سایہ تھا۔ جادو نگار ادیبوں نے اس میں چار چاند لگائے تھے اور مرصع کار شاعروں نے اسے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ اس شہر کے در و دیوار سے لطافت برستی تھی اور اس کے گلی کوچوں سے شہر نگاراں عبارت تھا ؎

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

زمانے کی نظر سے کھا گئی ۱۸۵۷ء میں جسے عرفِ عام میں غدر کہا جاتا ہے مگر جو دراصل پہلی جنگ آزادی تھی دلی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ فرنگیوں نے فتح کی سرمستی میں آخری مغل تاجدار کو قید کر کے رنگون بھیج دیا اور اس کی راجدھانی میں گدھوں کے ہل پھروا دیے۔ دلی میں قتل عام ہوا اور دلی والے دربدر اور خاک بسر نانِ شبینہ کو محتاج ہوئے۔ جہاں جس کے سینگ سمائے نکل گیا۔ شہر میں ہو کا عالم ہو گیا۔

مگر اس شہر کی بھی عجب ریت ہے سدا اُجڑتا اور بستا رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد

جب دوبارہ آباد ہوا تو یہاں پھر اگلی سی رونق ہوگئی بلکہ کچھ آگے سے بھی سوا۔ کہتے ہیں کہ سونا آگ میں تپ کر کندن بن جاتا ہے۔ دلّی بھی آگ میں تپ کر اور خون کی آبداری پاکر نکھر گئی۔ نیند کے ماتے مسلمانوں کو سرسید نے جھنجھوڑ کر اُٹھایا اور ان کے رفقا نے مسلمانوں کو زور دار بنایا۔ دلّی ازسرِنو تہذیب و ثقافت کا مرکز بنی اور کچھ کم ایک صدی تک اس کا سکّہ پورے ہندوستان میں چلتا رہا۔ اور پھر اس کی پرانی روایت نے زور مارا اور تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ ۱۹۴۷ء میں پھر یہاں نفاق کی آگ بھڑکی اور ایسی بھڑکی کہ سارا ہندوستان اس کی لپیٹ میں آگیا۔ دلّی کو ایک بار پھر غسلِ خونی دیا گیا اور دلّی کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ترکِ وطن کر کے سرحد کے اس پار چلا گیا۔ جب شورش فرو ہوگئی اور شہر میں امن جمی ہوئی تو باہر والوں نے اس شہر کی رونق اور آبادی کو کئی گنا بڑھا دیا۔ پرانے شہر میں کھوے سے کھوا چھلنے لگا۔ نئی نئی بستیاں آباد ہوئیں۔ پندرہ پندرہ اور بیس بیس میل تک دلّی پھیل گئی۔ اجڑنے اور دوبارہ رونق کے ساتھ آباد ہونے کی روایت پوری ہوئی۔ دلّی پہلے بھی ہندوستان کا دل تھی اور اب بھی ہندوستان کا دل ہے زندگی اور زندہ دلی سے دھڑکتا ہوا دل۔ مگر ۱۹۴۷ء سے پہلے کی دلّی اب کہاں؟ ؎

جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دہلی
مگر جو غور سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

وہ دلّی اب خواب و خیال ہوگئی۔ اس کی جھلک اگر دیکھنی ہو تو کتابوں اور رسالوں میں دیکھیے۔ ان کتابوں اور رسالوں میں جو اب کم یاب اور نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمارے اس دیدہ ریزی کے کام کا بیڑا دلّی یونی ورسٹی کے چند جی دار دہلوی طلبا نے اٹھایا اور دہلیٔ مرحوم پر دلّی والوں کے لکھے ہوئے مضامین کے مجموعے شائع کرنے شروع کیے۔ اس سلسلے کی اب تک دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں "جولی سے دلّی تک" جس کے مصنف سید ضمیر حسن دہلوی ہیں۔ دوسری کتاب کا نام "مرحوم دلّی کی ایک جھلک" ہے جس کی تیاری میں اس کتاب کے مرتب شمیم صاحب کو دلّی کی لائبریریوں اور کتب خانوں کی خاک چھاننی اور خاک پھانکنی پڑی ہے۔

کیوں کہ واقعی دلی کی لائبریریاں گردوغبار سے اٹی پڑی ہیں اور ان کے اہلِ اختیار انھیں ہاتھ تک لگاتے ڈرتے ہیں۔ مگر شمیم صاحب نے بڑی ہمت واستقامت سے اس خاک میں سے موتی نکال لیے ہیں۔

افسوس ہے کہ باوجود تلاش و تجسس کے انھیں اس مجموعے کے لیے علامہ راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ اور سید وزیر حسن کے بعض ناگزیر مضامین دستیاب نہ ہوسکے۔ اس مجموعے میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو بس انہی بزرگانِ ادب کے مضامین کی۔ امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں اس کمی کو پورا کیا جا سکے گا۔

(شاہد احمد دہلوی)

مغرب کے عظیم فلسفی

(سنِ اشاعت ۱۹۶۴ء)

از: عبدالرؤف ملک

صفحات: ۴۷۸، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

قیمت: ۵/۔

ملنے کا پتا: پیپلس پبلشنگ ہاؤس، المنار مارکٹ، چوک انارکلی لاہور (پاکستان)

فلسفہ اور فلسفیوں کے نام تو ہماری زبانوں پر اکثر رہتے ہیں مگر دراصل یہ دونوں ہیں کیا؟ اس سے ہماری واقفیت محدود اور ان کو حاصل کرنے کے ذرائع محدود تر ہیں۔ خیر سے اس کمی کو محسوس کرنے والے نکل آئے اور آج ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب آگئی ہے جس سے ہم کو مشہور فلسفیوں اور ان کے مخصوص فلسفے کے بارے ضروری اور کارآمد باتوں کا علم ہو سکتا ہے۔

عبدالروف ملک صاحب نے اپنی اس کتاب کو مغرب کے عظیم فلسفیوں تک محدود رکھا ہے، اس میں شک نہیں کہ فلسفے کا نام باقی اور بلند رکھنے والے زیادہ تر مغرب کے ہی کے لوگ ہیں۔ لیکن اگر اس میں چند (ناقابلِ فراموش) مشرقی فلاسفہ کو بھی شامل کر لیے جاتے تو یہی کتاب "دنیا کے عظیم فلسفی" کے نام سے موسوم ہو جاتی۔ اس کی حیثیت و اہمیت میں کوئی فرق نہ آتا بلکہ اس کی وسعت و گیرائی میں اضافہ ہو جاتا۔ ہونے پانچ سو صفحات کے اندر سوا دو ہزار سال تک کی مدت کا احاطہ کیے

ہوئے سترہ فلسفیوں کے حالات وکوائف ــــــان کے فلسفے کے محرکات اور نوعیت، بنیادی اصول اور امتیازی خصوصیات غرض ان سب کے بارے میں کام کی باتیں، دل چسپ انداز میں قلم بند کر دی گئی ہیں۔

افلاطون سے لے کر برٹرنڈرسل تک، کئی فلاسفر ایسے ہیں جن کی سیرت وشخصیت اور ان کے فلسفے پر بڑے بڑے لکھنے والوں کا توازن واعتدال برقرار نہیں رہ سکا ہے۔ بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ملک صاحب کے خیالات اس معاملے میں معقول اور ان کا قلم محتاط ہے۔ جذباتیت اور جانب داری سے دور رہ کر انھوں نے ہر فلسفی کو اس کے اصل رنگ روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ارسطو، ابن رشد اور کارل مارکس پر لکھتے وقت انھوں نے ادبی دیانت داری اور حقیقت نمائی کے نمایاں ثبوت دیے ہیں۔

فاضل مؤلف نے "پیش لفظ" میں آسان زبان اور عام فہم انداز بیان پر بھی کچھ اظہار خیال فرمایا ہے۔ ان کا نظریہ سو فی صدی درست اور ہر ایک کے لیے قابل تقلید، مگر اسی کتاب میں ان کے اپنے قلم کے لکھے ہوئے متعدد جملے، فقرے اور الفاظ اس 'معیار' پر پورے نہیں اترتے۔

مغربی زبانوں کی اصطلاحوں کے مشکل اور غیر مروج ترجموں کے بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ رومن حروف میں بجنسہٖ انھیں اصطلاحوں کو لکھ کر ان کی تشریح کر دی جاتی ــــ اسی طرح انگریزی کے بہت سے فقروں کے محض لفظی ترجمے سے کیا عبارت کی روانی اور مفہوم کی ادائیگی میں نقص نہیں واقع ہو جاتا ہے۔؟؟

"چھاتی" کے بجائے 'سینہ' زیادہ رواں، سبک اور فصیح لفظ ہے ــــ

تعجب ہوتا ہے کہ ماخذ اور حوالے کی کتابوں کا کہیں کوئی ذکر نہیں اور اس قسم کی کتابوں میں تو "اشاریہ" بھی ہونا چاہیے۔

یہ معمولی اور جزوی باتیں ہیں۔ ان کی وجہ سے کتاب کی بہت سی خوبیوں، اس کی افادیت اور اہمیت میں کوئی فرق نہیں واقع ہوتا ہے۔

"مغرب کے عظیم فلسفی"، بہرنوع ایک علمی کاوش ہے، اکثر حیثیتوں سے ستائش کی مستحق۔

اس کے مطالعے سے ادبی ذوق کو تسکین اور مسرت ہوتی ہے اُمید ہے کہ اُردو داں طبقے میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ نیز خوش مذاق اور ادب نواز حلقے کی طرف سے اس کے لکھنے والے کی کما حقہٗ ہمت افزائی۔

(رشید نعمانی)

وطن میں اجنبی

شاعر: جگن ناتھ آزاد
صفحات: ۲۲۴، سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ۳/۵۰
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۲۵
رسن اشاعت

جگن ناتھ آزاد اُردو کے اُن جدید شاعروں میں جنھوں نے مسائل حیات و دل سے اپنی شاعری کو ایک ایسا تابناک پہلو ہے۔ جس کی دل کشی اور اہمیت اردو ادب و شاعری میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان کی غزلیں ہوں یا نظمیں سب میں ایک تفکرانہ اور فلسفیانہ گیرائی نظر آتی ہے۔ سرسری طور پر دلچسپی رکھنے والے اور سستی جذباتیت کی تسکین کی تلاش کرنے والے شاید آزاد کی شاعری سے بہت زیادہ لطف اندوز نہ ہو سکیں۔ لیکن وہ لوگ جو شاعر کے کلام سے اس سے زیادہ توقع رکھتے ہیں اور جذباتی تسکین اور وقتی لطف اندوزی کے علاوہ بھی کچھ چاہتے ہیں ان کے لیے آزاد کی شاعری میں بہت کچھ ہے۔

آزاد اقبالؔ سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان کا کلام دیکھ کر قدم قدم پر اس تاثر کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بات کسی بھی شکل میں آزاد کی اہمیت یا انفرادیت کو مجروح نہیں کرتی۔ انھوں نے اقبال کے فلسفیانہ انداز سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ افکار پر نظر مجموعہ کلام "وطن میں اجنبی" ایک محب وطن کے دھڑکتے اور تڑپتے ہوئے دل کی پکار ہے۔ جسے پڑھ کر صحیح معنوں میں اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہ بات بالکل درست ہے کہ

حبِ وطن نہ ہو تو عبادت حرام ہے

لیکن آزاد کے نزدیک حب وطن ہی سب سے بڑی عبادت ہے ان کے

اس مجموعے کا ایک لفظ سرزمین وطن سے اس محبت اور عقیدت کی نشاندہی کرتا ہے۔ بعض نظموں کو تو پڑھ کر بلا مبالغہ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اس مجموعے کی نظمیں ایک عجیب حالت کا اظہار کرتی ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم اور اس کے ردعمل سے جو حالات پیدا ہوئے وہ بڑے دردناک اور ہیبت ناک تھے۔ انھیں دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ انسانیت اور محبت نام کی کوئی چیز شاید نہیں رہ گئی ہے۔ لیکن یہ حالات کچھ معنون اور خود غرض دیوانوں کے پیدا کردہ تھے۔ جس پر ایک بار پھر محبت نے فتح پائی۔ آزادی ان نظموں میں اسی محبت کا احساس کارفرما نظر آتا ہے۔

اس مجموعے کی تمام نظموں میں ایک ایسا تسلسل نظر آتا ہے جس کے پیش نظر اسے ایک مسلسل نظم بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ مجموعہ اردو نظموں کی تاریخ میں ایک اضافہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ عوام میں بھی مقبول ہوگا۔ (شارب ردولوی)

⁂

ہم سب اور وہ

از: دیانند ورما
صفحات: ۱۲۸، سائز $\frac{20\times30}{16}$
قیمت: ۲/۵۰
ناشر: پنجابی پستک بھنڈار، دریبہ کلاں دہلی ۶

"ہم سب اور وہ" مختلف سماجی برائیوں اور جرائم پیشہ ذہنیتوں کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ انسانی محرومیوں اور کردار کی خامیوں کا بنیادی سبب بسا اوقات کچھ نفسیاتی کمزوریاں ہوتی ہیں، شخصیت کے نشوونما میں جو کجی رہ جاتی ہے وہ نہ صرف فرد بلکہ پورے معاشرے پر خطرناک حد تک اثرانداز ہو سکتی ہے۔ چوری، فریب دہی، تعصب اور بے ایمانی سب کی تہہ میں یہی نفسیاتی خامیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں اسی قسم کے نفسیاتی مطالعے پیش کیے ہیں۔ کچھ مضامین مثلاً 'جی ہاں بھیک مانگتا ہوں' اور 'مذہب اور ذہنیت' مصنف کے گہرے مشاہدے اور ذہنی رسائی کا پتہ دیتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں بیان کی پیچیدگیاں موضوع کی وضاحت میں مانع آئی ہیں۔ تاہم اس کتاب کے مضامین انسان

کے آئینہ خانۂ ہستی کے بعض گوشوں کی جھلکیاں" ضرور کہے جا سکتے ہیں اور اسی حیثیت سے اس کے مطالعہ میں کوئی حرج نہیں۔ بہتر ہوتا اگر مصنف نے ان تمام عیوب کی اصلاح اور شخصیت کے صحت مند نشوونما سے بھی بحث کی ہوتی۔ اُس صورت میں کتاب قاری کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتی۔

(سید ضمیر حسن دہلوی)

خطِ تقدیر

از: مولوی کریم الدین
صفحات: ۱۴۰، سائز $\frac{20\times30}{16}$
قیمت: ۳/.
پبلشر: دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

خطِ تقدیر کو اس کے مرتب ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب ریڈر شعبۂ اُردو گورکھپور یونی ورسٹی نے اس دعوے کے ساتھ مرتب کر کے شائع کرایا ہے کہ یہ مختصر سی کتاب اردو کا سب سے پہلا ناول ہے۔

اس کتاب کا جنم انیسویں صدی ہی میں ہوا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں انگریز تاجر گروہ ایک وسیع اور مضبوط تنظیم میں بدل چکا تھا اور یورپی تہذیب انگریزوں کی معرفت ہندوستان میں داخل ہو رہی تھی۔ ہند کے ادب پر بھی خاص طور سے انگریزی ادب کے اثرات ظاہر ہو چلے تھے لیکن اردو ابھی تک اس سلسلے میں بہت پیچھے تھی۔ اگرچہ شمالی ہند میں خصوصاً انگریز حکومت نے اردو کو اپنی دفتری اور سرکاری زبان مقرر کیا۔ اردو میں اس زمانے میں داستان سرائی کا طوطی بولتا تھا۔ خطِ تقدیر کو ہم اس اسلوب اور طرز سے الگ کر کے دیکھیں تو اس کا الگ سے کوئی کردار دکھائی نہیں دیتا۔ وہی مقفع عبارت، وہی تمثیلی پلاٹ اور زندگی سے دور کی باتیں، وہی زبان کا اور بیان کا داستانی انداز۔ ممکن ہے اس کے اختصار کو دیکھتے ہوئے مرتب نے اس کتاب کو ناول قرار دیا ہو۔

اپنی جگہ یہ کتاب آج بھی دلچسپی رکھتی ہے لیکن موڈرن ناول کے رسیا کے لیے شاید

رہنا بھی ایک کام ہے۔ اس سے نئی پود اپنے پرانے سرمائے سے شناسا تو ہوتی ہے اگرچہ وسیع پیمانے پر نہیں۔

(تاجور سامری)

تین نئی کتابیں

آدمی کا مقدر

مصنف: میخائیل شولوخوف

مترجمہ: قرۃ العین حیدر

میخائیل شولوخوف اس صدی کے عظیم ترین مصنفین میں شمار کیے جاتے ہیں ان کے ناول "ڈان بہتا رہا" اور "کنوارے کھیت" عالم گیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ "آدمی کا مقدر" جس میں انسانی جرأت کی تعاشی حیرت انگیز سادگی کے ساتھ کی گئی ہے، مصنف کی دوسری مشہور کہانیوں کی طرح عمدہ روایات کی حامل ہے۔

صفحات ۵۴ سائز $\frac{20\times30}{16}$ قیمت -/۱

جامعہ کی کہانی

مصنف: عبدالغفار مدھولی

۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی کاموں کی روئداد اور اس کے اتار چڑھاؤ کو ایک کہانی کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ کتاب نہ صرف 'جامعہ' سے متعارف کراتی ہے۔ بلکہ والدین اور استادوں کے لیے بھی شمع راہ ثابت ہو گی۔

صفحات ۲۹۶، سائز $\frac{20\times30}{16}$

قیمت -/۶

میرے گزشتہ روز و شب از: جگن ناتھ آزاد

یہ ادبی دستاویز ہندوستان کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد کی بیتی یادوں کی تصویر ہے۔ ایک ایسی یادیں جن کی ادبی حیثیت و افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ صفحات: ۹۴، ۳ تصاویر، سائز $\frac{20\times30}{16}$، قیمت ۱/۲۵

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

پیامِ تعلیم کے پرانے قدردان

پچھلے مہینے ڈاکٹر مجیب کا خط آپ پڑھ چکے ہیں۔ عزیزہ طلعت اسلوب نے بھی ہمیں اسی طرح کا خط لکھا ہے:

یہ ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء کی بات ہے جب میرے چچا (محمد عاقل صاحب) مجھے اپنے ساتھ جامعہ لے گئے...... اس زمانے میں پیامِ تعلیم جاری تھا۔ ذوق و شوق سے ہم بچے اسے پڑھا کرتے تھے پھر وہ بند ہوگیا۔ اب جبکہ میرے بچیاں ہوئیں اور اس لائق کہ ان کو بھی پیامِ تعلیم جیسے رسالے کی ضرورت ہوتی تو اکثر دعا کیا کرتی کہ یا اللہ پھر سے یہ جاری ہو جائے۔ ایک جگہ ایک اشتہار دیکھا کہ پیامِ تعلیم کا پہلا شمارہ نکل آیا ہے بے حد مسرت ہوئی۔ فوراً نمونہ منگوایا اور بچوں کے لیے جاری کرالیا۔

(باقی صـ۲۲ کی نئی مطبوعات)

نام کتاب	مصنف یا مرتب	ناشر یا ملنے کا پتہ	ضخامت	قیمت
ندائے روح (ناول)	مظہر الحق علوی	لکھنؤ، نسیم بک ڈپو		۹/-
طلسمی آئینہ (〃)	〃 〃	〃 〃 〃 ، 〃		۳/-
فرنگی جانباز (〃)	ایم، جے عالم	〃 〃 〃 ، 〃		۴/-
فرنگی خونخوار (〃)	〃 〃 〃	〃 〃 〃 ، 〃		۵/۵۰
ڈائن پیار کی (〃)	〃 〃 〃	〃 〃 〃 ، 〃		۴/-
شیلا (〃)	سید سخی حسن	〃 〃 〃 ، 〃		۴/۵۰

زیرِ طبع

فن کی جانچ (ادب)　ڈاکٹر سیدہ جعفر　حیدرآباد، نیشنل فائن پریس

ادبی خبریں

یوپی میں اُردو کے لیے سہولتیں

۱۴ر جولائی۔ انفارمیشن آفیسر رامپور نے ایک پریس نوٹ میں کہا ہے کہ ان اضلاع میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۵ فی صد ہے۔ قوانین مائی لاز اور اہم مسئلے اردو زبان میں بھی شائع کیے جائیں گے۔ پریس نوٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ میرٹھ، لکھنؤ اور پبلی بھیت کو بھی پندرہ فی صد اردو بولنے والے اضلاع میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس سے پیشتر یہ رعایت رامپور، بجنور بریلی، مراد آباد، سہارنپور اور مظفر نگر کے اضلاع کو مل چکی ہیں۔

آٹھ کروڑ جیبی کتابیں

جیبی کتابوں کا مشہور جرمن ادارہ روولٹ آٹھ کروڑ کی تعداد میں گیارہ سو سے زیادہ جیبی کتابیں شائع کر چکا ہے۔ اب تک ان تمام سلسلوں میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی مجموعی تعداد ۷.۹۳ کروڑ تک پہنچتی ہے۔ تنہا ادبی ناولوں کے سلسلے میں اب تک کل ۶۳۶ تصنیفات شائع ہو چکی ہیں جس کی مجموعی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ بنتی ہے۔ مصور سوانح عمریوں کے سلسلے میں اب تک ۲۹ لاکھ کی تعداد میں کُل ایک سو ایک تصنیفات بھی شائع کر چکے ہیں جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک نہایت عمدہ سیرت بھی جو اسلامی ماخذوں پر مبنی ہے شائع کی گئی ہے۔

حلقۂ احباب آرہ (بہار) کا مشاعرہ

۳ر جولائی ۶۵ء کو حلقۂ احباب آرہ کا ایک گشتی ماہانہ مشاعرہ جناب مہجور شمسی صاحب کی صدارت میں جناب حبیب اللہ صاحب سب ڈویژنل افسر آرہ کے مکان پر منعقد ہوا جس کا افتتاح حکومت بہار کی وزیر اطلاعات وتعلقات عامہ شریمتی سمترا دیوی نے فرمایا۔ مشاعرہ میں مقامی وبیرونی شعرا نے شرکت کی۔ (معتمد حلقۂ احباب)

تعلیم پر کتابیں

اُردو اِملا کا آسان طریقہ	عبد الغفار مدہولی	-/۷۵
اصولِ تعلیم	خواجہ غلام السیدین	۶/-
بنیادی اُستاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	۴/۲۵
تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	۳/۷۵
تعلیم دینے کا فن	گلبرٹ ہگٹ	۳/۵۰
چند پروجکٹ	عبدالغفار مدہولی	۲/۵۰
کھیل کے ذریعے تعلیم اوّل	" "	۲/-
" " " دوم	" "	۱/-
ہم کیسے پڑھائیں	ڈاکٹر سلامت اللہ	۳/۵۰
مدرسہ ابتدائی کی کہانی	عبدالغفار مدہولی	۲/-
نظریۂ تعلیم اوّل دوم	قاضی عبدالمجید	۶/۱۲
زندگی کا رُخ	سعید انصاری	۲/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

Regd No. D. 58 August, 1965

Kitab Numa
JAMIANAGAR. NEW DELHI-25.

ماہنامہ

کتاب نُما

نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دھلی

دوسری شام

پروفیسر محمد مجیب

فن کار کی روح فن ہے، اچھا فن کار وہ ہے جو فن کی راہ میں اپنی ساری دلچسپیاں قربان کردے۔ آج کی دنیا میں فن کی نام نہاد قدر کرنے والوں کی کمی نہیں، اونچی سوسائٹی والوں کا کچھ ایسا ہی چلن ہے لیکن سچا فنکار ایسی قدردانیوں کو خاطر میں نہیں لاتا وہ فن کے لئے جیتا اور مرتا ہے۔ یہ ڈراما اسی طرح کی کیفیتیں رکھتا ہے۔ چودھری کا کردار اور اس کی دوسری بیوی شاما کی شخصیت کے سہارے ڈراما نویس نے بڑی دلچسپ کیفیات پیدا کی ہیں۔

یہ ڈراما مکالموں کے لحاظ سے بھی جاندار ہے، لطیف مزاح کی چاشنی بھی ہے اور SUSPENSE کی دل دھڑکانے والی کیفیات بھی۔ قیمت:- ۱۲ر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

مجلسِ ادارت
غلام ربانی تاباں

ماہنامہ کتاب نما
نئی دہلی

مدیر
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۶ | ستمبر ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۹

اشاریہ

مکتبہ جامعہ کے پریس کو قائم ہوئے اب تقریباً ایک سال ہو رہا ہے۔ پریس قائم ہو جانے کے بعد سے ہماری کتابوں کی طباعت کا معیار پہلے سے اور بھی اچھا ہو گیا ہے۔ پریس لگ جانے کے بعد سے ہم نے نہ صرف اپنی بہت سی نئی کتابیں فوٹو آفسٹ پر شائع کیں بلکہ کئی پرانی کتابوں کے نئے اڈیشن بھی بجائے لیتھو کے آفسٹ پر ہی چھاپے۔ ہماری ہمیشہ یہی کوشش ہے کہ ہم ہمیشہ اچھی اور عمدہ کتابیں پیش کرتے رہیں۔ اسی سلسلے میں ہمیں یہ بتاتے ہوئے نہایت خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے جنرل منیجر جناب غلام ربانی صاحب تاباں ۱۴ ستمبر ۶۵ء کو، مغربی جرمنی کی اس سوسائٹی کی دعوت پر جو ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کو طباعت کے سلسلے میں جدید معلومات بہم پہنچاتی ہے، تین مہینے کے لیے مغربی جرمنی تشریف لے جا رہے ہیں۔ تاباں صاحب وہاں کے مشہور اشاعت گھروں اور پریسوں میں جا کر اپنی مفید معلومات حاصل فرمائیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کے بعد مکتبہ جامعہ کی کتابوں کا معیار اور بھی بلند ہو جائے گا۔ ہم تاباں صاحب کے اس مبارک سفر کی کامیابی کے لیے دعا کرتے ہیں۔

اگست کے تیسرے ہفتے میں بمبئی میونسپل کارپوریشن کی طرف سے اردو کتابوں کی ایک نمائش کا انعقاد کیا گیا۔ مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب نے نمائش کے افتتاحی جلسے میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ اس موقع پر مجیب صاحب نے جو تقریر کی وہ ادبی اور تعلیمی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔ نمائش کی تیاری اور تکمیل میں مکتبہ جامعہ کا [illegible]

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

اُردو ادب میں اِسّے

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں سیاسی و سماجی زبوں حالی نے شمالی ہند میں اردو ادب کے استقبال کے لیے ساز گار حالات پیدا کر دیئے تھے۔ دلّی نے غزل کے پیمانے میں شرابِ معرفت پیش کی تو شمالی ہند کے پراگندہ خاطروں اور رنجات کے طالبوں نے اپنا غم غلط کرنے کے لیے اسے اٹھالیا ـــــ دوسرے اُردو زبان گھر کی لونڈی تو تھی ہی اس نے غزل کے روپ میں خاص و عام کے لیے تفریحِ طبع کا سامان بھی پیدا کر دیا۔ اُردو کی مقبولیت کا تیسرا سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ناصر علی بیدل وغیرہ اساتذہ فن کے بعد فارسی میں ہر کس و ناکس کا چرخ چلانا دشوار تھا، نیز فارسی نظم نے ذہن و فکر کو ایک حد تک تھکا بھی دیا تھا۔ ان حالات میں اُردو غزل کی جدت طرازی نے خاص و عام کے دل موہ لیے اور اُردو نظم کا بول بالا ہوا۔ غرض بڑی سرعت کے ساتھ اردو غزل نے قبول عام کا تمغہ حاصل کر لیا۔ چوں کہ شمالی ہند ایرانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا اور وہاں فارسی زبان و ادب کا زیادہ چلن تھا۔ لہٰذا اردو غزل نے فارسی کے زیرِ اثر چولا بدلنا شروع کیا اس صدی کے نصف اول میں اُردو نظم اور خصوصاً غزل ہی مرکزِ توجہ رہی لیکن ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ اُردو نثر بھی میدان میں آگئی اور یہ بھی فارسی کے سانچے میں ڈھالی جانے لگی۔ اس طرز کے کارنامے منظرِ عام پر آنا شروع ہو گئے تھے لیکن ابھی نثر ڈھرّے پر نہیں آئی تھی کہ انیسویں صدی کے آغاز میں اہلِ مغرب نے اس پر ڈورے ڈالے، اہلِ مغرب کا یہ اظہارِ محبت اُردو کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو ادب کے لیے نیک شگون تھا یہ وہ مرکز تھا جہاں فارسی طرز سے مختلف نئے ڈھنگ پر اُردو نثر کی تربیت ہونے لگی اس زمانے

سے اردو ادب دو قافلوں میں بٹ گیا۔ نظم کا قافلہ فارسی کی اور نثر کا قافلہ مغرب کی سرنگی میں منزلیں طے کرنے لگا۔ کالج کے متعدد ادیبوں کی سعی و کوشش سے تقریباً پچاس نثری کارنامے منظر عام پر آگئے۔ اس کا بیشتر حصہ افسانوی ادب پر مشتمل ہے، مگر زبان و انداز بیان کے اعتبار سے یہ کارنامے اردو نثر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں پہ ۱۸۴۳ء میں کالج بند ہوگیا، اور سلسلہ تصانیف بھی مسدود لیکن اس کا رائج کردہ طرز نگارش قائم رہا۔ کالج کی یہ تحریک رنگ لائی۔ نثر کے بارے میں اس سے ایک ذہنی تصادم دو بڑے نثری کارناموں کی شکل میں رونما ہوا۔ سید انشا اس زمانے کے جینی یس (Genius) تھے، انھوں نے رانی کیتکی کا ایک قصہ نکھری ہندی میں لکھ کر ایک نئے طرز نگارش کا نمونہ پیش کیا لیکن ایک تو یہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی، دوسرے فارسی سے متاثر ذہنوں نے اسے قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ ۱۸۲۴ء (۱۲۴۰ھ) میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب کی صورت میں دوسرا نمونہ پیش کیا اگرچہ اس طرز کے دل دادہ ہر جگہ موجود تھے لیکن یہ طرز اہل لکھنؤ کے پسند خاطر رہا۔ خصوصاً بیگمات اودھ نے شاہی حلقوں میں اسے مدت تک زندہ رکھا، چوں کہ دونوں نمونوں میں افراط و تفریط تھی اس لیے کالج کے فطری انداز بیان کے مقابلے میں کسی کی ایک نہ چلی بلکہ کالج کی تحریک کو اور تقویت مل گئی۔

فورٹ ولیم کالج ۱۸۲۵ء میں مدرسہ غازی الدین میں حلول کر کے دلی کالج کے روپ [illegible] ہوا اس وقت اس کی خدمت کی نوعیت مختلف تھی۔ فورٹ ولیم کالج کا مقصد [illegible] ملازموں اور نوواردوں کو اپنے سیاسی مقصد کے لیے ہندوستانی زبان سے واقف کرانا تھا، اس کے برعکس دلی کالج کا مقصد ہندوستانیوں کو انگریزی زبان و ادب سکھلا کر اپنا ہم خیال بنانا تھا اس کالج میں ایک طرف اہلِ ہند سائنس کے کرشمے دیکھ کر متحیر ہوئے دوسری طرف انگریزی زبان و ادب سے بھی متاثر ہوتے گئے۔ اسی تحیر و تاثر کی وجہ سے اہلِ ہند کے دلوں میں انگریزوں کے مذہب و معاشرت و سیاست نے گھر کر لیا۔ اس کالج سے صد ہا طلبا نے فیض پایا۔ ان میں ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے [illegible] اردو ادب کی [illegible] میں نمایاں حصہ لیا۔ انھیں روشن خیال [illegible] [illegible] انگریزی ادب کے داستان، ناول اور مقالہ نگاری [illegible]

گرایاں اصناف میں سے "ایسے" اور مقالہ نگاری پر اظہار خیال کرنے سے پہلے انگریزی ادب میں اس صنف کا مفہوم، اس کی تعریف اور کسی قدر اس کے ارتقائی مدارج بتادینا ضروری ہے۔ تاکہ ہمیں اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ اُردو نے اس سے کس حد تک استفادہ کیا ہے۔

ایسے[1] کی صنف فرانسیسی ذہن وفکر کی اپج ہے جو انگریزی میں اسی سے منتقل ہو کر آئی ہے۔ فرانسیسی ادب کا لفظ اسائی (Essai) انگریزی میں (Essay) بن گیا اس لفظ کے لغوی معنی کوشش کے ہیں۔ فرانسیسی ادب میں اس کے وجود میں آنے کا واقعہ دلچسپ ہے۔ ایک فرانسیسی ادیب مان ٹین Montaigne نے ۱۵۷۱ء میں جب اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے اس دنیا کی ہما ہمی سے کنارہ کش ہو گیا تو اس نے اپنے لمحات فرصت کا یہ مصرف تجویز کیا کہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں خود اپنی عقل وفراست اور ذہن کی رسائی کا امتحان لینے کے خیال سے مختلف عنوانوں پر بغیر مربوط خیالوں کو قلم برداشتہ صفحۂ قرطاس پر جمع کرنے لگا، اس آزمائش کو اس نے کوشش (Essai) نام دیا۔ مان ٹین کے ان مضامین میں نہ کوئی علمی ادبی نظریہ یا دعویٰ ہے اور نہ ہی یہ کوئی منظم و مرتب مضامین ہیں ان میں اس نے مختلف موضوعات پر ہلکے فلسفیانہ رنگ میں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں جن سے کوئی نہ کوئی درس اخلاق ملتا ہے۔ اور انداز بیان کے لحاظ سے بے ساختہ پن اس کا وصف خاص ہے۔ جب مان ٹین کے یہ ایسیز منظر عام پر آئے تو ارباب ذوق نے انھیں بہ نظر استحسان دیکھا۔ اس طرح ایک ادیب کے قلم سے اتفاقی طور پر "ایسے" نے جنم لیا جو آگے چل کر ایک اہم صنف قرار پایا۔

مان ٹین کے ایسیز فرانس سے انگلینڈ پہنچے۔ مان ٹین کے انتقال کے ستّرہ سال بعد انگلینڈ کے ایک عالم وادیب اور مانے ہوئے فلسفی بیکن (Bacon) نے اس طرز کو اپنایا۔ بیکن غیر معمولی لیاقت کا مالک تھا۔ بیکن نے ایسیز لکھے اور خوب لکھے۔ یہ ایک حد تک مقبول بھی ہوئے۔ اس نے ۱۵۹۷ء سے ۱۶۲۵ء تک ۱۵۸ ایسیز سپرد قلم کیے۔ بیکن نے اپنے ایسیز کو افکار پریشاں Dispersed Meditation کہا ہے۔

[1] "ایسے" کو اردو میں عام طور پر مقالہ کہا جاتا ہے ہم اس مضمون میں لفظ "ایسے" ہی استعمال کریں گے۔

لیکن اس کے باوجود یہ بڑی حد تک مربوط مضامین ہیں اس کے اسیز میں ایک حد تک مان ٹین کے اسیز کی روح یعنی درس اخلاق وتنقید حیات ضرور ملتی ہے، لیکن اس کے اسیز پر اس کے فلسفیانہ خیالات کا گاڑھا پن چھا گیا ہے۔ انگریزی ادب میں مان ٹین اور بیکن کا مقابلہ وموازنہ کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ مان ٹین نے اپنے اسیز انتش دان کے سامنے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے لکھے ہیں۔ اور بیکن نے بڑے غور وخوض کے بعد اپنے خیالات کو مرتب کرکے جیسے دفتر میں بیٹھ کر باقاعدگی سے لکھے ہیں۔ بیکن کے اسیز اپنے انداز بیان اور اخلاق آموز ہونے کی وجہ سے خاصے مقبول ہوتے تاہم اِسّے کو اس صدی میں مقبول بنانے کا سہرا اس دور کے دو دوسرے اسّے نگار ولیم کارن والس ۱۶۶۰ء اور ابراہام کاولی ۱۶۶۸ء کے سر ہے۔ چوں کہ ان کے اسیز میں مان ٹین کے اسیز کی روح بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور یہ عقل سے زیادہ دل کو متاثر کرتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی انگریزی اِسّے نگاری کے اوج کمال کا زمانہ تھا۔ اس مقبولیت کے کئی اسباب تھے۔ اس صدی کے آغاز میں اہل انگلینڈ میں سیاسی، سماجی بیداری رونما ہوئی۔ اس دور عقلیت میں مختلف مسائل حیات وکائنات اور سماج وسیاست پر غور وخوض کیا جانے لگا تھا اس موقع پر پہلے ٹیٹلر اور پھر اسپکٹیٹر اخبار کا اجرا عمل میں آیا۔ ان اخباروں کا خاص مقصد مہذب طبقے کے لوگوں کو روزمرہ کے سیاسی سماجی واقعات ومعاملات سے باخبر رکھنا تھا ان اخباروں میں مسائل حیات پر فلسفیانہ رنگ میں بھی اظہار خیال ہونے لگا اِسّے نگاروں نے طنز وظرافت سے بھی کام لینا شروع کیا۔ یہ بدعت حسنہ اتنی مقبول ہوئی کہ قلیل مدت میں کئی اخبار اس مقصد کے لیے وجود میں آ گئے۔ ان اخباروں نے اِسّے، نگاروں کو بے حد فروغ بخشا۔ اس دور میں گوناگوں موضوعات پر اسیز لکھے جانے لگے۔ ان میں عام مقالے بھی ہیں اور مخصوص اسیز بھی ہیں جن میں مان ٹین کے اسیز کی روح اور طرز بیان کی شگفتگی ہے۔ موخرالذکر قسم کے اسیز زیادہ مقبول ہوئے۔ جس طرح اسیز کے ذریعے لوگوں کے خاکے بنائے بھی جاتے تھے اور اڑائے بھی جاتے تھے اسی طرح ان میں لطائف وظرافت اور تخیل پروازی سے بھی کام لیا جاتا تھا اسی دور میں ہر قسم کے اسیز لکھنے والے بے شمار اسّے نگار ہوئے جن میں ہر ایک ڈکشن اور اسٹائل خصوصیت رکھتے ہیں۔

انیسویں صدی میں ناول کی مقبولیت نے اِستے نگاری کو پس پست ڈال دیا۔ اس عہد میں اچھے لکھنے والوں کا فقدان تھا اور جو صاحب طرز انشاپرداز تھے انھوں نے ٹھوس عالمانہ مضامین کو اسیز میں جگہ دے کر اِستے نگاری کی لطافت کو بڑی حد تک صدمہ پہنچایا مگر اِستے نگاری میں کساد بازاری کا بڑا سبب یہ تھا کہ ناول نگاری نے جو بہت پہلے سے اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی اس عہد میں نیا روپ اختیار کر لیا تھا۔ ناول نگاروں نے اسیز کے عناصر یعنی کردار نگاری کے خاکے بنانا، تخیل پردازی، طنز و ظرافت اور شگفتہ بیانی کو ناول میں سمو کر اس صنعت میں توانائی و دلکشی پیدا کر دی تھی۔ غرض اس دور میں اسیز کی طرف سے لوگوں کی طبیعت ہٹتی گئی با ایں ہمہ اس دور میں ہزلٹ اور لیمب (LAMB) جیسے انشاپردازوں نے اسیز میں ذاتی عنصر کو دخل کر کے اپنی لطافتِ بیان سے اِستے نگاری کو زندہ رکھا۔ ان کے اسیز کی خصوصیت یہ ہے کہ اسیز میں ان کی اپنی شخصیت کے آئینے میں زمانہ اور حیات و کائنات پر تنقید کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

بیسویں صدی کی اِستے نگاری کسی نمایاں خصوصیت کی حامل نہیں ہے اس صدی کے اوائل اور موجودہ دور میں ہر شعبۂ زندگی سے متعلق موضوعات پر اسیز لکھے جاتے ہیں۔ ان میں عام مقالہ نگاری کے مقابلہ میں ذاتی یا Personal اسیز زیادہ مقبول پائے جاتے ہیں، یہ اسی قسم کے اسیز ہیں جو ہزلٹ اور لیمب نے لکھے ہیں ان میں مانٹین کے بتائے ہوئے راستے پر عمل کیا جاتا ہے۔ اِستے نگار اپنی شخصیت کے لیے زیادہ معلومات بہم پہنچاتا ہے اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اِستے نگار انفرادیت سے اجتماعیت اور جزو کل کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مثلاً اپنی تعلیم اپنے مدرسے اور اپنے مدرسین کے متعلق بیان کرتے کرتے عام تعلیمی مسائل مدارس اور مدرسین پر بھی اظہار خیال کر جاتا ہے۔

اِستے نگاری کی تعریف بیان کرنے سے پہلے اس کی تاریخ اس لیے بیان کی گئی ہے کہ جیسے جیسے یہ صنعت ترقی کرتی گئی اس کی تعریف بھی بدلتی رہی بلکہ موضوعات اور اسالیب بیان کی وجہ سے اِستے نگاری کو تعریف کی حد میں لانا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ مانٹین کے اسیز خود اس کی شخصیت اور فلسفیانہ رنگ میں [illegible] کے حامل ہیں ان میں عالمانہ مضامین کا سا ربط و تسلسل نہیں ہے لیکن اسلوب بیان

کا اچھوتا پن خصوصیت رکھتا ہے۔ ان قلم برداشتہ لکھے ہوئے غیر مربوط ادب پاروں کو اسیز (کوشش) ہی کہنا مناسب ہے۔ جب بیکن نے اس طرز کو اپنایا تو اسیز کی نوعیت قدرے بدل گئی۔ بیکن کے اسیز میں اخلاق آموزی یا درس حیات اگرچہ مرکزی خیال ہے لیکن فلسفہ کا رنگ زیادہ گہرا ہو جانے اور ترتیب خیالات کی وجہ سے ان میں بے ساختہ پن نہیں رہا۔ خود بیکن نے اپنے اسیز کو افکار پریشاں کہا ہے جس کا مفہوم کوشش Essai سے مختلف ہے بیکن کے چند موضوعات اکتساب، ادبار، ادب کا ارتقاء وغیرہ ہیں بیکن کے عہد کے دوسرے انشائیہ نگاروں نے صبر، عجز و انکسار، آرزو وغیرہ جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اسی طرح درزی اور سپاہی جیسے معمولی موضوع بھی انشائیہ نگاری کے لیے نہایت اہم موضوع ثابت ہوئے۔ ان موضوعات کو دیکھنے سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ انشائیہ نگاری کا خاص مقصد حیات انسانی پر تنقید اور اخلاق آموزی تھا۔ لہٰذا انھیں اسیز ہی کہہ سکتے ہیں جو عام مقالہ نگاری سے مختلف ہیں اٹھارھویں صدی میں حالات بدل گئے اسے ہر شعبۂ حیات انسانی یعنی سیاست، معاشرت، مذہب وغیرہ کا اہم ترجمان قرار پایا اگرچہ اس سے پہلے بھی ان موضوعات پر اسیز لکھے گئے ہیں لیکن اس دور میں یہ افکار پریشاں غیر مربوط نہیں ہیں تاہم ایجاز و اختصار کے لحاظ سے ناتمام ضرور ہیں۔ یہ نہ ٹریٹائز یا پیپر (مقالہ) کی صف میں آتے ہیں نہ ہی انھیں تھیسس (مقالہ جن میں کوئی عمومی یا نظریہ پیش کیا جائے) کہہ سکتے ہیں لہٰذا انھیں بھی اسیز ہی کہا گیا ہے۔ اس دور کے جبل العلم والادب ڈاکٹر جانسن نے ان اسیز کو Irregular Indigested Piece کہا ہے۔ یہ اسے اپنے ربط و تسلسل وغیرہ کی وجہ سے اس تعریف پر پورے نہیں اترتے چوں کہ اس عبارت سے انشائیہ نگاری دو قسموں میں تقسیم ہو چکی تھی ایک عام مقالہ نگاری اور دوسری مخصوص انشائیہ نگاری۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں دونوں قسموں کی انشائیہ نگاری کے لیے ایک جامع تعریف اس طرح پیش کی گئی ہے[1] مگر متنوع موضوعات و اسالیب کی وجہ سے جامع تعریف پیش کرنا مشکل

---

1. A composition of moderate length

ہے۔ انگریزی ادب میں اس کا یہ حل تجویز کیا گیا ہے کہ اسیز کو دو قسموں میں تقسیم کردیا گیا۔ پہلی قسم میں تمام سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، سوانحی وغیرہ اسیز کو شامل کیا گیا ہے اور انھیں فارمل Formal یعنی تکلفی اور رسمی کا نام دیا ہے اور دوسری قسم کے اسیز کو فیمیلیر (Familiar) یعنی ذاتی اور شخصی کہا ہے۔ انھیں پارکسلنس Parexcellence بھی کہتے ہیں۔ یہ اپنے خیال اور اسلوب کے اعتبار سے ادب پارے ہوتے ہیں پہلی قسم کے اسیز کی مثال ایسی ہے جیسے ایک موضوع پر طول طویل مقالہ بھی لکھا جاسکتا ہے اور اسی موضوع پر پندرہ منٹ میں ختم ہونے والی ریڈیائی تقریر بھی ہوسکتی ہے جو مربوط تو ہوتی ہے مگر مختصر اور نامکمل سی ہی رہتی ہے۔

اردو میں دونوں قسم کے اسیز موجود ہیں مگر ان کو نہ کوئی الگ نام دیا گیا ہے نہ ہی انگریزی لفظ ایسے نگاری اپنایا گیا۔ اُردو میں ہر ایک کو مقالہ کہا جاتا ہے اُردو میں مقالہ بہت وسیع مفہوم کا حامل ہے ایک معمولی مضمون سے لے کر ٹھوس علمی مضمون تک کو مقالہ کہا جاتا ہے ہم اس موقع پر پہلی قسم کے اسیز کو مقالہ ہی کہیں گے لیکن دوسری قسم کے مخصوص ادب لطیف کے لیے لفظ "ایسے" اور "اسیز" استعمال کریں گے۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ایسے نگار اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں حیات و ممات اور حوادثات کائنات سے متعلق شوخیٔ بیان کے ساتھ بعض اوقات صاف صاف اور بعض اوقات رمز و کنایہ میں کسی اخلاقی پہلو کو پیش کرتا ہے اگرچہ ایسے نگار فلسفیانہ انداز میں حیات کی کش مکش، زمانے کی ستم ظریفی، اخلاقی اقدار وغیرہ جیسے کی گتھیاں سلجھاتا ہے مگر اس کام کے لیے یہ اچھوتا انداز بیان اختیار کرتا ہے کہ ان کے سمجھنے میں نہ کسی قسم کی سعی و کاوش کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ فلسفہ کی خشکی ذہن پر بوجھ بنتی ہے۔ ایسے نگار اس موقع پر ایک عالم یا فلسفی کی حیثیت سے اپنے خیالات نہیں پیش کرتا بلکہ ایک روشن ضمیر رازہائے سربستہ کے منکشف کی طرح پیش کرتا ہے ایسے نگار کی کامیابی کا گر اس میں مضمر ہوتا ہے کہ وہ پند و نصیحت، درس اخلاق اور فلسفہ کی گہرائی کو سبک بنانے کے لیے لطائف و ظرافت، طنز و مزاح اور لطافت زبان و بیان کو کام میں لیتا ہے یہی سبب ہے کہ ایسے [illegible] کے لیے از سنگ تا سال [illegible] موضوع کا کام [illegible] ہے اور وہ [illegible]

اسیز میں انسان کی عقل و فراست سے زیادہ جذبات سے تخاطب ہوتا ہے اور اس وجہ سے پڑھنے والے کے دل پر بات بیٹھ جاتی ہے۔ اسے نگار سے یہ سب کچھ اضطراری طور پر ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی زبان و انداز بیان اور جذبات و خیالات فطری ہوتے ہیں جو ہمیں بھی لے اڑتے ہیں اور ہم اسے نگار کے ہم خیال ہو جاتے ہیں۔ اسیز بار بار پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں کیوں کہ یہ روحانی مسرت کا باعث ثابت ہوتے ہیں جوان اسیز کا خاص مقصد ہوتا ہے اس تشریح کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس قسم کے ادب پارے کسی بھی طرح نظم سے کم نہیں۔ اور شاعرانہ ذہنیت و صلاحیت رکھنے والا ہی نثر میں شاعرانہ لچک پیدا کر سکتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صنف اپنی بے ربطی بیان اور اچھوتے طرز ادا کے پیش نظر اردو غزل سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔

اسے کے پیش نظر خمیر و مزاج، ٹکنیک کو دیکھنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک اسے نگار عالم متبحر ہو یا نہ منطق و فلسفہ کے بحر عمیق کا غوطہ زن ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس کے ہاں روشن ضمیری، قلب و نظر کی گہرائی اور دانش و بینش کی باریکی کا ہونا بہت ضروری بلکہ لازمی ہے۔ اور یہ خواص تجربہ و مشاہدہ کی مدد سے پختگی عمر کے ساتھ حاصل ہوتے ہیں۔ صرف جوانی کی ترنگ، رومانی خیال، تخیل کی اڑان سے کام نہیں چلتا۔ ایسے مضامین کو انشا اور ادب لطیف (مخصوص صنف اردو) کہا جا سکتا ہے لیکن یہ اسیز کہلانے کے کسی طرح مستحق نہیں ہو سکتے۔ اب ہم اردو ادب میں اسے نگاری کا زرا غائر نظر سے مطالعہ کریں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اردو میں کس حد تک اس صنف لطیف کے تتبع میں کامیابی حاصل ہوئی ہے ہم یہاں اسے نگاری پر قدرے مفصل اظہار خیال کریں گے اور عام مقالہ نگاری پر سرسری نظر ڈالیں گے۔

اردو میں مقالہ نگاری کا آغاز ۱۸۵۰ء کے آس پاس ہو چکا تھا۔ مگر اس کی مقبولیت کا عہد ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوا۔ دلی کالج کے نصاب میں مختلف مضامین شامل تھے۔ امتحان کے پرچوں میں ایک پرچہ مقالہ نگاری سے بھی متعلق ہوا کرتا تھا اس دور کی مقالہ نگاری کا اندازہ مقالوں کے عنوانات سے ہو جاتا ہے دو چار عنوان ملاحظہ فرمائیے ۱۸۵۷ء کے امتحان میں حسب ذیل عنوان تجویز کیا گیا تھا۔

انگریزی عملداری ہندوستان پر زمینوں کی پیداوار بڑھنے سے کیا علاقہ رکھتی ہے؟

امتحان کے پرچوں میں مضمون نویسی کے علاوہ سالانہ مضمون نویسی کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا
۱۸۴۹ء کے مقابلہ کے لیے یہ موضوع تجویز کیا گیا تھا۔
"اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادی رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا"
اسی طرح ایک موضوع ملاحظہ فرمایئے۔
"مختلف آزاد پیشے اور مفید کاروبار جو ہندوستانی دیسی ریاستوں میں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک کی کامیابی کے بہترین طریقے خواہ ابتدائی تربیت کے لحاظ سے یا مابعد کی مساعی کے اعتبار سے" ۱۸۵۴ء کے سالانہ مقابلے کا بھی عنوان دیکھیے۔
"شاہی اور مخلوط قسم کی حکومت میں کونسی بہتر ہے اور اس کی فضیلت کی کیا وجہ ہے" ان انگریزی اور اردو انعامی مقابلوں میں طلائی اور نقرئی تمغے دیے جاتے تھے مفتی صدرالدین آزردہ نے بھی اردو میں بہترین مقالے کے لیے ایک طلائی تمغہ عطا کیا تھا۔ ان مقابلوں میں انعام پانے والے طلبا میں ماسٹر رام چندر، موتی لال، نذیر احمد، محمد حسین، ذکاءاللہ، بھگوان داس، خواجہ ضیاءالدین خصوصیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے بیشتر فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسی کالج میں معلّمی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے انہی لوگوں کی مساعی جمیلہ سے مقالہ نگاری نے رواج پایا۔ ماسٹر رام چندر نے فوائدالناظرین اور محب ہند ایسے دو رسالے بھی نکالے تھے۔ ان میں علمی، ادبی بحثیں اور مقالے چھپتے تھے۔ مذکورہ رسالے کئی سال ادبی خدمت انجام دینے کے بعد ۱۸۵۵ یا ۱۸۵۶ء میں بند ہوگئے تھے اس دور کی ادبی انجمنوں نے بھی مقالہ نگاری کو رواج دینے میں ہاتھ بٹایا ہے۔ ایک ایسی انجمن دہلی سوسائٹی کے نام سے ۱۸۵۶ء میں خدمت انجام دے رہی تھی۔ اس کے روح رواں ماسٹر پیارے لال تھے انجمن میں تقریروں کے علاوہ اصلاحی مقالے بھی پڑھے جاتے تھے خود ماسٹر پیارے لال سب سے اچھے مقالہ نگار تھے۔ پنجاب کے رسالہ اتالیق میں ان کے مقالے اکثر چھپتے رہے ہیں۔ اس دور کے مقالوں کے عنوانات دیکھنے سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ ذہنوں کو بدلنے کے لیے تصنیف و تالیف سے زیادہ مقالہ نگاری ہی مفید مطلب ثابت ہوئی۔ اس دور کی ایسے نگارش سے نام الاعلم ہیں۔ گمان غالب ہے کہ انگریزی ادب کے زیر اثر اسے بھی فروغ ملا ہوگا۔

۱۸۵۷ء میں سیاسی انقلاب آیا اس کے اسباب وعلل کی تاریخ دفتر پارینہ ہو چکی ہے یہ انقلاب باعث زحمت تو تھا مگر نوید رحمت بھی لایا، بنائے کہنہ ڈھنے پر تعمیر نو کی فکر لاحق ہوئی۔ اسے زنجیر غلامی سے تعبیر کرنا بجا سہی لیکن جنبش زنجیر بھی کہنا بے جا نہیں جب طلسم ٹوٹا اور تنزل حقیقت بن کر بھیانک صورت میں سامنے آیا تو ایک طرف مایوس لوگ مایوس تر ہو گئے اور تقدیر کو رو پیٹ کر بیٹھ رہے مگر دوسری طرف بیدار مغز بیدار تر بھی ہو گئے اور انسانیت کے پیکروں نے کمر ہمت کس لی اور علم قلم لے کر میدان عمل میں جمع ہو گئے اور ان بزرگوں کے لیے کام بہت بکھرا پڑا تھا مگر آفرین ہے ان کے حوصلوں کو کہ ہر شعبۂ زندگی میں یہ لوگ رواں دواں تھے، انھوں نے اپنی نیک نیتی اور جذبۂ خدمت الناس کے سبب ایک طرف عوام کے دلوں کی گہرائیوں میں پہنچ کر علم وعمل کا چراغ روشن کیا اور دوسری طرف خواص کے عقل وخرد کی بلندیوں کو بھی جالیا۔ ان کا بڑا کام سوتوں کو جگانا اور جاگتوں کو راہ بتانا تھا اس کام کے لیے ان بزرگوں نے مقالہ نگاری کو آلۂ کار بنایا، مقالہ نگاری سامنے کی چیز تھی، دلی کالج نے پہلے ہی اس کی داغ بیل ڈال دی تھی اور واضح کر دیا تھا کہ ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لیے مقالہ نگاری مفید مطلب ثابت ہوگی۔

جہاں تک اسے نگاری کا تعلق ہے اس دور میں ہر بزرگ نے ایک آدھ اسے ضرور لکھا ہے ان میں سرسید، مولانا آزاد، ذکاء اللہ خصوصیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ اسیز انگریزی فارمل (شخصی) اسیز کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے لیکن اس قسم کے اسیز سے اردو اسیز انداز بیان اور اسپرٹ میں بہت مشابہت رکھتے ہیں ان بزرگوں کے اسیز نہایت مربوط، مرتب اور غور وتامل کا نتیجہ ہیں حالات نے انھیں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ بنا دیا تھا لہٰذا پند ونصیحت ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ اسی لیے ان کے اسیز میں بھی خشک ناصحانہ انداز پایا جاتا ہے تاہم انداز بیان کے بے ساختہ پن، لطائف طنز ومزاح وغیرہ سے اپنے مقالوں کو اسے کا موڈ Mood دے دیا ہے ان کے مقالوں اور اسیز کی یہ امتیازی خصوصیت

سرسید نے مقالوں کے علاوہ اسیز بھی کافی تعداد میں یادگار چھوڑے ہیں ان میں بے تعصبی، آزادی رائے، [illegible] خصوصیت رکھتے ہیں ان میں [illegible] کی [illegible] ضرور [illegible]

کی وجہ سے سرسید کے اسیز فلسفیانہ کے بجائے فلانہ زیادہ ہیں سرسید کا انشائیہ "بحث و تکرار" نہایت شگفتہ اور معیاری ہے اس کا آغاز ہی ہمارے ذہن و فکر کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے "امید کی خوشی" سرسید کا بہترین انشائیہ ہے۔

مولوی ذکاء اللہ اس دور کے بہترین انشائیہ نگار ہیں۔ ذکاء اللہ کا ایک انشائیہ "کتب کا مطالعہ" بیکن کے ایک انشائیے کا ترجمہ ہے جس کے لیے کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے لیکن ان کا انشائیہ "آگ" ان کی جدت طبع کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس انشائیے کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذکاء اللہ نے انگریزی کے انشائیہ نگاری کے تتبع کی کامیاب کوشش کی ہے اگرچہ انشائیے میں معلومات کا دفتر بھر دیا ہے لیکن اسلوب بیان کی شگفتگی نے عالمانہ سنجیدگی کو پس پشت ڈال دیا ہے اس کے بعض جملے تو بہت ہی شگفتہ ہیں مثلاً "آگ نامبارک اولاد ہے" یا "آگ ہماری دشمن جاں سوز بھی ہے اور دوست دل افروز بھی" وغیرہ۔ مولانا حالی سرسید کے بہت وفادار اور دانش مند لفٹنٹ تھے۔ حالی نے کثرت سے مقالے یادگار چھوڑے ہیں ان میں دو ایک اسیز بھی پائے جاتے ہیں "زبان گویا" اور "جب زمانہ........ قابل ذکر ہیں" "زبان گویا" میں انشائیے کی روح مکمل طور پر موجود ہے اس "موج ہوم خیر" میں تشریح یا استدلال کے بجائے تاثرات ہیں اسی طرح محسن الملک کا انشائیہ موج۔ وہ تعلیم و تربیت کی شعبہ "اگرچہ تمثیلی رنگ میں ہے، لیکن انشائیہ نگاری کی حدود میں آجاتا ہے۔

اُردو کے انشائیہ نگاری میں محمد حسین آزاد بالکل الگ مقام رکھتے ہیں۔ انھیں انگریزی انشائیہ نگاری سے شغف تھا۔ انشائیہ نگاری کے بارے میں آزاد نے نیرنگ خیال کے دیباچے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

> "زبان انگریزی میں نظم کا طور تو کچھ اور ہی ہے مگر نثر میں بھی خیالی انشائیہ اکثر مضامین خاص خاص مقاصد پر لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وسعت خیال اور پرواز فکر اور تازگی مضامین اور طرز بیان کا انداز دیکھنے کے قابل ہے۔ میں نے انگریزی انشاء پردازی کے خیالات سے اکثر چراغ روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر شکل میں تھیں اور انشائیے جواب مضمون کہتے ہیں ان میں ادا ... تمام

کو غرضیں مخلوط ہیں مگر بہت سے مضامین وہ ہیں جن کی روشنی ابھی ہمارے دل ودماغ تک نہیں پہنچی۔ بعض بعض مضامین میں انسان کے قوائے عقلی یا حواس یا اخلاق کو لیا ہے انھیں انسان یا فرشتہ یا دیو یا پری تصور کرلیا ہے اوران کے معاملات اور ترقی منزلت کو سرگزشت کے طور پر بیان کیا ہے ان میں شگفتگی طبع کے علاوہ یہ غرض رکھی ہے کہ پڑھنے کو کسی صفت پسندیدہ پر رغبت اور کسی خلق بد سے تنفر ہو یا کسی حصول مطلب کے رستے میں جو نشیب و فراز ہوتے ہیں ان سے واقف ہو"۔

آزاد نے مشرقی مزاج کے پیش نظر انشائیہ نگاری میں تخیلی رنگ اختیار کیا ہے انگریزی انشائیہ نگاری میں تمثیلی رنگ خصوصیت واہمیت نہیں رکھتا۔ آزاد نے اپنے ان خیالی مضامین میں انشا پردازی کا کمال دکھلایا ہے ان کے اسلوب بیان کی وجہ سے اسیز میں لطافت ودلکشی پائی جاتی ہے۔ تمثیلوں کے ذریعے سے تاریخ، فلسفہ، اخلاق وغیرہ کے اہم پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔

مولانا شبلی اس دور کے زبردست مقالہ نگار ہیں ان کے مقالے آٹھ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ شاید ہی کوئی اہم شعبۂ زندگی اور علم وادب کی کوئی شاخ ایسی ہوگی جس پر شبلی نے مقالہ نہ لکھا ہو شبلی نے اپنے شگفتہ اسلوب بیان اور متنوع موضوعات سے مقالہ نگاری کو اس دور میں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ زبان کی لطافت ورنگینی اور نزاکت خیالی نے اردو کا معیار بلند کردیا۔ شبلی نے تقریباً ایک سو مقالے یادگار چھوڑے ہیں مگر ان میں ایک بھی انشائیہ نہیں پایا جاتا۔ شبلی عالم متبحر تھے قلب ونظر بھی رکھتے تھے۔ ادبی ذوق ووجدان کے بھی مالک تھے اگر انشائیہ نگاری کی طرف متوجہ ہوتے تو ان کے اسیز اردو ادب میں "خاصے" کی چیز ہوتے۔ اس دور کے انشائیہ نگاروں میں مہدی حسن خصوصیت رکھتے ہیں۔ مہدی حسن کے اسیز میں انگریزی انشائیہ نگاری کے تمام انداز پائے جاتے ہیں اگرچہ مہدی حسن نے Formal فارمل اسیز (مقالے) لکھے ہیں۔ لیکن ان ادبی مقالوں کو اپنی شوخیٔ بیان سے ایسے کا موڈ Mood دے دیا ہے۔ یہ اتنے شگفتہ ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ میر ناصر علی اس دور کے آخری چراغ ہیں ان کے مقالے

[illegible]

مرنا تو جینے کا مزہ کیا" "چرخ شعبدہ باز" ہر حیثیت سے اسیز کہلانے کے مستحق ہیں زبان وانداز بیان کی شگفتگی اور بے ساختہ پن ان کے اسیز کی نمایاں خصوصیت ہے۔

(سید ظہیر الدین مدنی صاحب کی کتاب "اردو اسیز" کے مقدمے سے اقتباس)

(باقی ص ۳۱ کا)

ماہنامہ ٹانی کہانی نمبر

شمارہ اگست ۶۵ء

مرتبین) اوصاف احمد
معظم جعفری

صفحات: ۱۲۸ سائز ۲۰×۳۰/۱۶

قیمت کہانی نمبر: ایک روپیہ سالانہ: -/۲

پتہ: گوتم بدھ مارگ، لکھنؤ (یو، پی)

ماہنامہ 'ٹانی' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بچوں کا رسالہ ہے۔ یہ رسالہ گزشتہ پانچ سال سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے جس کے لیے اس رسالے کے اراکین قابل مبارک باد ہیں۔ اس رسالے کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ اب کچھ عرصے سے اس میں ہر ماہ ہندوپاک سے شائع ہونے والے بچوں کے دوسرے رسائل سے انتخابات ہی شائع کیے جا رہے ہیں اور اس طرح اسے بچوں کا "ڈائجسٹ" بنا دیا ہے جو غالباً بچوں کے رسالوں میں پہلا ڈائجسٹ ہے۔

زیر نظر شمارہ "کہانی نمبر" کی شکل میں شائع کیا گیا ہے اور اس میں جو کہانیاں شامل ہیں وہ بھی کسی کتاب یا رسالے سے ہی کی گئی ہیں۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند اور جناب کیلاش پرکاش وزیر تعلیم اتر پردیش کے پیغامات اور تصویروں کے علاوہ اس میں ۱۸ اور تصاویر، مختلف ناموراد یبوں کی ۱۲ کہانیاں اور ایک نظم شامل ہے۔ کہانیوں میں رام لعل کی کہانی "راجہ صاحب کا چڑیا گھر" کے علاوہ جو بچوں کے لیے ایک بے مقصد کہانی معلوم ہوتی ہے، بقیہ تمام کہانیاں اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہر طرح بہترین اور نہایت عمدہ انتخاب کہے جانے کی مستحق ہیں۔

رسالے میں جو چیز کھٹکتی ہے وہ ہیں انگریزی زبان میں متعدد اشتہار۔ بچوں کے اس رسالے میں انگریزی اشتہار کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ اس طرح صفحہ ۱۱ پر "کیا آپ کو معلوم ہے" کے عنوان سے اسکول، امتحان اور طالب علم کی جو تعریف کی گئی ہے وہ بڑوں کے لیے ایک طنز ومزاح ہو سکتا ہے لیکن بچے کہاں سے لطف لینے کی تاب لائیں اس لیے ایسے انتخاب نہ شائع کیے جائیں تو مناسب ہے۔ (ریحان احمد عباسی)

فراقؔ گورکھپوری

غزل

کچھ نہ کچھ عشق کی تاثیر کا اقرار تو ہے — اس کو الزام تغافل پہ کچھ انکار تو ہے
ہر فریبِ غمِ دنیا سے خبردار تو ہے — تیرا دیوانہ کسی کام میں ہشیار تو ہے
آج تک بھید کسی کو نہ ملا تہ نہ ملی — یہ تری نرگسِ مخمور خبردار تو ہے
دیکھ لیتے ہیں سبھی کچھ ترے مشتاقِ جمال — خیر دیدار نہ ہو حسرتِ دیدار تو ہے
سر پٹکنے کو پٹکتا ہے مگر رک رک کر — تیرے وحشی کو خیالِ در و دیوار تو ہے
دل کا بھی ٹھیک نہیں موت کا بھی ٹھیک نہیں — اب جیے وہ کہ مرے زیست سے بیزار تو ہے
عشق کا شکوۂ بیجا بھی نہ بیکار گیا — نہ سہی جور مگر جور کا اقرار تو ہے
تجھ سے ہمت تو پڑی عشق کو کچھ کہنے کی — خیر شکوہ نہ سہی شکر کا اظہار تو ہے
بھی ربطِ خاص کی ملتی ہے جھلک — خیر اقرارِ محبت نہ ہوا انکار تو ہے
ی عنوان ہیں ممنون کرم کرنے کو — عشق میں کچھ نہ سہی زندگی بیکار تو ہے

چونک اٹھتے ہیں فراقؔ آتے ہی اس شوخ کا نام
کچھ سراسیمگئ عشق کا اقرار تو ہے

(غزلستان" سائز ۲۲×۱۸/۸ مجلد صفحات ۲۷۲ طبع ۱۹۶۵ء حوالہ صفحہ ۹۳)

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم اے

روزے گلے پڑ گئے

انتقال تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن ستم یہ ہوا کہ ہمارے ایک عزیز ترین دوست کے والد کا بھی انتقال ہو گیا اور ہمیں نہ صرف اپنے دوست کے پاس تعزیت ہی کو جانا تھا بلکہ بر بنائے اخلاص ان کے والد کو یاد کر کے اپنے دوست سے لپٹ کر دو چار منٹ رونا بھی تھا تاکہ ہمارے دوست کو یقین ہو جائے کہ مرنے والے صاحب صرف انھیں کے والد نہ تھے بلکہ تقریباً ہمارے دوست شریکے والد بھی تھے۔

یوں رونے کو ماشاء اللہ برا بھلا ہر ذی روح رو لیتا ہے ایک معمولی کتے سے لے کر راقم الحروف تک میں اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ رونے کی صلاحیتیں بخشی ہیں لیکن ہمارے رونے میں اگر کوئی خامی تھی تو وہ آمد تھی۔ مقصد یہ کہ ہم اکسٹمپور رونے پر بالکل قادر نہ تھے۔ دوسرے تحت اللفظ روتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ کتے تک کے مترنم رونے کو برداشت کرنے کو تیار تھے لیکن ہمارا آٹھ آٹھ آنسو رونا بھی کسی کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا چنانچہ والد محترم کی لاش پر ہم نے اپنے دوست کو دیکھتے ہی نتھنے پھلا کر تحت اللفظ میں رونے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ہمارے دوست نے کچھ ایسی قہر آلود نگاہ سے ہم کو دیکھا جیسے وہ کہہ رہے ہیں کہ "ابے اچھے اچھے استاد رونے والوں کے مقابلہ میں کیا بدمذاقی کر رہا ہے؟" مگر اپنی اس بدمذاقی کے احساس کے باوجود ہم کو بہرحال اپنے دوست کے والد کو تو رونا ہی تھا اس لیے اپنے رونے میں ایک کیف آور ایک آمد پیدا کرنے کی غرض سے ہم نے ایک ہفتہ پہلے ہی سے رونے کا ریہرسل شروع کر دیا اور ماشاء اللہ چند ہی روز کی مشق میں ہماری حالت یہ ہو گئی کہ ہم رقیب رُوسیاہ کی شادی سے لے کر معمولی گدھے کی حرکت قلب بند ہو جانے تک پر ہر طرح کا رونا رو سکتے تھے۔ آخر وہ دن آگیا جس دن کے لیے ہم نے یہ پاپڑ بیلے تھے اس لیے اپنے رونے کو فنی ٹشنگ پیچ دینے کی غرض سے رات کے بارہ بجے جب گھر

گھونٹ سے نیچے گر کر خراٹے لینے لگا تو ہم نے اپنے رونے کی سوئی گلے کے کھنکتے ریکارڈ پر لگا کر ہز ماسٹرز وائس میں اپنے دوست کے والد کو رونا شروع کر دیا اور نقل کو اصل سے ملا دیا لیکن یقین مانیے جب انسان پر خدا کا قہر نازل ہوتا ہے تو اس کے لیے نئی نئی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی ہمارا رونا دراں دراں کی منزل سے دو ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ قریب ہی جو ہمارا آٹھ سالہ بچہ سو رہا تھا، اس کی آنکھ کھل گئی اور اس کے بعد پورے گھر میں ہمارے رونے کا ہلڑ مچ گیا۔ تمام عزیز و اقارب اور گھر کی مامائیں تک اپنی اپنی چارپائیاں چھوڑ کر ہمارے پلنگ کے گرد جمع ہو گئیں۔ ہماری مشق معیار سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس لیے چھٹتے ہی ہم سوا سو میل فی گھنٹہ کی رلائی کے حدود میں پہنچ گئے۔ اور ہمارا دل یہ کہہ کر ہماری حوصلہ افزائی کرنے لگا

ہوں وہ دریا جو سمندر سے ملا ہے فرقت
رو کے ٹے سے کہیں رکتی ہے طبیعت میری

آنسوؤں کی اس روانی میں ہمارے لیے رونے کا کوئی معقول عذر سوچنا ناممکن تھا اس لیے ہمارے رونے میں تسلسل کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی گھبراہٹ اور کرب بھی پیدا ہو گیا۔ بہر صورت تھوڑی دیر تک تو ہم نے اسی میں مفر سمجھا کہ روتے رہو لیکن اس دوران میں ان لطائف پر بھی غور کرنے لگے جنھیں سن کر ایک بار ہم بے اختیار ہنس پڑے تھے چنانچہ ہم نے اُن لطائف کو دُہرایا ـــــــ

دو میاں بیوی کشیدگی کی اس منزل پر پہنچ گئے تھے کہ ان کا دوبارہ ملنا ناممکن تھا لیکن اس کے باوجود جب میل ہو گیا تو میاں کے ایک دوست نے پوچھا کہ ارے بھئی مصالحت کیسے ہوئی؟ اس پر میاں اکڑ کر اور مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے "آخر انھیں گھٹنوں کے بل آنا پڑا۔" دوست نے پوچھا پھر کیا ہوا؟ بولے "اس کے بعد بیوی نے کہا اب پلنگ کے نیچے سے نکل آؤ۔"

لیکن یہ لطیفہ بھی اشکوں کی روانی میں بہہ گیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک دوسرا لطیفہ یاد کیا جسے سن کر کبھی ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔ یعنی ایک معمر عورت بہت زیادہ میک اپ کرنے کے بعد اپنی سہیلی سے بولی "اے بہن ایک آدمی ہے جو مسلسل مجھے گھورے جا رہا ہے" اس پر سہیلی بولی "یہ پرانی چیزوں کا بیوپاری معلوم ہوتا ہے۔"

لیکن یہ لطیفہ بھی ہمارے اشکوں میں اس طرح کھڑی مارتا نکل گیا کہ ہم حیران ہو کر رہ گئے۔ اس کے بعد ہم نے چند مضحک اشعار کی لڑائی شروع کی اور اس شعر کو یاد کیا ؎

جو ئیں ہیں تیرے سر میں آہو ہیں یا ختن میں
یا منے منے ہاتھ لیٹے ہیں کھبری بن میں

اور جب اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ جو بڑا ہی مسبّب الاسباب ہے اس نے خود بخود ہمارے بچاؤ کی ایک صورت پیدا کر دی۔ اسی دوران میں ہمارے تین سالہ بچے نے جو ہمارے رونے پر اٹھ بیٹھا تھا۔ ہم کو روتے دیکھ کر تتلا تتلا کر کہنا شروع کیا "ابے ابّا! آپ نیوں لو لہے ہیں" اس کے "ابے" پر ہم کو ہنسی آگئی اور ہمارے آنسو کچھ کچھ رُکنے لگے۔ لیکن اسی دوران میں ہم نے دیکھا کہ ہماری محترمہ بوڑھی ماماؤں سے کُھسر پُھسر کچھ باتیں کرتی جاتی ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد قہر آلود نگاہوں سے ہمیں دیکھتی بھی جاتی ہیں۔

چناں چہ ہم اپنا رونا ختم کر کے ابھی ہچکیوں ہی کی منزل میں تھے کہ وہ جھنکا مار کر ہمارے پاس آکر غصّے میں بولیں: "جب آپ کو میری صورت سے نفرت تھی اور آپ کسی دوسری سے دل لگائے بیٹھے تھے تو آپ نے یہ چنگی پوٹے پیدا کر کے میری جان کو چڑیا نوچن کیوں مبتلا کر دیا" ہم نے آنکھ پھاڑ کر رونی آواز میں کہا "کیا کہا! ؟" بولیں "اے ہے کیا تجاہل عارفانہ برت رہے ہیں آپ جیسے کچھ جانتے ہی نہیں لیں۔ اب میں بہت بے وقوف بن چکی۔ مجھے ایک روز اور بھی شبہ ہوا تھا کہ جیسے کوئی رو رہا ہے لیکن میں سمجھی بلّی ہوگی مگر کیا خبر تھی کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی اس چہیتی کو یاد کرتے ہیں جو اب بھی دوسروں کا بنا بنایا گھر بگاڑنے کے لیے لمبے لمبے خط آپ کو لکھا کرتی ہے۔" بیگم کے یہ الفاظ سن کر ہماری سٹی بٹی گم ہو گئی اور ہم نے کہا کہ یہ ہوا کیا؟ ہم روزے بخشوانے جا رہے تھے کیا خبر تھی کہ نماز گلے پڑے گی۔ بھلا بتلایئے ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ! کہاں دوست کے والد کا انتقال اور کہاں ایک مفروضہ محبوبہ جسے بیوی ہمارے گلے زبردستی تھوپنے کو تیار ہو گئی۔ ہم نے رونی اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "کیسا خط؟" بولیں "وہی خطوط جو آپ کی چہیتی دوسرے تیسرے دن بھیج کر آپ کو تسکین پہنچاتی رہتی ہے۔" یہ سن کر ہم میں ایک طرح کی جھلاہٹ پیدا ہو گئی اور ہم نے کہا کہ وہ کون سے خطوط ہیں میں تو دیکھوں؟ وہ تنتناتی ہوئی اٹھیں اور انھوں نے لاکر ایک لفافہ ہمارے سامنے ڈال دیا۔ ہم نے اس لفافہ کو غور [illegible]

اور پتہ لکھا تھا " میرے فرقت کاکوروی صاحب کو ملے " یہ خط ڈھاکہ کا تھا اور تقریباً تین چار ماہ پہلے کا آیا ہوا تھا۔ ہم نے جلدی سے خط نکال کر پڑھا تو اس کا مضمون تھا ـــــ

بندہ نواز!

میں وہی ہوں، اب بھی جو پہلے تھی نگر غریب نواز میں

یقین مانیے کہ میں ہندوستان سے ان حالات میں ڈھاکہ آئی کہ چلتے وقت آپ کا دیدار بھی نہ میسر ہو سکا۔ یہاں پہنچ کر جو میں نے ماہنامہ نکالا ہے اُس کے دو پرچے آپ کو بھیج چکی ہوں مگر آپ نے اُس کے لیے ایک حرف نہ لکھا۔ یہ خط محض یاددہانی کے طور پر لکھ رہی ہوں مگر بقول

اک وہ کہ بے ہمارے نہ تھا چین اک گھڑی یا یوں ہماری شکل سے بیزار ہو گئے

اب سر اٹھا کے بھی وہ ہمیں دیکھتے نہیں اللہ اب ہم ایسے گنہگار ہو گئے

آپ کی کنیز۔ روحانہ

یہ خط پڑھ کر ہمارے ہوش اڑ گئے کیوں کہ نہ اس سے پہلے ہم نے کبھی ان محترمہ کا نام سُنا تھا نہ ان کا اس سے پہلے کوئی خط ہی آیا تھا۔ دماغ پر بہت زیادہ زور دینے کے بعد ہم ان دوستوں کے بارے میں سوچنے لگے جو پاکستان اور بالخصوص مشرقی پاکستان کو پیارے ہو چکے تھے۔ سوچتے سوچتے ہمیں اپنے ایک یار غار اور کلاس فیلو کا خیال آیا اور وہ تھے ہمارے دوست رحمان جن کا بھی چند روز پہلے خط آیا تھا جس میں صرف اتنا لکھا تھا کہ "آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے " اور بس۔ انھوں نے ہم سے ایک مضمون کی ایک سال پہلے فرمائش کی تھی اور آخر میں یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر مضمون نہ آیا تو گھر سے نکلوا دوں گا۔ بیگم بولیں " کہیے اب خطوط میں کیوں آ گئے؟ "

ہم نے سوچا اس گو مگو کے عالم میں اگر جھوٹ بولے تو بے قصور دھر لیے جاؤ گے کیوں کہ ان حالات میں اگر کوئی شخص جھوٹ بولتا بھی ہے تو اس کے کئی رکن بحر سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہم نے اپنے قافیہ کی تنگی کا احساس کرتے ہوئے خط کو پھر اُلٹ پلٹ کر دیکھنے ہی میں اپنی بہتری سمجھی۔ اس کے بعد ہم نے اٹھ کر الماری سے اس خط کو جو ہمارے دوست کے یہاں سے آیا تھا نکال کر دیکھا تو معاملہ کی نزاکت سمجھ میں آ گئی اور ہم نے کہا کہ [illegible]

بولیں کہ اگر عورت ناقص العقل ہوتی تو نکاح کے وقت میں نے حامی بھر کے اپنی زندگی کیوں تباہ کی ہوتی۔ ہم نے لوہے کی گرمی کا اندازہ کر کے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں خیال آیا کہ ہمارے ان دوست صاحب کی ایک لڑکی روحانہ تھی جسے ہماری بیگم نے گودوں کھلایا تھا اور جو ہمارے دوست کے پاکستان جانے سے پہلے دن دن بھر ہمارے ہی یہاں کھیلا کرتی تھی۔ ہم نے کہا کہ دیکھو بیگم یہ خط تم جانتی ہو کس کا ہے؟ یہ ریحان کی لڑکی کا خط ہے جو رحمان کے ساتھ دس سال ہوئے پاکستان چلی گئی تھی اور اب وہاں سے اس نے عورتوں کا ایک میگزین نکالا ہے جس کے لیے رحمان نے ایک مضمون مانگا تھا۔ اور مضمون نہ بھیجنے پر رحمان نے تمہیں بے وقوف بنانے کے لیے روحانہ کی طرف سے یہ خط لکھا ہے۔ ہم نے دونوں خطوں کو بیگم کے سامنے رکھ کر کہا کہ دیکھو یہ دونوں خطوط ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے ہیں یا نہیں؟ رحمان نے یہ خط محض تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے لکھا ہے اسی لیے اس میں صرف یہ لکھا ہے کہ آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔ بیگم نے جب دونوں خط ملائے کہ ان کی تحریر ملائی تو ان کا غصہ کسی قدر دھیما پڑا اور بہت مشکل سے ہماری جان بچی۔ لیکن اس کے بعد مصیبت یہ آئی کہ ہمارا ہفتہ دو ہفتہ کا ریاض خاک میں مل کر رہ گیا۔ جب دوسرے روز ہم اپنے دوست کے یہاں تعزیت کو جانے لگے تو راستہ بھر کوشش کرتے رہے کہ ہم کن الفاظ میں دوست سے تعزیت کریں۔ دماغ پر انتہائی زور دینے کے باوجود نہ تو تعزیت کے الفاظ مل رہے تھے۔ اور نہ رونا ہی آرہا تھا۔ یہ سوچ کر ہم نے اپنے اوپر یاس و غم کی کیفیت طاری کرنے کے لیے کچھ غمگین اشعار پر غور کرنا شروع کیا کہ شاید اس سے دل میں غم کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ ہم نے سوچا کہ اپنے دوست کو دیکھتے ہی پہلے یہ شعر پڑھیں گے ؎

گُل ہوا عہدِ جوانی میں چراغِ زندگی
ہائے کیسا نیند کا جھونکا سرِ شام آگیا

لیکن پھر ہم نے سوچا کہ وہ تو اسّی سال کی عمر میں مرے ہیں۔ عہدِ جوانی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے اس لیے ہم نے اپنے والد صاحب کی موت اور اپنی یتیمی اور بے کسی پر غور کرنا شروع کیا۔ لیکن پھر بھی دماغ میں غم کی فضا پیدا نہ ہو سکی۔ پھر شدت [illegible] اپنے [illegible] کے مرنے کی خبر سن کر ہم [illegible]

خیال آیا کہ اگر لال بہادر شاستری کو اس کی خبر ہو گئی کہ ہم پنڈت نہرو کو یاد کر کے ابھی تک روتے ہیں تو وہ اپنا دشمن سمجھ کر ہم کو ڈی۔ آئی۔ آر میں دھر پکڑ لیں گے۔ اتنے میں ہمارے دوست کا گھر آگیا۔ ہم نے اپنے چہرے پر شیعہ سُنّی دونوں قسم کے خاندانوں کو مسلط کرتے ہوئے رونی شکل بنانا چاہی۔ لیکن گھبراہٹ میں ہماری آنکھ تک نہ بھیگی۔ ہم نے رومال جیب سے نکال کر اپنی دونوں آنکھوں کو رگڑتے ہوئے اور یہ سوچ کر کہ تخت یا تختہ، جوں ہی کنڈی کھٹکھٹائی تو ہمارے دوست نکل پڑے۔ ہم تعزیت کا ایک لفظ لائے بغیر ان سے لپٹ گئے اور اس طرح زور زور سے سانس لینے لگے جیسے رو رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی رونا نہ آیا۔ آخر بس ہم نے دوست سے لپٹے لپٹے پھر غور کیا کہ کوئی ایسا واقعہ اچانک یاد آجائے جس پر ہم رو پڑیں۔ اتنے میں ہمیں بینک وقت کمپل سری ڈپازٹ کا خیال آیا جس کا سو اسو روپیہ داخل کرتے وقت ہمارے آنسو نکل آئے تھے۔ چناں چہ ہم اپنے دوست کو پوری قوت سے لپٹا کر ایسی آوازیں نکالنے لگے جیسے ہم رو رہے ہیں۔ ایک طرف روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں، اور دوسری طرف جب ہم زور زور سے اپنے دوست کے والد کا نام لے کر رومانی آواز نکالتے تھے تو ہمارے منہ سے کمپل سری ڈپازٹ! کمپل سری ڈپازٹ! کے علاوہ کوئی لفظ نہیں نکلتا تھا

(بشکریہ 'بیسویں صدی' دہلی)

پیامِ تعلیم کے قدردان

"...... رسالہ 'کتاب نما' میں ماہنامہ "پیامِ تعلیم" کا اشتہار میری نظر سے گزرا۔ یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ ہمارے یہاں "پیامِ تعلیم" کی کئی پرانی جلدیں موجود ہیں جن میں عمدہ عمدہ کہانیاں اور دلچسپ اور مزیدار نظموں کو پڑھ کر ہمارے ہاں کے بچے کافی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اب دوبارہ جب انھیں اس کے اجرا کی خبر ملی ہے تو وہ بے چین ہیں مجھے امید ہے کہ آپ نے اس بار بھی "پیامِ تعلیم" میں وہ ساری دلچسپیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہوں گی جو پہلے کبھی "پیامِ تعلیم" کے اندر موجود تھیں۔ میں آپ کے رسالے پیامِ تعلیم کا مہمان بننا چاہتا ہوں۔ ......"

آپ کا مخلص

[illegible]

نئی مطبوعات

مثنوی گلزار نسیم	مرتبہ رشید حسن خاں	دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۱۳۶	۱/۵۰
میر انیس (بچوں کے لیے)	محمد حسین حسان	" " " "	۸۰	۱/۲۵
پردۂ غفلت (تازہ ایڈیشن)	ڈاکٹر سید عابد حسین	" " " "	۷۲	۱/-
اردوئے معلیٰ قائم نمبر	مرتبہ خواجہ احمد فاروقی	" یونی ورسٹی	۲۳۴	۵/-
ترجمان القرآن جلد اول	مولانا آزاد	" ساہتیہ اکیڈمی	۵۶۶	۲۲/-
تاریکیوں کے بعد (ناول)	زلیخا حسین	" اہلو والیہ بک ڈپو	۲۳۶	۴/۷۵
بوڑھی چیٹربل (")	مخمور جالندھری	" " " "	۲۱۴	۴/۵۰
چمگادڑ (")	" "	" " " "	۱۴۴	۳/-
نیا نو دن (")	راشد سہسوانی	" خرام پبلشنز	۳۰۴	۵/۷۰
غم دیدۂ مستقل (")	انیس مرزا	" " "	۲۲۴	۴/۵۰
اسلام اور عورت	مولانا محمد مظہر الدین	" " "	۲۱۲	۳/-
رسالت مآب	رئیس احمد جعفری	" " "	۳۳۶	۶/-
مثنوی سحر البیان ایک تہذیبی مطالعہ	رضیہ سلطانہ	" کتاب بھون	۲۲۴	۴/-
حاذق نیا ایڈیشن	حکیم محمد اجمل خاں	" ہندوستانی دواخانہ	۴۲۴	۸/-
غزلستان کلیات جلد اول	فراق گورکھپوری	الہ آباد، ساہتیہ کلا بھون	۱۷۰	۶/-
شبستان " " دوم	" "	" " "	۲۰۲	۶/۵

زیر طبع

فاصلے (غزل)	شوق عصری	رام پور، شوق عصری، خسرو باغ	۱۶	۳/-

سلیمان اطہر جاوید صاحب

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ اردو جناب ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی زیر نگرانی "رشید احمد صدیقی کی حیات اور تخلیقات" کے موضوع پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ریسرچ کر رہے ہیں اس سلسلے میں سلیمان صاحب کو رشید صاحب کے خطوط کی ضرورت ہے اگر آپ حضرات اس سلسلے میں مدد فرما سکیں تو سلیمان صاحب شکر گزار ہوں گے (ادارہ)

پتہ: سلیمان اطہر جاوید
۱۳۹ مستعد پورہ،
حیدرآباد ۶ A.P.

شرابِ کہنہ

سُرُور

۱۸۷۳ء ———— ۱۹۱۱ء

نام درگا سہائے، تخلص سُرُور۔ پیدائش، قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت (اتر پردیش) ان کے والد حکیم پیارے لال قصبے کے مشہور طبیب اور وہاں کے رئیسوں میں سے تھے۔

سُرُور نے مقامی اسکول سے مڈل پاس کیا اور اپنے طور پر انگریزی کا مطالعہ کرکے اس زمانے کے انٹرنس تک کی استعداد بہم پہنچا لی تھی۔ مولوی سید کرامت حسین بہار سے فارسی پڑھی اور شعر و سخن میں بھی انھیں سے اصلاح و مشورے حاصل کرتے رہے۔ پہلے وحشت اور پھر سرور تخلص اختیار کیا۔ کچھ دنوں بجنور میں ایک رئیس زادے کے معلم رہے۔ دو تین سال تک رسالہ زمانہ کان پور کے دفتر میں کام کیا اس کے بعد وطن چلے آئے اور کہنے کے لیے مطب بھی شروع کر دیا تھا۔

نہایت حسّاس اور فکرِ شعر میں غرق رہنے والے کو پہلے اپنی رفیقۂ حیات کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا، اس کے بعد سات سال کے اکلوتے بچّے کا داغِ مفارقت ایک طرف یہ پیہم آلام، دوسری طرف مے و مینا کا شغل اور رفتہ رفتہ اس کی کثرت، نتیجہ ان دونوں کا جان لیوا ثابت ہوا۔

مرنے سے کچھ دنوں پہلے امراض کی شدّت کے سبب مے نوشی میں احتیاط برتنے کی کوشش کی جاتی تھی، ایک روز طلب اور تقاضے پر ملازم نے گلاس میں پانی بھر کے دے دیا۔ اس کی اس حرکت کو بھانپ گئے، مسکرائے اور برجستہ فرمایا ؎

بجائے مے، دیا پانی کا اک گلاس مجھے　　سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے

لاابالی اور رند مشرب ہونے کے باوجود سرور بہت سی انسانی خوبیوں کے مالک تھے۔ خلق و مروت، وضع داری اور وسیع النظری میں آخری دم تک کوئی کمی نہیں ہونے دی۔ لوگوں نے بارہا انھیں دھوکے دیے، مختلف بہانوں سے ان کا بیش قیمت کلام حاصل

کیا اور نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ اس کو اپنے نام سے منسوب اور شائع کیا۔

کلام کے دو مجموعے "خمخانۂ سرور (زمانہ پریس کان پور) اور "جامِ سرور" (لاانڈین پریس الہ آباد سے) شائع ہو چکے ہیں۔ یوں تو تمام ہی اصناف میں انھوں نے دادِ سخن دی ہے۔ مگر ان کے کمالات اور خوش گوئی کا اظہار زیادہ تر ان کی نظموں سے ہوتا ہے۔ سرور ایک فطری شاعر تھے، انھوں نے قدیم شاعری کا غائر مطالعہ کیا تھا اور جدید رجحانات کو بھی آنکھ کھول کر دیکھنے اور کامیابی کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے درد و اثر ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ جذبات نگاری پر وہ حاوی تھے۔ حب الوطنی سے ان کا دل معمور تھا۔ ہندوستان کی تاریخی کہانیوں اور مذہبی روائتوں کو بڑے لطف اور اعتماد کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔ اردو اشعار میں ٹھیٹھ ہندی اور سنسکرت الفاظ بڑی خوبی سے استعمال کیے ہیں۔ چند انگریزی نظموں کو اردو کا جامہ پہنانے میں بھی اپنی طبع رسا کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ انھیں کمالات اور محاسن کی بنا پر اردو کے ممتاز اور سربرآوردہ شعرا میں سرور کا شمار ہوتا ہے۔

انتخاب:

خاکِ وطن

جب تمدن کا بندھا عالم میں شیرازہ نہ تھا
شاہدِ قدرت نے جب رُخ پر ملا غازہ نہ تھا

[illegible] اوراق کے
تھے وہ لئے خاکِ وطن، ذرے تمہیں کی خاک کے

کھینچ کر جذبہ جو لایا گھر سے بابر کو ترا
لے اڑا یونان سے سودا سکندر کو ترا

چوٹیاں اب بھی ہمالہ کی وہی ہیں سربلند
پھینکتی ہیں اب بھی کرنیں چاند سورج کی کمند

تازگی اب بھی ہے تجھ پر سر بسر چھائی ہوئی
ولولوں میں دل کے پستی ہے مگر چھائی ہوئی

بندے ماترم

یہ تبسم ہائے شیریں یہ ادائے جاں نواز
آہ یہ شفقت بھری تیری صدائے [illegible]

سبزۂ خود رو کا گہوارہ ہے تیری سرزمیں
تحفۂ [illegible] ہے تیری [illegible]

آسماں کے نور [illegible]
خاک [illegible]

گنگا جی

اے آبِ رودِ گنگا! اُف ری تری صفائی　　یہ تیرا حسنِ دلکش! یہ طرزِ دلربائی
مینو سواد تجھ سے ہیں، وادیاں ہماری　　اور کشتِ آرزو ہے، رشکِ جناں ہماری
وہ دن بھی ہوگا، ہوں گے جب ہم غریقِ رحمت　　اور تیری نذر ہوں گی یہ ہڈیاں ہماری
گنگا میں پھینک آنا، بعدِ فنا اٹھا کر　　برباد ہو نہ مٹی او آسماں ہماری
یارب نہ دفن کر کے احباب بھول جائیں　　لے کر ہمارے خوش خوش گنگا کو پھول جائیں

شفقِ شام

سکوتِ شام میں ہے جلوۂ بہارِ شفق　　کنول کے پھول ہیں یا زینتِ کنارِ شفق
سوادِ شام کا منظر وہ چشم پرخوں میں　　وہ شب کو نیند نہ آنا وہ انتظارِ شفق
دکھاؤں کھول کے جی، ہیں بہار داغ جگر　　زمیں پہ تو اتر آئے جو لالہ زارِ شفق
سرورِ شام جوانی بھی ہو گئی آخر　　گئی نہ حسرتِ صہبائے خوشگوارِ شفق

نیرنگِ زمانہ

وہ بزم ہے، نہ وہ ساقی، نہ وہ مئے گل رنگ　　وہ ساز ہے، نہ وہ مطرب، نہ شورِ نغمۂ چنگ
یہ سادگی نے کیا خونِ رنگِ آرائش　　کہ مہندی پھیکی ہے، لاکھا ہے پان کا بدرنگ
لباسِ ملک میں ہے اب، نئی تراش خراش　　رہے نہ اگلے سے قطع و برید کے وہ ڈھنگ
سبق پڑھایا ہے تعلیم نے ہمیں الٹا　　اٹھا کے طاق پہ رکھ دی ہر عقل کی فرہنگ

معرکۂ عشق

دخترِ اک والئ قنوج کی تھی ماہ جبیں　　پیکرِ حسنِ خداداد و سراپا تمکیں
شہ نے جب دیکھا کہ ہے قابل شادی دختر　　چولی دامن کا تعلق ہوا منظورِ نظر
اُس زمانے میں جو تھی رسمِ سوئمبر کی نمود　　منعقد کی شہِ ذی جاہ نے اک بزمِ سرود

جلوہ افروز مگر راجۂ دہلی نہ ہوا — قیس آشفتہ پے غیرت لیلیٰ نہ ہوا
تاج دہلی کی جو منظورِ نظر تھی تشہیر — سرِ محفل یہ دیا حکم کہ شہ کی تصویر
صفِ خدام میں استادہ ہو دربار میں کر — انجمن میں نہ رہے زیبِ شبستاں ہوکر
ناگہاں بزم میں آیا نظر اک شعلۂ طور — یعنی خلوت سے برآمد ہوئی وہ غیرتِ حور
ہاتھ میں ہار لیے رشکِ گلستاں ہوکر — آئی وہ آفتِ جاں فتنۂ دوراں ہوکر
نگہِ ناز سے اک ایک جواں کو تاکا — اک نشانے سے ہزاروں دل وجاں کو تاکا
نظر آیا نہ مگر عقد کے قابل کوئی — کرسکا آہ! نہ صیاد کو بسمل کوئی
پھر گئی چشم سیہ گردشِ قسمت ہوکر — کر رہا ہار وہ تصویر کی زینت ہوکر

باقی اشاریہ

خوشی ہے کہ بمبئی میونسپل کارپوریشن نے مکتبہ جامعہ کے اس تعاون کو کافی سراہا اور بالخصوص ہماری بمبئی برانچ کے انچارج جناب شاہد علی خاں صاحب کی مدد کو تو بہت ہی سراہا گیا۔ مکتبہ جامعہ کی طرف سے جو نمائش لگائی گئی وہ تین کمروں پر مشتمل تھی۔ نمائش میں شرکت کرنے کے لیے تاباں صاحب کے P.A. جناب مجیب احمد خاں صاحب بھی خاص طور سے دہلی سے بمبئی تشریف لے گئے تھے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ اس نمائش کی تفصیل کتاب نما کے اگلے شمارے میں شائع کرسکیں۔

کتاب نما کے گزشتہ شمارے میں ہم نے غلطی سے لکھ دیا تھا کہ جناب رشید حسن خاں صاحب کی مرتبہ "باغ و بہار" کا روسی زبان میں ترجمہ ڈاکٹر ظفر رئیس صاحب کررہے ہیں۔ دراصل یہ ترجمہ ماسکو کے بدیشی اشاعت گھر کے اردو سیکشن کے ڈائرکٹر جناب طاہر ابرا ہیموف کررہے ہیں جنھیں مکتبہ جامعہ کا مطبوعہ نسخہ ڈاکٹر ظفر رئیس صاحب نے پیش کیا تھا۔

ہم اس فروگزاشت کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اس کی تصحیح فرمالیں۔

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دُو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

باغ وبہار

مرتبہ : رشید حسن خاں
صفحات : ۲۸۴ ، سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت : دو روپے
پبلشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. جامعہ نگر، نئی دہلی

بیسویں صدی کے اردو شاعروں میں غالب واحد خوش نصیب شاعر ہیں جن کے کلام کا صحیح متن ملتا ہے۔ ورنہ کوئی نظم اور نثر ایسی نہیں ہے جس کی ترتیب میں متنی تنقید کے اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہو۔ اس لیے آج یہ کہنا تقریباً ناممکن ہے کہ شاعروں کے کلام کا جو متن ہم تک پہنچا ہے اس میں اور اصل میں کتنا فرق ہے۔ اُردو ادب کی اس سے بڑی اور کیا بدنصیبی ہوگی کہ میرؔ اور سوداؔ جیسے عظیم شاعروں کے کلیات بھی ہماری بے اعتنائی کے شکار ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب کچھ متنی نقاد پیدا ہو رہے ہیں جنھوں نے اس طرف توجہ کی ہے۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کارِ خیر کا بیڑہ رشید حسن خاں نے اٹھایا ہے اس تعمیری کام میں ان کی مشغولیت سے بہت سے ایسے لوگ خدائے برتر کا شکر ادا کریں گے جو ان کی تخریبی اور اکھاڑ پچھاڑ کی کارروائیوں کے شکار رہے ہیں۔ خان صاحب کا ارادہ ہے کہ وہ اردو کی بارہ کتابیں مرتب کریں۔ باغ و بہار اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اور دیا شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم پریس میں ہے۔

خان صاحب نے باغ و بہار کے سب سے پہلے اڈیشن کو بنیاد بنایا ہے۔ یہ اڈیشن ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ سب سے پہلا اڈیشن ہونے کے علاوہ اس نسخے کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ خود میر امن کی نگرانی میں چھپا تھا۔ باغ و بہار کا ایک اڈیشن ڈنکن فاربس نے ۱۸۴۹ء میں مرتب کیا تھا۔ جو لندن سے

شائع ہوا تھا۔ اس کا طبع چہارم بھی خان صاحب کے پیش نظر رہا ہے۔
یہ اردو کی پہلی نثری کتاب ہے جس کی ترتیب میں اتنی محنت اور جاں فشانی کی گئی ہے۔ اور اس قدر تحقیق و تدقیق سے کام لیا گیا ہے۔ جن الفاظ کے تلفظ میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تھی۔ اُن پر بڑی احتیاط سے اعراب لگائے گئے ہیں۔ لیکن مرتب نے یہ نہیں بتایا کہ ان اعراب کے سلسلے میں انھوں نے کن اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ مثلاً ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ میر امن کے زمانے میں "لاَہل" بولا جاتا تھا۔ اور "لاُہل" نہیں۔ تلفظ کے تعین میں لغتیں ہماری مدد نہیں کر سکتیں۔
کتاب کے آخر میں بعض مشکل الفاظ اور متروکات کی فرہنگ مرتب کی گئی ہے۔ یہ اُن رسمی فرہنگوں میں نہیں جو عام طور پر ایسی کتابوں کے آخر میں جوڑ دی جاتی ہیں۔ بلکہ مرتب نے مختلف لغتوں کی مدد سے صحیح معنوں کا تعین کیا ہے۔
مکتبہ جامعہ بھی ہمارے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے اتنی خوب صورت کتاب شائع کی۔ اور پھر قیمت اتنی معمولی رکھی۔

(ڈاکٹر) خلیق انجم

تلامذۂ میر

(سن اشاعت ۱۹۶۵ء)

از: امداد صابری
صفحات: ۱۱۰، سائز $\frac{20\times 30}{16}$
قیمت: ۱/۲۵
ناشر: افقرا اکاڈمی، چوہڑ ہرپال راولپنڈی
ملنے کا پتا: مولانا امداد صابری ۷۰ ۲۶ چوڑی والان - دہلی

میر تقی میر کی عظمت اور ان کے مرتبۂ شاعری کے سب ہی قائل ہیں اردو کے اس منفرد شاعر نے اپنی استادی کا لوہا ہر دور کے ہر بڑے استاد سے منوایا ہے۔ کچھ ایسے خوش قسمت بھی گزرے ہیں جن کو مرکز فکر و سخن سے براہ راست فیض و اکتساب کے مواقع میسر آئے اور یہی لوگ رواج یا اصطلاح کے مطابق آج ان کے زمرۂ تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔
میر کی مدت شاعری اور کلیات کی ضخامت کے پیش نظر یہ خیال ہوتا ہے

گر ان کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچی ہوگی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ان کی کم آمیزی اور نازک مزاجی نے اس معاملے میں بھی ان کو محدود اور محتاط ہی رکھا۔

جہاں تک ان کی شخصیت اور شاعری کا تعلق ہے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر کوئی ایسی کتاب جس سے ان کے شاگردوں کی صحیح تعداد اور ان کے بارے میں دوسری ضروری باتیں معلوم ہوسکیں اب تک ہمارے سامنے نہیں تھی۔ ایک عظیم شاعر کی سیرت اور کار گزاریوں کا یہ پہلو تشنہ اور نامکمل رہ جاتا اگر مولانا امداد صابری صاحب اس طرف توجہ نہ فرماتے۔

عرض مولف کے تحت من جملہ اور ضروری اور دلچسپ اشاروں کے، سودا کے شاگردوں کی فہرست، ان کے علاوہ لطف، بیمار، کلیم اور ہدایت کے بارے میں میر کی شاگردی کی تردید۔ عام معلومات میں اضافے کا سبب ہیں۔

میر کے جن شاگردوں کا اس کتاب میں ذکر ہے ان کی مجموعی تعداد ۳۴ ہے۔ جن میں جان، جگن، مبتلا اور نیاز کے صرف ایک ایک شعر اور مظلوم کی تاریخ وفات نقل کردینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ باقی جن شاعروں کے حالات اور کلام زرا تفصیل کے ساتھ درج ہیں ان میں پروانہ، راقم، راسخ، مشتاق اور عیش وغیرہ ہیں۔ ترتیب میں حروف تہجی کا لحاظ اور کلام یا شخصیت پر اظہار خیال کے لیے فارسی کے مشہور تذکرہ نگاروں کے اقوال اور عبارتیں درج کردی گئی ہیں

جمع و ترتیب کا یہ مشکل مرحلہ تو طے ہوگیا۔ لیکن اس نوعیت کا کام کرنے والوں کے لیے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ کتاب زمانۂ حال کی ضروریات نیز جدید اسلوب تذکرہ نگاری کے مطابق ایک بہتر شکل دی جائے ——— ایسی کتابوں کی لکھائی چھپائی کا معیار بھی اتنا معمولی نہ ہونا چاہیئے۔

رشید نعمانی

آبگینہ

از: سید محمد ٹونکی

(سن طباعت ۱۹۶۵ء)

صفحات: سائز: ۲۰×۳۰/۱۶

قیمت: ۱/۱۵

ملنے کا پتہ: نیلی چھتری علی گڑھ، نیا کتاب گھر علی گڑھ

بالکل انجان علاقہ یعنی راولپنڈی کے ماموں جی اسلامیہ ہائی اسکول میں ہوا...... دسمبر ۱۹۲۶ء میں میرا تقرر مسلم یونی ورسٹی اسکول علی گڑھ میں ہوا......"۔ پھر وہ علی گڑھ کے ہی ہو کر رہ گئے۔ ابھی حال ہی میں یونی ورسٹی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ملازمت کو تمت بالخیر کہا ہے۔

آبگینہ کا آغا انہوں نے دورانِ علالت میں کیا اور وہ بھی اس احساس کے ساتھ کہ "معلوم نہیں زندگی کا سفر کب ختم ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آخری عرضِ نیاز سے محروم رہوں۔ ہمت کر کے شروع تو کر ہی دوں۔ کچھ تو پیش کر ہی دوں گا"۔ بحمداللہ وہ صحت یاب ہو گئے اور یہ ستّر کے قریب صفحات ہمارے سامنے ہیں۔ ان صفحات میں کچھ یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ بچوں سے ملاقات کی یادیں۔ ان کے معاملات اور واقعات کی یادیں۔ لیکن ہر یاد میں ایک بات ہے اور ہر بات میں ایک یاد۔

"آبگینہ" میں خلوص کی آب داری اور محبت کی پائیداری جھلملا رہی ہے۔ مزید برآں ایک ایک جملہ بیان کی سادگی، طبیعت کی انکساری اور استاد کی بالغ نظری کا مظہر ہے۔ ٹونکی صاحب ایک دھان پان سے شگفتہ طبع انسان ہیں لیکن آیئنِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی، کا زندہ جاوید نمونہ، بچوں کے شیدائی، پیشہ معلمی کی آبرو، آبگینہ کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جیسے معلم و مدبّر کی یہ رائے ہے کہ "آبگینہ کی ہر سطر میں ایک اچھے استاد کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تعلیم کا کام کرنے والے اسے پڑھیں گے تو اپنے دشوار اور کبھی کبھی ہمت شکن کام میں ان کی ڈھارس بندھے گی اور وہ پھر تازہ دم ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو جائیں گے"۔

ذاکر صاحب کے ان کلمات کے بعد ٹونکی صاحب اور آبگینہ کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بس ٹونکی صاحب سے اتنی درخواست ہے کہ آبگینہ پیش کر کے وہ اپنے آپ کو اپنی ذمہ داری سے کسی طور سبک دوش نہ خیال کریں۔ خدا کرے ان کی صحت اچھی رہے اور وہ اپنے دورانِ معلمی کے تاثرات بھرپور طریقے پر پیش کر کے جلد ایک کہکشاں بنائیں۔

عبداللہ ولی بخش قادری

مصنف :- عزیز احمد قاسمی

بنیادی اسالیب بیان

صفحات : ۱۲۰   سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت : ۱/۵۰
(سن اشاعت ۱۹۶۴ء)
پتہ : کمال بک ڈپو، دیوبند۔ ضلع سہارنپور

اسلوب کا تعلق طرزِ ادا سے ہے ۔کسی ادیب کی انفرادیت کا پتہ اس کی طرزِ تحریر سے لگایا جاتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ صاحب طرز ادیبوں کی تحریریں ان کے اپنے اسلوب کے باعث جن میں ایک الگ اور نمایاں شان ہوتی ہے، فوراً پہچان لی جاتی ہیں ۔

صاحب طرز ادیب یا مصنف کوئی کیسے بن سکتا ہے اس کے لیے کوئی بندھی ٹکی بات کہنا آسان نہیں ہے البتہ اسلوب کتنے قسم کے ہوتے ہیں ۔کسی اسلوب کو کیسے برتا جائے جو لوگ ادبی تنقید کے اس پہلو سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کا مطالعہ کر کے اس سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے "بنیادی اسالیب بیان" بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے ۔

اردو میں موضوعاتی کتابوں کی ویسے ہی بڑی کمی ہے اس اعتبار سے بھی یہ ایک بڑی اچھی کوشش ہے ۔مصنف نے انگریزی کی بیس پچیس کتابوں سے مدد لے کر کتاب کو زیادہ سے زیادہ مفید۔ جامع اور وقیع بنانے کی طرف توجہ دی ہے ۔ نیز چوٹی کے اردو شاعروں اور ادیبوں کے کلام سے مثالیں دے کر اس کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر اتنی تفصیل سے جتنا مواد فراہم کیا گیا ہے اتنا یکجا طور پر کسی دوسری جگہ مشکل ہی سے مل سکے گا ۔

اسی کے ساتھ ساتھ مصنف نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ یہ اپنے طرز کی انوکھی کتاب ہے، نیز ایسی کتاب عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی میں بھی نہیں پائی جاتی ۔جو محل نظر ہے اور اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے ۔اس کے باوجود یہ کتاب اس قابل ضرور ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے ۔یقین ہے کہ علمی و ادبی حلقے مصنف کی اس محنت کی قدر کریں گے اور ان کی سعی مشکور ہو گی ۔

کاغذ، لکھائی، چھپائی مناسب ہے اور قیمت بھی زیادہ نہیں ہے ۔

(محمد الحسن رضوی)

ادبی خبریں

ہندوستان میں کتابوں کی اشاعت کلکتہ ۱۸ ر جولائی سال گزشتہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں ہندوستان میں شائع کی گئی کتابوں کی تعداد میں ۴ ر ۱۳ فی صدکی واقع ہوئی۔ گزشتہ برس تمام زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کی مجموعی تعداد ۲۱۲۶۵ تھی جب کہ ۶۴-۱۹۶۳ء میں ۲۴۵۶۹ کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ سب سے زیادہ کتابیں دہلی میں شائع کی گئیں یعنی ۵۰۴۸ بلحاظ زبان سب سے زیادہ کتابیں انگریزی زبان میں شائع ہوئیں یعنی ۱۰۴۳۵۔ اردو میں ۳۵۲ کتابیں شائع ہوئیں یعنی اردو میں پہلے کے مقابلے میں ۷ ر ۴ فی صد کا اضافہ ہوا۔ یہ معلومات پبلک لائبریری ایکٹ ۱۹۵۴ء کے تحت نیشنل لائبریری کلکتہ میں موصول ہونے والی کتابوں کی تعداد کی بنیاد پر بہم پہنچائی گئی۔ (قومی آواز سے اقتباس)

کلیات سوداؔ کی ترتیب و تدوین ۱۶ ر اگست ۶۵ء کو بزم ادب کروڑی مل کالج دلی یونی ورسٹی کی ایک خصوصی میٹنگ زیر صدارت ڈاکٹر خلیق انجم صدر شعبۂ اردو منعقد ہوئی۔ جس میں سالِ رواں کی ادبی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ بزم ادب کی جانب سے کلیات سوداؔ کی ترتیب و تدوین کا کام سب سے پہلے کیا جائے جو ایک پائیدار اور جامع صورت میں ہو۔ اس مقصد کے لیے چھ حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل دے کر کام کے آغاز کے لیے ترتیب وار عنوانات کی تقسیم کی گئی۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دلی یونی ورسٹی نے اس کا پیش لفظ لکھنا منظور فرمالیا ہے۔ (کامل قریشی)

سستی کتابیں 'کتاب کار رام پور یو، پی' نے مہنگی کتابوں کے سستے ایڈیشن شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا سیٹ جس میں ۷ دلچسپ اور معیاری کتابیں شامل ہیں بہت جلد شائع ہو رہا ہے یہ کتابیں مکتبہ جامعہ سے مل سکیں گی۔

سالانہ ایک روپیہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵	فی پرچہ ۱۰ پیسے

پرنٹر پبلشر [illegible] نے [illegible] پریس [illegible] دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

کچھ اچھی کتابیں

افسانے

بیس غیر مطبوعہ کہانیاں	منٹو	۱/۵۰
خیالستان	سید سجاد حیدر یلدرم	۳/۷۵
دو ہاتھ	عصمت چغتائی	۲/۵۰
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۲/۷۵
دیا جلے ساری رات	خواجہ احمد عباس	۲/۵۰
زندگی کے کھیل	صالحہ عابد حسین	۲/۵۰
سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	۲/-
کیمیاگر	پروفیسر محمد مجیب	۲/-
کالے صاحب	اوپندر ناتھ اشک	۲/۵۰
کائناتِ تبسم	شوکت تھانوی	۲/۵۰
کھوکھلے انبار	م۔م۔ راجند	۲/-
نروان	جیلانی بانو	۴/۷۵



جیلانی بانو ۱۹۳۶ء میں یوپی
کے ضلع بدایوں میں پیدا ہوئیں
مگر بچپن ہی سے حیدرآباد میں
مقیم رہیں۔ ۱۹۶۰ء میں
عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے
ایم اے کر رہی ہیں۔ ۱۹۵۲ء سے لکھنا شروع کیا۔ پہلی کہانی
"ادب لطیف" لاہور میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد سے برابر
افسانوں کے علاوہ ریڈیو اور اسٹیج کے لئے ڈرامے اور اخباروں
کے لئے مزاحیہ اسکیچ لکھتی رہتی ہیں۔ آپ کی کہانیاں ہندوستان
کی تقریباً سبھی زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

۶۰ء میں آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی نے ادبی خدمات
کے اعتراف میں انعام دیا۔ تعلیم کے ساتھ لکھنے لکھانے کا شغل
برابر جاری ہے۔

مکتبہ جامعہ فخر کے ساتھ آپ کے افسانوں کا دوسرا
مجموعہ نروان کے نام سے شایع کر رہا ہے۔

نگراں
غلام ربانی تاباں

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی

ایڈیٹر
برہان احمد عباسی

جلد نمبر ۶ | اکتوبر ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۱۰

اشاریہ

۲۹ اکتوبر کو جامعہ کا "یوم تاسیس" ہے۔ ۴۵ سال پہلے ۱۹۲۰ء کی اسی تاریخ کو جامعہ کی بنیاد پڑی تھی۔ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا آزاد، مولانا حسرت موہانی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن جیسی مایہ ناز اور عظیم المرتبت ہستیوں کے مبارک ہاتھوں نے اسے بنایا تھا۔ آج کی جامعہ اپنے ان ہی مقتدر بانیوں کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

جامعہ کا سالانہ سہ روزہ تعلیمی میلہ، جس میں مختلف تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ جامعہ کی جدوجہد سے پُر طویل کہانی، اس کی علمی سرگرمیوں اور تعلیمی تجربوں کی نمائش بھی کی جاتی ہے۔ ہر سال عموماً یوم تاسیس کے موقع پر ہی ہوا کرتا ہے۔ اس سال بھی میلے کے لئے ۳۰ اکتوبر، ۳۱ اکتوبر اور یکم نومبر کی تاریخیں مقرر ہوئی ہیں۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی میلے کے بازار میں مکتبہ کا اسٹال ہوگا۔ مکتبہ جامعہ کی طرف سے جامعہ کے دوسرے تعلیمی پروگراموں کی طرح "فن اور فن کار" کے نام سے جو علمی پروگرام پیش کیا جاتا رہا ہے وہ بھی حسب سابق اس بار ۳۱ اکتوبر کو اتوار کے دن ۳ بجے شام کو شروع ہوگا۔ ہم کوشش کریں گے کہ کتاب نما کے اگلے شمارے میں اس پروگرام کے بارے میں کچھ وضاحت سے بتا سکیں۔

ہم نے کتاب نما کے پچھلے شمارے کے اشاریے میں بمبئی میونسپل کارپوریشن کی طرف سے منعقد کئے گئے بُک فیئر کے بارے میں ذکر کیا تھا۔ ہم اپنے وعدے کے مطابق اس فیئر سے متعلق ایک مختصر مضمون اس شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔ اُمید کہ قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔

کچھ عرصے سے مکتبہ جامعہ نے جامعہ ملیہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر جامعہ اسٹور کے پاس ایک [illegible] کی دکان صرف جامعہ کے مختلف شعبوں، اساتذہ اور طلباء کی [illegible] کی ہوئی [illegible] سے بعض لوگ اس سے مستفید ہو رہے [illegible]

ریحان احمد عباسی

بک فیئر

پبلک لائبریری ایکٹ کے تحت نیشنل لائبریری کلکتہ میں موصول ہونے والی کتابوں کی تعداد کی بنیاد پر جو اندازہ لگایا گیا ہے اس کے مطابق گزشتہ سال (۶۵-۱۹۶۴ء) مجموعی طور پر ہندوستان میں شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد میں ۴ء۱۳ فی صد کی کمی واقع ہوئی ہے۔ لیکن دوسری طرف انفرادی طور پر اردو زبان میں شائع ہونے والی کتابوں میں بجائے کمی کے پہلے کے مقابلے میں ۷ء۴ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ اردو کے بہی خواہ اور ہمدردوں کے لئے یہ واقعی بہت خوشی کی بات ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو میں یہ اضافہ زیادہ تر سستے لٹریچر کی اشاعت کی وجہ سے ہوا ہے، معقول اور معیاری کتابیں یقیناً پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ شائع نہیں ہوئی ہیں۔

اردو کو فروغ دینے کے سلسلے میں بہت سی سوسائٹیاں اور ادارے اپنے بس بھر کوشش کر رہے ہیں اور اردو کے تحفظ اور بقا کے لئے اپنے اپنے طریقوں سے نہایت کامیاب خدمات انجام دے رہے ہیں اور حالات کو دیکھتے ہوئے بہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اردو دوستوں کی ان کوششوں اور لگن سے بڑے دوررس اور خوش آئند نتائج نکلیں گے۔ ابھی حال میں بمبئی میونسپل کارپوریشن کی طرف سے اردو کتابوں کی جس نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا وہ بھی اسی طرح کے اہم سلسلوں کی ایک کڑی ہے۔ کتابوں کی نمائش "بک فیئر" جسے بمبئی کی علمی اور تہذیبی زندگی میں "سنگِ میل" کے نام سے پکارا گیا ہے، ہر لحاظ سے قابلِ ذکر اور قابلِ تعریف ہے۔

اردو کتابوں کا یہ حسین "جگ نیر" بمبئی میونسپل کارپوریشن کے محکمہ تعلیم کے اردو سیکشن کی طرف سے بمبئی کے امام باڑہ میونسپل گرلز اسکول میں منعقد کیا گیا تھا یہ فیئر ۲۰ اگست سے ۲۰ اگست تک رہا مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس فیئر میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت فرمائی اور جناب غلام ربانی صاحب تاباں کے پی اے جناب مجیب احمد خاں صاحب بھی شرکت کے لئے خاص طور سے دہلی سے بمبئی تشریف لے گئے۔

نمائش میں جانے کے لئے اسکول کا دائمی گیٹ بڑے خوبصورت طریقے سے [illegible]

اس کا نام رکھا گیا تھا "بابِ تعلیم" کتابوں کی نمائش اور اسکولوں کی مناسبت سے یہ نام بہت ہی موزوں تھا۔ یہ نمائش جس میں کارپوریشن کے تعلیمی بمبئی کے پبلشرز، ٹیچرس اور طلبا کا اشتراک شامل تھا ۲۰ اگست کی شام تک سجا کر تیار ہو گئی تھی۔ ۲۰ اگست کی شام کو ۶ بجے میونسپل کارپوریشن کی ایجوکیشن کمیٹی کے چیرمین جناب علی محمد سمین صاحب نے اس کا افتتاح فرمایا۔ نمائش میں جانے کے لئے جن روشوں سے گزرنا پڑتا تھا وہ خوشنما چارٹوں اور نقشوں وغیرہ سے سجائی گئی تھیں جگہ جگہ بہت سے اشعار بھی لکھ کر لٹکائے گئے تھے۔ کتابوں کا یہ میلہ اسکول کے چودہ کمروں میں لگایا گیا تھا جن میں سے تین بڑے کمروں میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی بمبئی برانچ نے مکتبہ کی جدید علمی، ادبی اور معلوماتی کتابوں کی نمائش کی تھی اور مختلف چارٹس کے ذریعہ اپنے تعلیمی تجربے کا ایک مختصر سا خاکہ بھی پیش کیا تھا۔ مکتبہ کے علاوہ علوی بک ڈپو، صدر لقیہ بک ڈپو اور نیا اردو کتاب گھر نے بھی ایک ایک کمرے میں کتابوں کی نمائش کی تھی۔ اس طرح تاجران کتب پر مشتمل ان چھ کمروں میں مختلف موضوعات پر مختلف شکل و صورت مختلف گیٹ اپ اور مختلف رنگ و انداز کی حسین و جمیل کتابوں کا ایک دلکش بازار سجا دیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ بقیہ آٹھ کمرے جن میں ایک ماڈل روم اور ایک ریڈنگ روم بھی شامل تھے اسکول کے طالب علموں اور معلموں کے مرہونِ منت اور ان کے ستھرے ذوق کے آئینہ دار تھے۔ ان کمروں میں خاص طور سے شعراء، ادبا اور افسانہ نگاروں کے جستہ جستہ حوالے اور تعارف پیش کئے گئے تھے وہ اپنی مثال آپ تھے اور انھیں دیکھنے کے بعد اربابِ انتظام کے سلیقے اور حسنِ شعور کو داد دینے کو بے اختیار جی چاہتا تھا۔ نمائش میں کچھ اہم کمیاب کتابیں بھی رکھی گئی تھیں اور ہندوستان سے شائع ہونے والے مختلف اردو رسائل و اخبارات اور ان کے خاص نمبر بھی موجود تھے۔ جو نمائش کی افادیت میں مزید اضافہ کا باعث بن گئے تھے۔ مکتبہ جامعہ نے بھی خاص طور سے اس نمائش کے لئے "کتاب نما" اور "پیام تعلیم" کے مخصوص ضمیمے شائع کئے تھے۔

نمائش کے افتتاح کے بعد ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ایجوکیشن آفیسر داؤد شاہ صاحب، ڈاکٹر علی محمد سمین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب اور اردو اسکولوں کے سپرنٹنڈنٹ جناب اے اے فاروقی صاحب نے تقاریر فرمائیں۔

جلسے کا آغاز ننھی منّی بچیوں نے ایک "استقبالیہ نظم" پڑھ کر کیا۔ اس کے بعد داؤدی شاہ صاحب نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ "بک فیئر" کے مقصد پر روشنی ڈالی اور فیئر کی کامیابی پر منتظمین نمائش کی پذیرائی اور بالخصوص مکتبہ جامعہ اور علوی بک ڈپو کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ داؤدی شاہ

نے فرمایا"۔۔۔ میونسپل کارپوریشن کے تحت مختلف زبانوں کے اسکول کام کر رہے ہیں اور ہر زبان کو پوری پوری سہولت ہے لیکن میں یہ بات فخر کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ تمام زبانوں میں اردو زبان کے اسکول نہ صرف ترقی کر رہے ہیں بلکہ ان اسکولوں میں طلبہ وطالبات کی تعداد بھی نسبتاً زیادہ ہی ہے اردو زبان بہت خوبصورت زبان ہے۔ اس لئے سب اسے پسند کرتے ہیں۔۔۔۔"

ڈاکٹر علی محمد میمن صاحب نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح فرمایا"۔۔۔۔ مجھے "بک فیر" کا افتتاح کرنے کا موقع ملا یہ میرے لئے بڑی خوشی اور فخر کی بات ہے۔ مجھے "بک فیر" میں اچھی کتابیں دیکھنے اور تعلیم کے معیار کو جاننے کا موقع ملا۔۔۔ اس بات پر ہمیں بہت زیادہ مسرت ہو رہی ہے کہ آج بک فیر میں شرکت کرنے کے لئے معزز مہمان پدم بھوشن پروفیسر محمد مجیب صاحب خاص طور سے دہلی سے تشریف لائے۔۔۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ آج بمبئی میں پہلی بار اردو کتابوں کا میلہ لگا اور جو کسی حد تک بے حد کامیاب رہا۔۔۔۔ "بک فیر" سے طلبہ کو سب سے زیادہ یہ فائدہ ہوگا کہ انہیں اپنی پسند کے مضمون کی کتابیں دیکھنے کا سنہری موقع ملے گا اور ادب کے معماروں کو نئی پرانی کتابوں کے معیار کا اندازہ ہوسکے گا۔۔۔۔"

ڈاکٹر علی محمد صاحب کی تقریر کے بعد "بک فیر" کے خصوصی مہمان جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب نے مائک سنبھالا اور بڑے اچھے انداز میں تقریر فرمائی آپ نے فرمایا"۔۔۔ آج بک فیر میں شرکت کرکے مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ میں بمبئی میونسپل کارپوریشن کی ایجوکیشن کمیٹی کا شکرگزار ہوں کہ مجھے کتابوں کے دیکھنے کا موقع دیا۔ مجھے خوشی ہے کہ جو کام کرتے کرتے میری زندگی گزر گئی وہی کام آپ سب کر رہے ہیں ۔۔۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ بمبئی میں ہر زبان، ہر تہذیب اور ہر قوم کو ترقی کا موقع دیا جاتا ہے جب کہ یہ بات دوسرے شہروں میں نہیں پائی جاتی۔۔۔۔ بمبئی میں اردو زبان ترقی کر رہی ہے لیکن یہاں وہ مسلمانوں کی محتاج نہیں ہے بلکہ بمبئی کا ہر شہری اردو زبان کو ترقی دینے میں پیش پیش ہے۔ شمالی ہند جو اردو کی ماں ہے اور جہاں اردو کی پیدائش و پرداخت ہوئی اس وقت اردو کے لئے اجنبی ہوگئی ہے وہاں ہزاروں ایسے مسلم گھرانے ہیں جن میں اب ایک بھی اردو کا جاننے والا نہیں ہے شمالی ہند کے مسلمانوں نے بھی اردو کو چھوڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں اردو زبان ترقی نہ کرسکی۔ اس کے برعکس بمبئی میں جہاں کہ غیر اردو علاقہ ہے، اردو کی ترقی و ترویج کے لئے تمام مواقع حاصل ہیں۔۔۔۔ ہم نظام کی خرابی کا محل پر ڈال دیتے ہیں اور اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے۔ ہم کسی لیڈر یا جماعت کے پیچھے

بلکہ اپنے خدا، اپنے مذہب پر اعتقاد رکھیں اور اپنے ضمیر کو بیدار کریں۔ ہمیں اسی وقت کامیابی حاصل ہوگی جب ہم خود قدم اٹھائیں گے ..... ہر منزل تک پہنچنے کے لئے عزائم کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں حقیقتہً باہمت اور حوصلہ مند آدمیوں کو پسند کرتا ہوں یہی وہ چیزیں ہیں جو دوسروں پر اثر کرتی ہیں اور اگر وہ گمراہ ہوں تو انھیں راہ راست پر بھی لاتی ہیں .....“

مجیب صاحب کی تقریر کے بعد جناب اے۔ لے فاروقی صاحب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا: ..... ”مجھے اس پر بے حد مسرت ہے کہ آج ماہر تعلیم پروفیسر محمد مجیب صاحب اور ڈاکٹر علی محمد میمن صاحب کے علاوہ شہر کی ممتاز ہستیوں نے ”بک فیئر“ میں شرکت کی اور بمبئی کے شعرا، ادبا اور صحافی حضرات کے علاوہ تاجران کتب نے تعاون کرکے اسے کامیاب بنایا“..... فاروقی صاحب کے شکریے کے بعد اس دن کے جلسے کا پروگرام ختم ہوا۔ جلسے کے بعد مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی شاخ بمبئی کی طرف سے ایک فلم اسٹرپ دکھائی گئی جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مثالی زندگی کی تاریخ کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ فلم جامعہ ملیہ کے آڈیو ویژول سیکشن کی تیار کی ہوئی تھی۔

نمائش کے تیسرے دن ۲۲ اگست کو صبح ۹½ بجے ”بک فیئر“ کا تیسرا اور آخری سیشن ”ٹیچرس سیمینار“ شروع ہوا۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر نظام الدین گوریکر صاحب نے فرمائی۔ اس جلسے میں مختلف ٹیچرز، ماہرین تعلیم نے ٹیچرس کی مشکلات، ان کی ضروریات اور فرائض پر بحث کی۔ پروفیسر گوریکر صاحب نے میونسپل افسروں سے مطالبہ کیا کہ وہ ٹیچرس کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کریں اور اس بات کے لئے اپنی خوشی کا اظہار کیا کہ بمبئی اردو کا ایک بہت بڑا مرکز بنتا چلا جا رہا ہے ..... پروفیسر مدن موہن کالیہ صاحب نے اردو اخباروں میں بچوں کے لئے علیحدہ صفحات شائع کرنے کا مشورہ دیا ..... ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی صاحب نے اپنی تقریر میں تعلیم کے معاملوں میں سائنس کو شعری اور افسانوی ادب پر ترجیح دینے کی خواہش کا اظہار کیا ..... بمبئی کے ہر دلعزیز کارکن اور ایک پرانے جامعی جناب معین الدین حارث صاحب ایڈیٹر روزنامہ اجمل نے اس بات پر زور دیا کہ ہر کام میں امریکہ یا روس کی نقل ٹھیک نہیں۔ آپ نے کہا کہ جب بھی کام ہو وہ ٹھوس اور اچھا ہو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ کام ایک عبادت ہے اور اسے عبادت سمجھ کر کیا جائے تو ہر کام حل ہو سکتا ہے ..... بمبئی پردیش کانگریس کمیٹی کے سکریٹری مسٹر آدم نے اس خیال کا اظہار کیا کہ شاعری اور افسانہ نگاری سائنس کی تعلیم میں رکاوٹ نہیں ہے ..... آخر میں جناب اے۔ لے فاروقی صاحب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح ”بک فیئر“ کی علمی سرگرمیوں کا ایک دور ختم ہوگیا۔ البتہ کتابوں کی نمائش ۲۸ اگست تک اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر رہی اور اسے ہزاروں بچوں اور بڑوں نے بڑے شوق سے دیکھا، اسے سراہا اور اس سے مستفید ہوئے۔

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

اسرار اکبرآبادی

اہلِ وطن

اب چھوڑ دو غفلت کو ذرا ہوش میں آؤ
تم اپنے ارادوں سے ہمالہ کو ہلاؤ
ہم ایک ہیں ہم ایک ہیں یہ نعرہ لگاؤ
دشمن پہ جھپٹ کے اسے مٹی میں ملاؤ
اور خون سے تم ہند کے ماتھے کو سجاؤ
اب چھوڑ دو غفلت کو ذرا ہوش میں آؤ

آپس میں جو نفرت ہے اسے دل سے مٹادو
فرقوں کے شعلوں کو محبت سے بجھادو
بگڑے ہوئے انسان کو انسان بنادو
ہندو کو مسلمان کو یہ بات بتادو
اک راہ پہ اک ساتھ قدم مل کے بڑھاؤ
اب چھوڑ دو غفلت کو ذرا ہوش میں آؤ

چونکو! انہیں گنگا، تمہیں جمنا کی قسم ہو
جاگو تمہیں اب نند کے لالہ کی قسم ہو
مریم کی قسم ہو تمہیں رادھا کی قسم ہو
قرآں کی قسم ہو تمہیں گیتا کی قسم ہو
شیروں کی طرح بڑھ کے زمانہ کو دکھاؤ
اب چھوڑ دو غفلت کو ذرا ہوش میں آؤ

تم برف کے میدان میں اک آگ لگادو
دشمن کے ہر اک ڈیرے کو توپوں سے اڑادو
ہر ذرہ میں ہر وادی میں طوفان مچادو
پربت جو اڑے راہ میں اس کو بھی ہٹادو
ہر دیر ہو، تم ویر ہو، مخالف کو بتادو
اب چھوڑ دو غفلت کو ذرا ہوش میں آؤ

(ہندوستان جاگ اٹھا، مرتبہ عبدالقوی دسنوی [illegible] صفحہ ۳۱ [illegible])

عبدالغفار مدھولی

جامعہ کی کہانی

آٹھواں سال

اگست ۱۹۲۷ء تا جولائی ۱۹۲۸ء

جامعہ میں ڈراموں کی ابتدا کس طرح ہوئی، پڑھنے میں تو شاید دلچسپ معلوم ہو مگر غور کیجئے تو یہ ایک عجیب آغاز معلوم ہوتا ہے خیال کیجئے کہ ایک دن شیخ الجامعہ صاحب کا اعلان آتا ہے کہ تیسری جماعت کے بچے مدرسہ کے آخری گھنٹہ میں ایک نقل دکھائیں گے۔ پوری جامعہ ایک جگہ جمع ہوتی ہے۔ سرے پر ایک میز ہے جس پر سٹو، تپتیلی، گلاس اور کچھ برف رکھی ہے۔ یہ موضوع کہ "بادل کیسے بنتے ہیں اور بارش کیونکر ہوتی ہے۔" لڑکوں نے اس طرح سمجھایا جیسے کوئی سائنس کا ماسٹر چیزیں دکھا دکھا کر سمجھاتا ہو۔ درمیان میں ہنسنے ہنسانے کی باتیں بھی جاتی تھیں اس سے لڑکوں کے حوصلے بڑھے۔ وہ میرے سر ہو گئے کہ ایسی ہی نئی نئی باتیں کرو آگئے۔ میں چاہتا بھی یہی تھا اس وقت تک ہمارے ملک میں بچوں کے لیے ایک دو ہی ڈرامے لکھے گئے تھے۔ میں نے پہلی دفعہ 'قوم پرست طالب علم' کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا۔

گاندھی جی نے فرمایا تھا کہ لڑکوں کو تعلیمی کاموں میں لگا دینا چاہئیے لیکن ضرورت پڑے تو بڑے لڑکوں کو اپنے بڑوں . . . . . کا ساتھ دینے کے لیے سیاست کے میدان میں کود پڑنا چاہیئے۔ اس کو پیش نظر رکھ کر میں نے یہ ڈرامہ لکھا۔ دیکھنے والے بہت خوش تھے ہال ناکافی تھا۔ میدان میں کرنے کے لیے کئی پردوں کی ضرورت تھی لڑکوں نے خوشی خوشی چندہ اکٹھا کیا کچھ مدد جامعہ نے بھی دی عید کا زمانہ تھا کھلے میدان میں جامعہ کے تمام لوگ اور مہمان بیٹھے ہوئے تھے ان سب کے بیچوں بیچ مولانا محمد علی بھی آکر بیٹھ گئے سب سے پہلے لڑکوں نے قومی ترانہ گایا پھر ایک بڑے طالب علم کے واقعات دکھائے گئے کہ اس نے قومی جلسہ میں حصہ لیا گرفتار ہوا مولانا حسرت موہانی کی طرح جیل میں چکی پیسی رہائی ہوئی مدرسے کے لڑکوں نے دعوت دی پھر اسی لڑکے نے بڑے ہو کر ایک ہندو کی دولت کی حفاظت کی مولانا محمد علی یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے بیچ بیچ میں بلند آواز کے ساتھ کچھ تبصرہ بھی کرتے جاتے

تھے کیونکہ یہ سب باتیں ان پر بیت چکی تھیں جتنے تھے یہ لڑکے تو میری نقل کر رہے ہیں۔ اس سے لوگوں میں اور بھی دلچسپی بڑھ گئی اس ڈرامے میں لکھنؤ کے عرفان نئے قوم پرست طالب علم کا اور ستی بلی کے رفیق نے ڈاکو کا کام اچھا کیا تھا نبی احمد نے مولانا شوکت علی کی نقل کی تھی ان کا جسم [illegible] زمانے میں ایک دن کی بات ہے کسی لڑکے نے مجھ سے پوچھا ماسٹر صاحب یہ سب کچھ تو ہے [illegible] لیکن جس طرح بڑوں کے ڈرامے میں عورتوں کا پارٹ ہوتا ہے [illegible] ڈراموں میں لڑکیوں کا کام نہیں ہوتا یہ کیا بات ہے میں نے جواب دیا ہمارے مدرسہ میں لڑکیاں نہیں پڑھتیں [illegible] لیے ان کا کام نہیں رکھا گیا تو کیا ہوا ہمارے ہاں کئی لڑکے ایسے ہیں جو لڑکیوں کی نقل کر سکتے ہیں۔ ایک لڑکے نے جواب دیا یہ ٹھیک ہے۔ لیکن مردوں کی نقل مرد اور عورتوں کی نقل عورتیں کریں تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جب لڑکیاں پڑھنے لگیں گی تو ان کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ اور دیکھو ہم نے اب تک جتنے ڈرامے کیے ہیں۔ عورتوں کے کام بغیر سب ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ایک ڈرامے میں عورتوں کا کام لازمی نہیں ہے لڑکوں کی سمجھ میں بات آگئی اور معاملہ رفع دفع ہوا کام کرنے والے اپنا رنگ جمائے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں رام چندر جی اور دیو داس جی جب جامعہ میں آئے تو انہوں نے تکلی اور چرخے کو رواج دیا بعض لوگوں نے پوچھا آخر اس سے فائدہ کیا انہوں نے وہی جواب دیا جو اس کام کے کرنے والے ایک دفعہ نہیں بیسیوں دفعہ دہراتے رہنے میں اپنی خوشی سمجھتے ہیں۔ یعنی ہمارے ملک میں کام کے ذرائع ایسے نہیں ہیں جس میں سب لوگ حصہ لے سکیں کسان سال کا کچھ حصہ کھیتی کا کام کر کے باقی وقت بیکار رہتے ہیں۔ پڑھے لکھے نوجوان نوکری یا کام کی تلاش میں کئی کئی سال گذار دیتے ہیں۔ خیالی پلاؤ پکانے سے تو یہ اچھا ہے کہ کچھ نہ کچھ کرتے رہو ہاتھ سے کام کرنے کی عادت کا اور عادتوں پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے پھر یہ ایک پنتھ دو کاج ہیں یعنی ایک تو کرنے کے لیے ایک تو مفید شغل ملا دوسرے کھادی کو ترقی ہوئی بیکار رہنا پھر دوسرے ملک کے کپڑے پہننا ایسا ہی ہے کہ آدمی اپنا سب کچھ دے کر ننگا ہو جائے۔ خیر یہ سب دلیلیں نہ سہی لڑکے تو اس لیے خوش تھے کہ انھیں ایک تماشہ ہاتھ آیا جدھر دیکھو تکلیاں ہی تکلیاں نظر آتی تھیں ایسا معلوم ہوتا کہ جو کھدر پہن رکھا ہے وہ ایک فرض ہے اور اسے سوت کات کر ادا کرنا ہے۔ اُستادوں میں سید انصاری صاحب اور شفیق صاحب مرحوم تھے

اس کام کو بہت پھیلایا آج کل تو یہ بنیادی تعلیم والے اپنے تعلیمی مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اس کا ذکر استادوں کے مدرسہ کے سلسلے میں آئے گا۔ جب رام چندر جی جانے لگے تو انہوں نے الوداعی جلسہ میں فرمایا آپ صاحبان کے برادرانہ سلوک نے مجھے یقین دلایا کہ ہمارے اختلافات کی بنا محض جہالت اور ناواقفیت ہے میرا خیال ہے کہ ہندو مسلمان طالب علم [illegible] اتحاد پیدا کرنے کے لیے موضوع ثابت ہوں گے مولانا محمد علی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا جس طرح رام چندر جی نے [illegible] کی خدمت کی اسی طرح مسلمانوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ہندوؤں کی خدمت کریں کیونکہ بنی نوع انسان کی خدمت ہی اسلام کی تعلیم ہے۔ سنگکاری کو ترقی دینے کے لیے نجاری کا شعبہ قائم کیا گیا لکھنؤ کے آرٹ اسکول کے تعلیم یافتہ ماسٹر [illegible] صاحب اس کے نگراں تھے طلبا کو اس کام کی موٹی موٹی باتیں سکھانے کے علاوہ نمائش کے لیے اچھی اچھی چیزیں تیار کراتے تھے۔ لکڑی کی جامع مسجد اور قطب مینار نے تو کئی جگہ انعام حاصل کیے ہیں۔ جامعہ کی نمائشوں میں ماسٹر صاحب کے شاگردوں کا کام نمایاں نظر آتا تھا ان دنوں جامعہ میں تنخواہیں کم تھیں اور کئی کئی مہینے نہیں ملتی تھیں ماسٹر صاحب قرول باغ سے تین میل دور پہاڑ گنج بخش خاں میں رہتے ہیں۔ آپ صبح اور شام پیدل آیا جایا کرتے تھے۔ ڈرائنگ کا کام بھی ہر ایک جماعت میں لازمی کرا دیا گیا اس کے سکھانے والوں کی محدود تعداد کا خیال کرتے ہوئے یہ مشکل معلوم ہوتا تھا کہ اس شعبہ میں بھی کوئی قوم پرور استاد مل جائے گا۔ مگر آخر ایک صاحب مل ہی گئے جو قومی جوش کے ایک مجسم پیکر ہیں ان کا خیال ہے کہ جامعہ میں بعض چیزیں لازمی ہو جانی چاہییں مثلاً کھدر کا لباس کھدر کی ٹوپی انھیں سمجھایا بھی گیا کہ جہاں تک قومی رنگ کا تعلق ہے وہ تو جامعہ کی خصوصیت رہے گی لیکن جزئیات میں پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ ہاں ہر استاد کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے طور پر لڑکوں کو کھدر کے استعمال کے لیے راضی کرے جو طالب علم کھدر کی ٹوپی پہنے سے کتراتے تھے سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ یہ اختر حسن صاحب فاروقی کا ذکر ہے قومی پرچم جامعہ کا پرچم آپ کی حفاظت میں رہتا ہے۔ آپ ہر موقعہ پر جھنڈا اپنی نگرانی میں لگواتے ہیں انہیں دنوں رسالہ جوہر جو کچھ عرصہ کے لیے بند ہو گیا تھا دوبارہ نکلنے لگا مدرسہ کی انجمن بزم ادب کی طرف سے محمد قاسم صاحب سندھی نے رسالہ گلشن جاری کیا سندھی ہونے کی وجہ سے اردو سیکھنے میں آپ کے لیے دقت ہوئی تھی جو اور لڑکوں کی مادری زبان کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن اس کام

کے شوق نے آپ کی ہمت قائم رکھی اور ایک عرصہ تک رسالہ نکالتے رہے میلاد النبی کا جلسہ
عام رواج کے مطابق ہوا مولانا خواجہ عبدالحیٔ صاحب کے علاوہ رام چندر جی نے بھی تقریر کی مگر
فلسفۂ اسلام پر محمد علی کی تقریروں کا سلسلہ جاری رہا مولانا نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا
توحید کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ خدا کو ایک مانا جائے بلکہ اپنے نفس کی غلامی سے اور
غیروں کی تقلید سے [illegible] انجمن تحادی کی طرف سے گروکل کانگڑی کے سالانہ جلسہ
میں حصہ لینے کے لیے طلبا بھیجے گئے تھے۔ ہمارے کالج کے سید انصاری صاحب اور عبدالحمید صاحب
زبیری شریک ہوئے تھے۔ زبیری صاحب نے پہلا انعام جیتا بحیثیت مجموعی اول آنے پر ہماری
ٹیم نے ٹرافی بھی حاصل کر لی ماسٹر برکت علی صاحب نے اسی سال انجمن حکمیات قائم کی آپ نے
کیے بعد دیگرے کئی چیزیں چلانے کی کوشش کی ایک عرصہ تک غیر مقیم طلبا کے کھیلوں کو منظم
کرتے رہے۔ ان ہی لوگوں کی تحریک سے آپ نے ۱۹۳۸ء میں انصاری میموریل ہاکی شیلڈ کی
بنا ڈالی۔ برکت صاحب نے جامعہ میں کرکٹ کے کھیل کو فروغ دیا ان کی فرض شناسی کا
یہ حال تھا کہ جس زمانے میں مدرسہ کی حاضری لیا کرتے تھے ایک روز صبح کو ان کی پھوپھی کا انتقال
ہو گیا مدرسہ والوں کو اطلاع دینے کے لیے وقت نہ تھا خود ہی تشریف لائے حاضری لی پھر میت
کے انتظام کے لیے چلے گئے اس سال سیر و تفریح کا انتظام بھی اچھا رہا بلکہ یوں کہنا چاہیے
کہ آئندہ کے لیے مزید انتظامات کی راہ نکل آئی ہر ایک اقامت گاہ میں اندرونی کھیلوں کی رسم
افتتاح منائی گئی ہر جگہ ایک بڑے کمرے میں لوڈو، سیڑھی کا کھیل شطرنج، کیرم بورڈ اور نہ جانے
کون کون سے کھیلوں کا انتظام تھا برسات میں کبھی کبھی قرول باغ سے دس میل دور اوکھلا جہاں
جمنا سے نہر نکلتی ہے تفریح کے لیے چلے جاتے تھے بعض لڑکے کہا کرتے تھے کاش جامعہ اسی
جگہ ہوتی لیکن یہ محض آرزو کا اظہار ہوتا کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ دس سال بعد
اس سارے علاقے پر ہم ہی چھائے ہوئے نظر آئیں گے اور خیال بھی کیسے ہوتا یہ وہی زمانہ
تھا کہ کئی کئی مہینے استادوں کی تنخواہوں کی ادائیگی نہ ہوتی تھی مگر اُن استادوں کی ہمت دیکھیے
لڑکوں کے پڑھنے پڑھانے میں ان کے کھیل کود سیر و تفریح اور خوشیوں میں ذرا فرق نہ آنے پایا
بلکہ ہر سال نئی نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا گیا مدرسے سے تھوڑی دور دولت علی بختیاری کے پرانے محل کے
پاس ایک پختہ سرکاری تالاب تھا اجازت لے کر اس میں پیراکی کا انتظام کیا گیا شام کو [illegible]
[illegible] محمد حسین صاحب حیدرآبادی طالب علم اور ان کے ساتھی پیرا سکھا [illegible]

کو تو بڑی کی پیرے لیکن ڈوبتے کو نکالنا کمال کی بات ہے۔ حسین صاحب کے لئے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کبھی کبھی بچوں کی اس تفریح کو دیکھنے کے لئے مولانا محمد علی بھی تشریف لایا کرتے تھے ایک دن ذاکر صاحب کے جی میں آئی کہ پیرنا سیکھیں لنگی کس تالاب کے کنارے پیر لٹکائے بیٹھ گئے حسین صاحب چپ چاپ انتظار میں کھڑے رہے۔ ذاکر صاحب فرمانے لگے جناب پیراکی کے سارے اصول اور قاعدے ازبر یاد ہیں لیکن جب تک دو ایک غوطے نہ کھائے عملی جرأت نہیں ہوتی اس سال جو طلباء جامعہ میں رہ چکے ہیں وہ میر باقر علی داستان گو کو کبھی نہ بھولیں گے موصوف دلی کے پرانے لوگوں میں سے تھے داستان کہنے کا ملکہ تھا۔ بیان کیا کرتے تھے بس آنکھوں کے سامنے ہو بہو نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کہانی کے لوگ ہمارے سامنے چل پھر کر سب کچھ کہہ رہے ہیں دکھا رہے ہیں جی چاہتا تھا کہ گھنٹوں سنتے جائیں یہ سناتے بھی تھے کم سے کم تین گھنٹے چاندنی راتوں میں خاکسار منزل (چھوٹے بچوں کا اقامت خانہ) کی چھت پر تمام طلباء اور اساتذہ جمع ہو جایا کرتے تھے خاص شہر دلی کے پرانے قصے سناتے تھے کبھی بادشاہوں کے تو کبھی کرخنداروں کے (تمام لوگوں) کے کہانی میں بوڑھے بچے عورت مرد سب کا ذکر ہوتا تھا اور لطف یہ جس کی زبان بولتے ویسا ہی لب و لہجہ اختیار کرتے ایک اہم بات یہ تھی کہ بیچ بیچ میں لڑکوں کو مخاطب کر کے نصیحت کرتے کہ بچو تم بھی ایسا کرنا یا نہ کرنا جیسا موقع ہو رمضان کی دلچسپیوں نے ایک خاص رنگ اختیار کر لیا تھا ہر ایک اقامت گاہ والے باری باری سے جامعہ کے تمام اساتذہ منشی صاحبان اور مانیٹروں کو افطار پر مدعو کرتے تھے۔ ایسی چہل پہل اور ملاقات کے موقع اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے تھے اب مہمانوں کا حال سنئے دہلی منتقل ہونے کے بعد گاندھی جی جامعہ میں پہلی دفعہ تشریف لائے تو طلباء اور اساتذہ نے کھدر کے کام کے لئے ستر روپے کی تھیلی نذر کی اور سپاسنامہ پیش کیا آپ کے ہمراہ مولانا محمد علی مولانا شوکت علی حکیم اجمل خاں امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری (معتمد جامعہ) سیٹھ جمنالال بجاز اور مہادیو دیسائی تھے "ڈائس" تک پہنچنے کے لئے جو راستہ بنایا گیا تھا اس کے دونوں طرف قطار میں طلباء تکلی چلا رہے تھے گاندھی جی نے ہر ایک کے کام کو غور سے دیکھا اور خوش ہوئے۔ حکیم اجمل خاں نے آپ کے خیر مقدم میں تقریر کی اس کے [illegible] ایک لڑکے نے سپاسنامہ پیش کیا جاتا ہی آج آپ نے جامعہ میں تشریف لا کر ہماری [illegible] آپ کے تشریف لانے سے ہماری ہمتیں بڑھ گئی ہیں اور [illegible]

ارادے بلند ہوگئے ہیں ہم آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دلیس کی خدمت کے لیے بہت دن قائم رکھے آپ خوب جانتے ہیں کہ ہماری جامعہ نے ایک بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ ہم کو ایسی تعلیم دینا چاہتی ہے جس سے ہم خدا کے نیک بندے اپنے دلیس کے سچے خادم سارے انسانوں کی بھلائی چاہنے والے بن جائیں وہ ہمیں یہ سکھانا چاہتی ہے کہ ہم اپنے علم و ہنر سے اپنے اخلاق کو سنواریں محنت اور مشقت سے اپنے اور اپنے عزیزوں کے لیے حلال کی روزی کمائیں اور خلوص اور ہمدردی سے اپنی قوم کی ترقی اور اپنے ملک کی آزادی کی کوشش کریں آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آج کل زمانہ کی ہوا ہمارے خلاف ہے ملک میں لڑائی اور فساد کی آندھیاں چل رہی ہیں جس سے پیار محبت کی کھیتی مرجھائی جاتی ہے ہم آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ پودے جنہیں آپ نے اور دوسرے بزرگوں نے جگر کے خون سے سینچا تھا اگر سوکھ بھی جائیں تو ان کے بیج برباد نہیں ہوسکتے وہ ہمارے دلوں میں محفوظ ہیں اور اگر خدا نے چاہا تو ان سے پھر نئے پودے نکلیں گے اور زہریلی ہواؤں سے بچ کر مضبوط اور تناور درخت بن جائیں گے ہم آخر میں پھر نہایت ادب سے آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ یہ عزت جلد جلد حاصل ہوا کرے گی۔

ہم ہیں آپ کے فرمانبردار
طلبائے جامعہ ملیہ اسلامیہ

گاندھی جی نے سپاسنامے کے جواب میں فرمایا جو لڑکے میرے پاس بیٹھے ہیں وہ میرے ایک پرانے دوست اور رفیق کار کے پوتے ہیں جن کا نام احمد محمد کاچلیہ ہے انہیں میں اپنے حقیقی بھائی کے برابر سمجھتا تھا اور ان بچوں کو دیکھ کر ان کی یاد تازہ ہوجانا ایک بالکل قدرتی امر تھا انھیں بچوں کے سلسلے میں کچھ باتیں آپ سے کہنی چاہتا ہوں جس زمانہ میں میں نے جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ شروع کی تھی۔ اس وقت وہاں کے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں "کاچلیہ" سے بڑھ کر باہمت اور مستقل مزاج کوئی آدمی نہ تھا انہوں نے اپنے ملک کی عزت آبرو کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ انہوں نے نہ تو اپنے کاروبار اور مال و دولت کی کوئی پروا اور نہ اپنے دوست احباب کا خیال کیا بلکہ بلا کسی تامل اور اندیشے کے انھوں نے اپنے آپ کو اس کشمکش میں ڈال دیا اس وقت بھی بدقسمتی سے ہندو مسلم جھگڑے

رہے گا ہے پیدا ہوجاتے تھے لیکن "گاندھی" کا جلیہ" نے دونوں کے درمیان توازن ہمیشہ قائم رکھا اور ان پر بیجا حمایت اور پاسداری کا الزام کبھی نہیں لگا۔ انھوں نے حب وطن اور رواداری کی خصوصیات نہ کسی اسکول میں رہ کر حاصل کی تھی اور نہ انگلستان جا کر بلکہ انہوں نے یہ سب کچھ خود اپنے گھر میں سیکھا تھا اس لیے کہ وہ گجراتی زبان بھی مشکل سے لکھ پڑھ سکتے تھے معذمات کی پیروی میں جس طریقہ سے وہ دلیل کا جواب دیتے وکلا بیرسٹر بھی اسے سن کر دنگ رہ جاتے اور بعض وقت ان کے خود ان کے کاموں میں بھی بڑی مدد ملتی رہتی تھی۔ انہوں نے ستیہ گرہیوں کی رہبری بھی کی اور اسی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ان کا ایک بیٹا تھا جس کا نام علی تھا اور جیسے وہ میرے بھی ہوگئے تھے گیارہ سال کا یہ لڑکا سچا اور پکا مسلمان تھا رمضان کے مہینے میں وہ کبھی ایک روزہ بھی نہ چھوڑتا تھا پھر بھی اسے ہندوستانیوں سے نفرت نہ تھی آج کل ہندو مسلمان دونوں ہی میں مذہبیت کے معنیٰ دوسرے مذہب سے نفرت وحقارت کے ہیں علی میں اس قسم کی نفرت وحقارت کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ بہرحال بیٹا اور باپ، دونوں کے نام آج میرے لیے انتہائی مسرت وخوشی کا باعث ہیں اور خدا کرے ان کی یہ مثالیں آپ کے لیے تقلید اور رہنمائی کا سبب ہوں اس زمانے میں جبکہ ہندو مسلمان ایک ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کے لیے اور اپنے وطن کی خاطر اپنا خون بہانے کو تیار رہتے۔ میں نے طلبا کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے چھوڑنے کی دعوت دی تھی۔ اس تمام عرصے میں مجھے کبھی اس بات کا افسوس نہیں ہوا کہ میں نے ان طلبا کو ان کی تعلیم گاہوں سے کیوں بلایا اور یہ پختہ یقین ہے کہ جن طلبا نے اس آواز پر لبیک کہا تھا انہوں نے اپنے وطن کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کا آئندہ مورخ ان کے ایثار اور قربانی کو نہایت جلی حرفوں میں لکھے گا۔

میں اس قابل فخر زمانے کے کچھ آثار یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہے کہ آپ اس جھنڈے کو قائم رکھنے کے لیے اپنی پوری محنت اور جان فشانی سے کام لے رہے ہیں آپ کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے

لیکن دنیا میں اچھے اور سچے آدمی کبھی بہت نہیں ہوتے ہیں۔ میں آپ کو کبھی نصیحت کروں گا کہ قلت تعداد کا آپ کچھ خیال نہ کیجیے بلکہ اس بات کو پیش نظر رکھیے کہ ملک کی آزادی کا انحصار آپ پر ہے۔ آزادی کا آپ کے پڑھنے لکھنے یا تکلی چلانے سے بہت کم تعلق ہے ہندوستان کی آزادی کے لیے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے وہ دو ہیں خدا کا خوف اور انسان یا انسانوں کی جماعت سے جس کا نام حکومت یا سلطنت ہے بے خوف ہونا ہے ان دو چیزوں کی تعلیم اگر آپ کی اس درسگاہ میں ہو سکتی ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ پھر اور کس درسگاہ میں ہو سکتی ہے۔ میں آپ کے پروفیسروں کو جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان دو چیزوں کی تعلیم یہاں ضرور ہوتی ہے۔ مجھے اس کا ذرا بھی خیال نہیں کہ آپ کی مالی حالت اچھی نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس بات سے میں خوش ہوں آپ عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس طرح اپنے خالق کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہے گی اور آپ ہمیشہ ان کی یاد اپنے دل میں رکھیں گے حکیم صاحب کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ میرے لیے دہلی آنا بہت دشوار تھا لیکن آپ کے ہاں آنے میں مجھے انتہائی مسرت و اطمینان حاصل ہوا۔ میں آپ کی خوشی کے لیے یہاں نہیں آیا ہوں بلکہ اپنے کو خوش کرنے کے لیے آیا ہوں میں ایک ذاتی غرض کو یہاں لے کر آیا ہوں اور وہ آپ سے یہ کہنا ہے کہ باوجود اس کے کہ جامعہ سے باہر نفرت اور زہر کا طوفان پھیلا ہوا ہے باوجود اس کے کہ مسلمان ہندوؤں اور ہندو مسلمانوں کا گلا کاٹنے پر تیار ہیں۔ لیکن اب آپ اپنے آپ کو اس سے متاثر نہ ہونے دیں اپنے خالق کو کبھی نہ بھولیں اور اپنے دلوں میں نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا نہ ہونے دیں اس امید پر میں آپ کے یہاں آیا ہوں آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے کھادی اور تکلی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بنیادی چیزوں کے آگے جو میں نے آپ کو ابھی بتائی ہیں کھادی اور تکلی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ آپ ہزار تکلی چلائیں، اور کھادی پہنیں لیکن اگر آپ ان باتوں پر عمل نہ کریں جو میں نے ابھی آپ کے سامنے بیان کی ہیں تو آپ کی یہ کھادی اور تکلی کسی کام کی نہیں لیکن مجھے یقین

ہے کہ حکیم صاحب نے کھدّر پہننے کی جو ضرورت جتائی ہے اسے آپ ہرگز نہ بھولیں گے آپ کو معلوم ہوگا کہ کھادی کے ذریعہ آج ہم ساٹھ ہزار سوت کاتنے والوں کو روزی کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں جولاہے، دھوبی، اور دوسرے پیشے والے اس سے بالکل علیحدہ ہیں یاد رکھیے ان میں بہت سے مسلمان بھی ہیں اگر چرخے کا رواج نہ ہوتا تو بہت سی جگہوں میں مسلمان عورتیں بھوکوں مرجاتیں غریب ہندو اور مسلمانوں سے اپنے آپ کو قریب کرنے کی اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں کہ کھادی پہنیں علاوہ اس کے کہ ہمیشہ پاک وصاف رہیے پاکی اور صفائی نہ صرف ظاہری اور جسمانی ہو بلکہ اندرونی اور دل کی ہو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری کیا مراد ہے اپنے وعدوں کو پورا کیجیے خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن آئے اور ان باتوں کو ہمیشہ اپنی یاد میں تازہ رکھیے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں ہر خوشی کے ساتھ رنج بھی لگا ہوا ہے۔ جامعہ کے سب لوگ ہنسی خوشی اپنے کاموں کو انجام دے رہے تھے کہ اچانک مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی وفات کی خبر ملی وہی حکیم صاحب جو پہلے امیر جامعہ تھے علی گڑھ سے سسکتی ہوئی جامعہ کو دہلی لاکر مسیحائی دکھائی۔ جامعہ کی مالی حالت ۱۹۲۴ء سے خراب ہو گئی تھی بعض دفعہ اتنی تنگی ہو جاتی تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب ہوگا کیا لیکن حکیم صاحب کا خیال کر کے ڈھارس بندھی تھی اور ہوا بھی یہی ایسے موقعوں پر مرحوم نے اپنے خاص خاص دوستوں سے بڑی بڑی رقمیں دلوائیں ان کے پیچھے صرف ایک جامعہ ہوتی تو اس کے اخراجات کا فراہم کرنا کچھ مشکل نہ تھا مگر ایک طرف طبیہ کالج کا چلانا دوسری طرف متعدد قومی انجمنوں کے کارکنوں کی ہمت بڑھانا پھر گھر کا یہ حساب کتاب کہ خواہ امیر ہو یا غریب جو کوئی بھی علاج کے لیے ان کے گھر پہ جاتا اس سے کوئی فیس نہ لیتے دہلی کے رئیس کہلاتے تھے مگر دراصل دلی کے رئیس تھے اور غریبوں کے خادم شیخ الجامعہ صاحب کے دفتر میں ان کی تصویر لگی ہوئی ہے جس کے نیچے یہ شعر ہے:-

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

جب کوئی محسن جدا ہو جاتا ہے تو اس کی یادگار قائم کی جاتی ہے۔ حکیم صاحب نے قوم کے جسمانی علاج کے لیے یادگار طبیہ کالج کو اپنی زندگی ہی میں مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا تھا لوگوں نے کہا ان کی وفات کے بعد روحانی علاج کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ان کی یادگار کے طور پر ایک پائیدار شکل دینی چاہیے یہ تجویز اچھی تھی اس بات کو پھیلانے کے لیے فروری ۱۹۲۸ء میں اسی دہلی میں بہت بڑا جلسہ ہوا مشہور رہنماؤں کا اتنا بڑا مجمع یا تو میں نے کانگریس کے سالانہ جلسوں میں دیکھا ہے یا اس جلسے میں پنڈت موتی لال نہرو، مولانا محمد علی، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مسز سروجنی نائیڈو، مہاراجہ محمود آباد، مسٹر راجگوپال اچاریہ، ڈاکٹر شیخ محمد عالم، جناب مولوی مرتضیٰ بہادر، مسٹر پی ہرکاشم، مولانا شفیع داؤدی، مولانا عبدالقادر قصوری، لالہ شنکر لال، مولوی عبدالقادر، سردار سردول سنگھ اور بہت سے حضرات شریک تھے جلسے کے صدر پنڈت موتی لال نہرو تھے آپ نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ حکیم صاحب ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہندوؤں کو چاہیے کہ وہ بھی ان کی یادگار قائم کرنے کے لیے کام میں حصہ لیں پنڈت جی کی تقریر کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے جامعہ کی اغراض مقاصد بتلائے اور فرمایا کہ مذہبی تعلیم رواداری بھائی چارہ اردو کے ذریعہ تعلیم دینا اور ہندو مسلم اتحاد جامعہ کی خصوصیات ہیں پھر فرمایا کہ اس وقت جامعہ والے کرایہ کی کوٹھیوں میں ہیں تجویز یہ ہے کہ حکیم صاحب کی یادگار میں آٹھ لاکھ روپے جمع ہو جائیں تو اپنی عمارتیں تیار ہو سکتی ہیں اس کی تائید میں پنڈت مدن موہن مالویہ، مہاراجہ محمود آباد، مولانا ابوالکلام آزاد، سردار سردول سنگھ نے تقریریں کیں اس وقت چودہ ہزار روپے کے وعدے ہوئے تھے وعدہ کرنے والوں کے نام ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے

پڑھ کر سنائے۔ مالی اور انتظامی اعتبار سے اگلے سال جامعہ میں جو انقلابی تنظیم ہوئی اس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ جامعہ کے استحکام کے لیے جو صورتیں اختیار کی جا رہی تھیں ان کے تحت رضاکارانہ طور پر ذاکر صاحب ان کے ساتھی عابد صاحب اور مجیب صاحب نے اپنی تنخواہوں میں کمی کر لی۔ نیز مجیب صاحب نے گرمیوں کی تعطیلات کی پوری تنخواہ جامعہ کے کتب خانہ کو دے دی کہ کتابیں خریدی جائیں قرول باغ میں رات کا مدرسہ کام کر رہا تھا۔ اس کے مستقل عمارت کے لیے جامعہ نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو ایک قطعہ زمین خریدلیا۔ بعد میں یہاں شاندار عمارت بنی۔ ۱۹۳۰ء میں جامعہ کا مدرسۂ ابتدائی اسی عمارت میں منتقل ہوا۔ جامعہ کی پوری آبادی کے لیے دہلی سے چند میل دور کسی پرفضا مقام پر زمین حاصل کرنے کی باتیں ہونے لگیں خیال کیجیے ایک طرف یہ تحریک کہ اساتذہ اپنی تنخواہ کم لیں دوسری طرف یہ تجویزیں کہ عمارت کے لیے زمین خریدی جائے اب تک فاؤنڈیشن کمیٹی (مجلس تاسیس) اپنی انتظامی جماعت (سنڈیکیٹ) اور تعلیمی جماعت (اکیڈمک کونسل) کے ذریعہ جامعہ کے کاموں کو چلا رہی تھیں۔ نئی تنظیم میں مجلس تاسیس ایک نئی مجلس امناء کا انتخاب کرکے اور اپنے تمام اختیارات اور حقوق اس کے سپرد کرکے ختم ہوگئی۔ ضابطہ کی کارروائی اس طرح ہے۔

رودادِ جلسہ فاؤنڈیشن کمیٹی منعقدہ ۲۹ر اپریل ۲۸ء۔

فاؤنڈیشن کمیٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا ایک اجلاس ۱۱ر اپریل ۲۸ء کو دفتر جامعہ میں بوقت ساڑھے چھ بجے شام منعقد ہوا ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے صدارت فرمائی۔ مندرجہ ذیل حضرات شریک جلسہ تھے۔

(۱) ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب (۲) مولانا محمد علی صاحب (۳) مولانا شوکت علی صاحب (۴) قاضی نجم الدین صاحب (۵) حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب (۶) ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔

ڈاکٹر انصاری صاحب نے جامعہ کی موجودہ مالی حالت اور اصل جامعہ فنڈ کے لیے مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر صاحب اور دیگر اکابر نے جو اپیل قوم سے

[illegible] کا تفصیلی ذکر کیا اور جامعہ کے آئندہ انتظام و انصرام کے متعلق [illegible]
[illegible] اور دیگر اکابر سے جو گفتگو ہوئی تھی اس کا تذکرہ فرمایا۔ کافی غور و خوض
کے بعد فاؤنڈیشن کمیٹی نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی۔

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم کی یادگار کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو استحکام دینے اور اس کو مالی دشواریوں سے مستغنی کرنے کی غرض سے اس کی ضرورت ہے کہ باضابطہ طریقہ پر پوری جد و جہد کی جائے اور اس تمام کام کو ایک منتخب جماعت امناء کے سپرد کیا جائے جن کے ہاتھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تمام نظم و نسق ہو لہٰذا جمعیۃ تاسیس آج بتاریخ ۱۹ اپریل ۲۶ء کو اصحاب ذیل کو بطور جمعیۃ امناء کے منتخب کرتی ہے۔

(۱) صدر مجلس امناء — ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب
(۲) معتمد مجلس امناء — ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب
(۳) خازن — سیٹھ جمنا لال صاحب بزاز
(۴) رکن — مولانا محمد علی صاحب (۵) مولانا شوکت علی صاحب (۶) مولانا ابو الکلام آزاد صاحب (۷) عبدالمجید خواجہ صاحب (۸) مولانا محمد شفیع داؤدی صاحب (۹) سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب (۱۰) سیٹھ جمال محمد صاحب (۱۱) شعیب قریشی صاحب (۱۲) مولوی مسعود علی صاحب (۱۳) مولوی کفایت اللہ صاحب (۱۴) مولوی محمد عرفان صاحب (۱۵) جواہر لال نہرو صاحب (۱۶) حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب (۱۷) تصدق احمد خان صاحب شیروانی (۱۸) قاضی نجم الدین صاحب (۱۹) مولوی محمد نسیم صاحب (۲۰) مولوی عبدالقادر صاحب قصوری (۲۱) ڈاکٹر محمد عالم صاحب (۲۲) مولوی عبدالحق صاحب (۲۳) مولانا قطب الدین عبدالوالی صاحب (۲۴) ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب (۲۵) محمد مجیب صاحب (۲۶) اے جے کیلاٹ صاحب (۲۷) حسن محمد حیات صاحب (۲۸) چودھری خلیق الزماں صاحب (۲۹) مولوی سید مرتضیٰ صاحب (۳۰) مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی۔

مجلس تاسیس ۱۱ اصحاب ذیل کو مجلس امناء کی پہلی مجلس انتظامیہ کا رکن منتخب کرتی ہے۔

(۱) صدر مجلس امناء — ڈاکٹر انصاری صاحب

(۲) معتمد مجلس امناء — ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب

(۳) خازن مجلس امناء — جمنا لال بجاج صاحب

(۴) مستجل جامعہ — ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

رکن۔ (۵) مولانا محمد علی صاحب (۶) مولانا شوکت علی صاحب (۷) مولانا ابوالکلام آزاد صاحب (۸) عبدالمجید صاحب (۹) مولانا محمد شفیع داؤدی صاحب۔

مجلس تاسیس قرار دیتی ہے کہ اس کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں مذکورہ مجلس امناء کو منتقل ہو جائے اور اس کے بعد جمعیۃ تاسیس خود قائم نہ رہے۔ چنانچہ وہ تمام حقوق اور ذمہ داریاں مجلس امناء کو منتقل ہو گئیں اور اس کے بعد مجلس تاسیس ختم ہو گئی۔

نیز قرار پایا کہ نئی مجلس انتظامیہ اپنے آئندہ اجلاس میں جامعہ کا دستور اساسی تیار کرے اور مجلس امناء کے سامنے بغرض منظوری پیش کرے ساڑھے آٹھ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

دستخط ذاکر حسین

۳۰ را پریل ۱۹۲۶ء

(۱) «جامعہ کی کہانی» از عبدالغفار مدھولی سائز $\frac{20\times30}{16}$ صفحات ۲۹۶ قیمت -/۶ حوالہ ۱۰۱ تا ۱۰۹

مدھولی صاحب کی کچھ کتابیں

جامعہ کی کہانی	-/۶	چند پروجکٹ	۲/۵۰
جامعہ کا طریقہ اردو ہندی سکھانے کا	۲/۵۰	اردو املا کا آسان طریقہ	-/۷۵
کھیل کے ذریعہ تعلیم اوّل	۲/۰	کیمپ فائر کی نقلیں اول و دوم فی	-/۷۵
” ” دوم	۱/-	طیرنے والا لڑکا ڈرامہ	-/۵۰
[illegible]		امن کا راستہ گاندھی جی کی کہانی	۳/۰

شرابِ کہنہ

نِظَام

۱۸۲۲ ———— ۱۸۷۲ء

نام سید نظام شاہ، تخلص نظاؔم۔ وطن رام پور۔ فارسی اور عربی سے بقدر ضرورت واقف تھے۔ شاعری سے فطری ذوق تھا۔ اس سلسلہ میں کبھی اپنے پیرومرشد احمد علی صاحب احمؔد سے استفادہ کیا۔ کبھی شیخ علی بخش بیماؔر سے اصلاح لی اور آخر میں نواب یوسف علی خاں ناظؔم والیٔ ریاست رام پور کو اپنا استاد بنا لیا تھا اور نواب صاحب مرحوم بھی ان کو اپنا شاگرد رشید سمجھتے تھے۔ میر سوؔز اور جرأت کا انداز بہت پسند تھا۔

آزاد منش اور آشفتہ مزاج آدمی تھے۔ طبیعت میں رندانہ پن بھی پایا جاتا تھا۔ آخری وقت تک ریاست رام پور سے وابستہ و منسلک رہے۔

۱۸۹۹ء میں قدرت رام پوری نے شمس المطابع مراد آباد سے "کلیاتِ نظام" شائع کیا۔ جس میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔

عشق و محبت کے مضامین نظم کرنے میں بڑے مشاق تھے۔ ادابندی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

محاکات کا یہ بے نظیر شعر اردو دانوں کے دلوں سے نظاؔم رام پوری کی یاد کو کبھی نہ محو ہونے دے گا۔

انتخاب

دم رگ آئے وہ عیادت کو — کیا اجل سے میں شرمسار ہوا
... عادت پہ تکلف سے ہوئی شرم و حیا کی — ہوتے میں بھی منہ پر سے دوپٹا نہیں [illegible]

نہ وہ مانتے ہیں، نہ میں مانتا ہوں — سفارش کسی کی، دلا سا کسی کا

نہ ملنے پہ اس کے تو مرتے ہیں لاکھوں — جو ملتا تو کوئی بھی جیتا نہ ہوتا

غیر کے دھوکے میں خط لے کے مرا قاصد سے — پڑھنے کو پڑھ تو لیا نام مگر چھوڑ دیا

یوں آپ تو کہوں گا نہ رنجش کا ماجرا — پوچھوگے تم تو مجھ سے چھپایا نہ جائے گا

ناداں ہوں میں زاہد، جو کروں خوف و خطر آج — جو گزرے گی وہ گزرے گی، کسے کل کی خبر آج

اس یاس کے صدقے کی کہ تمناؤں سے چھوٹے — رنجش نہ اُدھر ہے نہ شکایت ہے اِدھر آج

نامہ بر کچھ تو زبانی بھی تو کہنا اُن سے — میرا مطلب ہے بہت اور ہے تھوڑا کاغذ

کرکے پرزے دیئے نامے کے کہا قاصد سے — ایک کاغذ کے عوض سینکڑوں لے جا کاغذ

نہ وہ لکھ سکتے ہیں ہم کو نہ اُن کو کچھ ہم — یہ خطر ہے کہ کہیں جائے نہ پکڑا کاغذ

یوں ہم کو نہ دل سے تم بھلاؤ — دیکھو کبھی یاد آئیں گے ہم

دن نکلنے تو دو چلے جانا — آسماں پر ابھی ستارے ہیں

وہ اتنا روئے میں کس کا کہنا ہائے — دیکھو اپنے پرائے بیٹھے ہیں

آجائے کچھ نہ رحم مرے حالِ زار پر — اِس واسطے وہ دیکھتے ہی اب اِدھر نہیں

پھر آنا اس کو شکل ہی دکھلا کے نامہ بر — تجھ سے ادا ہو، ایسا مرا مدعا نہیں

انکار پہ صبر، نہ اقرار پر یقیں — یارب پڑی ہے جان مری کس عذاب میں

انداز اپنے دیکھتے ہیں آئینے میں وہ — اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

اک لطف روز کے ہے سوال و جواب میں — ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ وعدہ وفا نہ ہو

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظام — ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

[illegible] بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ

دکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

یہ بھی نیا ستم ہے حنا تو لگائے غیر
اور اُس کی داد چاہیں مجھ کو دکھا کے ہاتھ

کوچے سے تیرے اٹھیں تو پھر جائیں ہم کہاں
بیٹھے ہیں یاں تو دونوں جہاں سے اٹھا کے ہاتھ

پہچانا پھر تو کیا ہی ندامت ہوئی انھیں
پنڈت سمجھ کے مجھ کو اور اپنا دکھا کے ہاتھ

دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظام
منہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

ہم سے نہیں نبھی ہے تو غیروں سے نبھ چکی　صد شکر اس کا عہد ہی ناپائیدار ہے
اب تو سب کا ترے کوچے میں ہے مسکن ٹھہرا　یہی آباد ہے دنیا میں زمیں تھوڑی سی
وہ بُت نہ بس میں ہو مرے کہنے میں مرے دل تو ہو
اللہ اس قدر تو مجھے اختیار دے
ارباب ہوس کو تو نہ کچھ حوصلہ ہوگا　اچھا ہے جو وہ عذرِ ستم کا نہیں کرتے

صفحہ ۵ کا بقیہ

بمبئی میونسپل کارپوریشن اور بالخصوص اس کے محکمہ تعلیم کا اردو سیکشن قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے نہایت خوبی اور سلیقے سے اپنے کام کی نمائش کی اور بمبئی میں اردو کے حق میں جو کام ہوا اسے دوسروں تک پہنچانے کا انتظام کیا۔ بچوں اور نوجوانوں میں تعلیم اور مطالعے کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لئے اس قسم کی سرگرمیاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور صحیح رہنمائی کا ایک بہترین ذریعہ بھی ہیں۔ اور یہ بہت ضروری ہے کہ اردو کے لئے جہاں بھی اور جو کچھ بھی ہو رہا ہے اُسے ابھارا جائے تاکہ اس سے دوسروں کو تقویت ہو بلکہ بعض جگہ ایسا کام دوسروں کی سعی نہ ہونے کی غیرت کا باعث بھی ہو۔

نئی مطبوعات

آثار الصنادید (نیا ایڈیشن)	سرسید احمد خاں	دہلی سینٹرل بک ڈپو	۴۲۸	قسم عام ۱۸/- اول ۲۵/-
" " "	" " "	" " "		
سوکھا ساون ناول	انیس مرزا	خرام پبلیکیشنز	۱۲۸	۲/۵۰
محبت اور جرم "	انور کمال حسینی	" " "	۱۴۴	۲/۷۵
نکاتِ ادب ادبی	محمد مظفر حسین	پٹنہ، بہار ریاستی انجمن ترقی اردو	۲۷۶	۵/۵۰
جدید اردو ادب کا انتخاب (رباعی)	ڈاکٹر ملک راج آنند	بمبئی ہندوستانی بک ٹرسٹ		۶/-
برف سی اُجلی (افسانے)	علی اکبر آمبوری	مدراس ادارہ جدید ڈیپری پاکٹ	۱۱۲	۱/-
ردیلی (ناول)	عذرا جمال دہلی	تاج اردو اکیڈمی	۲۵۶	۵/-
دیوانِ غالب بعد نظرِ ثانی۔ مرتبہ	مالک رام دہلی	آزاد کتاب گھر	۳۶۰	۶/-
میری امیدوں کا امریکہ	لنڈن بی جانسن دہلی	انڈین اکیڈمی	۹۶	۱/-
ادیب اور کمسیار	گوپال متل دہلی	نیشنل اکیڈمی	۱۷۲	۱/-

پیامِ تعلیم کے قدردان

محبِ مکرم۔ تسلیم

پیامِ تعلیم پابندی سے پہنچ رہا ہے اور آپ اس پر جو وقت اور محنت صرف کرتے ہیں وہ نئی نسل کے لیے انتہائی کار آمد اور مفید ثابت ہوگی بچوں کے لیے لکھنا آسان نہیں۔ جب بچوں کا سب رس نکلتا تھا تو میں یہ چاہتا تھا کہ اس میں لکھنے والے زیادہ تر طلبا ہی ہوں۔ میں ایڈیٹر تو نہیں تھا لیکن ہاتھ بٹاتا تھا۔ ان دشواریوں سے میں جب ہی سے واقف ہوں۔

پیامِ تعلیم کے معلوماتی مضامین کافی دلچسپ ہوتے ہیں اور بچے ان مضامین کے لیے بڑے منتظر رہتے ہیں خصوصاً کوے وادا کا سلسلہ قابلِ ستائش ہے۔

میرے مضامین بالکل ادبی ہوتے ہیں۔ تاہم سبھی سمجھدار بچوں کے لیے بھی کچھ لکھ کر پیامِ تعلیم کی خدمت کرنے کی کوشش کروں گا۔

(پروفیسر) اکبر الدین صدیقی (حیدرآباد دکن)

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

دلّی سے دلّی تک

مصنف: سیّد ضمیر حسن دہلوی
صفحات: ۱۳۶، سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: دو روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ اردو بازار دہلی
(سن طباعت اپریل ۶۵)

کچھ عجیب سا نام نظر آیا اس کتاب کا! مصنف کا نام سید ضمیر حسن دہلوی! کون ہیں یہ بزرگ؟ اندرونی ٹائٹل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بزرگ نہیں خورد ہیں۔ ایم۔ اے پاس کر چکے ہیں اور دلی کالج کے شعبۂ اردو میں لکچرار ہیں۔ عمر صرف ۲۵ سال کی ہے شروع میں ڈیڑھ صفحے کا تعارف پروفیسر سید احتشام حسین نے لکھا ہے۔ اس کے بعد چھ صفحے کا تعارف مزید ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے۔ دونوں تعارف نگاروں نے انشائیے کے بارے میں کام کی باتیں کہی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے دلی کی ٹکسالی زبان لکھنے والوں کی جو فہرست پیش کی ہے وہ اگرچہ نا تمام ہے پھر بھی اچھی خاصی رہنمائی کرتی ہے۔ سر فہرست میر امّن ہیں اور آخر فہرست سید ضمیر حسن۔ میں نے اسی نقطۂ نظر سے اس کتاب کے مضامین پڑھنے شروع کیے اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک میں نے اس کے پورے ۱۳۶ صفحے نہیں پڑھ لیے کتاب کو ہاتھ سے نہیں رکھ سکا۔ مدتوں بعد دلی کی چٹخارے دار زبان سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔

سید ضمیر حسن صاحب کی اس کتاب میں آٹھ مضمون ہیں۔ ان میں انشائیے ہیں خاکے ہیں اور تاثرات ہیں اور افسانوی مضامین۔ سب کے سب دلی کی عام بول چال میں لکھے گئے ہیں اور اس روایت کو تازہ کیا گیا ہے جس کی طرح میر امّن دہلوی نے ڈالی تھی۔

اس مجموعہ کا پہلا مضمون "گالیاں" ایک دلچسپ انشائیہ ہے۔ اس میں گالیوں کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مضمون "ہماری دنیا ہے"۔ صاحبِ مضمون نے دلّی کے بازاروں اور گلیوں کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ہر چند کہ ہنسانے والا ہے مگر دیدۂ عبرت نگاہ کو اس کے پس منظر میں آنسو چھلکتے نظر آتے ہیں۔

تیسرا مضمون ہے "محتاجِ اجل کیوں ہے"۔ اس میں مزاحیہ انداز میں خودکشی کے فوائد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھا مضمون "بی عورت کی کہانی بوا صداقت کی زبانی" ہے۔ زبان وبیان کے اعتبار سے اس مجموعے کا سب سے عمدہ مضمون یہی ہے۔ دلّی کی عورتوں کی زبان کا اس مضمون میں بہت اچھا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

پانچواں مضمون "ہم بیچارے نوجوان" ہے اس میں نئے اور پرانوں کی آویزش دکھائی گئی ہے۔

چھٹا مضمون ہے "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی"۔ اس مضمون کی ابتدا صبح سویرے اٹھنے کے نا ممکنات سے ہوتی ہے۔ بات میں سے بات نکلتی ہے اور ان نوجوانوں کی شادی کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے جو ان کو دختر شماری اور رات کو اختر شماری کرتے ہیں۔

ساتواں مضمون "دلّی سے دلّی تک" ہے۔ یہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کا رپورتاژ ہے۔ اسے صاحبِ مضمون کی آپ بیتی کہنا چاہیے۔ گر صرف چند مہینے کی۔ دلّی سے لاہور تک کا سفر، لاہور کی دلچسپیاں اور پھر لاہور سے دلّی کی واپسی مگر جو دلّی چھوڑی تھی اس کے بدلے کوئی اور ہی دلّی پائی۔ دیس میں پردیس عہدِ رفتہ کی یاد نے چٹکیاں لیں۔ اپنی پڑدادی کی کہن بار بار یاد آتی ہے:

"بٹیا تین بھائی تھے، محبّت علی، مروّت علی، اور مطلب علی۔ محبت علی تو فساد میں کٹ گئے، مروّت میاں پاکستان جا کر مرے، اور مطلب علی کم بخت آج تک زندہ ہیں۔"

آٹھواں اور آخری مضمون "آنگنا کنارہ" ہے۔ یہ ایک نہایت کامیاب خاکہ ہے

جس کا انجام عبرت ناک ہے۔ صغیر صاحب کا گہرا مشاہدہ قابلِ داد ہے۔
سید صغیر حسن صاحب کی عمر صرف پچیس سال کی ہے اور ان کی مضمون نگاری کی عمر شاید دو سال سے زیادہ نہ ہوگی مگر جو شادابی اور روانی ان کے اس ابتدائی مشق کے نمونوں میں ہے۔ اس سے ہم یہ خوشگوار توقع وابستہ کر سکتے ہیں کہ بہت جلد وہ صفِ اوّل کے ادیبوں میں شمار ہونے لگیں گے۔ انشاء اللہ و تعالیٰ۔

شاہد احمد دہلوی

انوارِ نظر

شاعر: منشی نوبت رائے نظر لکھنوی
مرتبہ: بشیش حیدر طالب دہلوی۔
صفحات: ۱۴۸، سائز $\frac{20\times30}{16}$
قیمت: دو روپے پچیس پیسے
سن اشاعت ۱۹۶۵ء
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی

منشی نوبت رائے نظر لکھنوی (۱۸۶۶ - ۱۹۲۳) ہمارے ان ممتاز اور قابلِ احترام شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی عمر گیسوئے اردو کو سنوارنے اور گلشنِ سخن کی آبیاری میں صرف کی۔ "خدنگِ نظر" لکھنؤ کا اجرا، "زمانہ کان پور" سے وابستگی "ادیب الہ آباد"، "آزاد"، "تفریح"، اور "اودھ اخبار" کی یکے بادیگرے ادارت پھر "خادمِ ہند" کی ذمہ داری، لکھنؤ کے اخبارات اور رسالے شاہد ہیں کہ جناب نظر شاعری کے علاوہ تنقید نگاری اور صحافت کے بھی مردِ میدان رہے ہیں۔

کتاب کے شروع میں حضرت نظر کے مختصر حالاتِ زندگی، نثری کارگزاریوں کی فہرست پھر ان کی شاعری کے بارے میں مبصرین کی رائیں۔ ان چیزوں سے شاعر کو سمجھنے اور اس کی شاعری کو پرکھنے میں مدد ملتی ہے۔

مجموعے میں ۱۴۳ غزلیں ۳۲ متفرق اشعار، ۱۳ نظمیں، ۵ قطعات اور ۴ منظوم خط شامل ہیں۔ جناب نظر کا اصل اور متاثر کرنے والا رنگ ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی
اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی
دیکھیو تیر دم نکلنے کی
یہ ہوا پھر نہیں ہے چلنے کی

تھوڑی تھوڑی یونہی سب خاک ہماری کجا   تیرے ممنون ہم اے گوشۂ داماں ہوں گے

یوں دیکھتے نہیں وہ مری بے قراریاں   تڑپوں اب اس طرح کہ تماشا کہیں جسے

ہجوم شوق کی حد ہے کوئی شب وعدہ   نکل کے گھر سے ترا انتظار، راہ میں ہے

سنتا ہوں کہ خرمن سے ہے بجلی کو بہت لاگ   ہاں ایک نگاہِ غلط انداز، ادھر بھی

یا دل ہے مرا، یا ترا نقشِ کفِ پا ہے   غل ہے کہ اک آئینہ سرِ راہ پڑا ہے

مایۂ زندگی سخن ہے نظرؔ   شعر ہی یادگار رہتا ہے

"مایۂ زندگی" تو "انوار نظر" کے ذریعہ دیکھ لیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ سخن سنج اور شعر ہی یادگاروں کو عزیز رکھنے والے اپنی قدر دانی کا ثبوت کس شکل میں پیش کرتے ہیں۔

رشید نعمانی

۱۔ جگرؔ کے خطوط

۲۔ نگارشاتِ جگرؔ

مرتبہ: محمد اسلام

سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ غیر مجلد

قیمت ۱ : چار روپے، صفحات : ۲۵۶

" ۲ : دو روپے، " ۱۱۲

ملنے کا پتہ: دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

"مجھے اب تک جتنے خطوط دستیاب ہو سکے ان کو میں نے اس مجموعہ میں یک جا کر دیا ہے۔" اس اعلان کے ساتھ جگرؔ کے ۲۵ خطوط پیش کیے گئے ہیں۔ مرتب نے اپنے مقدمے میں خطوط نگاری اور اس کی تاریخ کے بارے میں لکھتے ہوئے جگرؔ کے خطوط نگاری پر تبصرہ فرمایا ہے۔ ان کا بیان اصاف اور رویّہ معقول ہے۔ انھوں نے جگرؔ کے خطوط کا مقام متعین کرنے میں دیانت اور متانت سے کام لیا ہے۔ وہ

"جگر کے خطوط میں نہ تو خوشگوار ادبی تجربے ہیں اور نہ ان میں ادب، تاریخ مذہب، اور فلسفہ ہی ہے۔ نہ نصیحت کا عنصر ہے، نہ فکر و نظر کی بلندی اور نہ ادبی رنگوں کی نقاشی ہے ان کا انداز بیان بھی زیادہ سلیس اور دل نشین نہیں ہے۔ بعض اوقات ایک ہی خط میں کئی کئی موضوعات پر نامکمل بحث کرتے ہیں اور اس بحث مباحثہ میں اصل بات کہنے سے رہ جاتی ہے۔ کہیں کہیں ان کے خطوط میں عبارت کی بے ربطی بھی ہے اس کے باوجود ان کے خطوط اُن کی سادگیٔ مزاج اور نیک طینتی و پاکیزہ قلبی کے آئینہ دار ہیں۔"

اور اصل بات ہے بھی اتنی کہ یہ جگر کے خطوط ہیں! ان کی طبیعت کے غماز خطوط کے بے ربط جملوں سے ہی جگر کی زندگی کا رابطہ اور ضابطہ اجاگر ہوتا ہے اور ان کی شرافتِ نفس کا احساس کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔

مرتب نے ہر خط کے مکتوب الیہ کے بارے میں ایک آدھ وضاحتی جملہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ لیکن اس معاملہ میں کچھ اور جانفشانی درکار تھی۔ مثلاً پہلے ہی دو خطوط کے بارے میں یہ جملہ کی" قدوائی صاحب سے راقم الحروف واقف نہیں ہے" محض عذر ہی نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ خطوط رسالہ جامعہ سے نقل کیے گئے ہیں، اور اس کے مدیر سے ہی اتنی بات بآسانی دریافت کی جاسکتی تھی۔

حضرت تسکین کی کتاب" مکاتیبِ جگر" کے بعد" جگر کے خطوط" ایک مفید اضافہ ہے لیکن اس باب میں ابھی بہت کچھ اضافے کی گنجائش ہے۔

نگارشاتِ جگر میں ۲۰ تحریریں ہیں جو موضوع سے زائد مصنف پر ہی روشنی ڈالتی ہیں اور ہمیں اسی نظر سے انھیں دیکھنا بھی چاہیے۔

جگر کے کلام کو ان کی اپنی زندگی میں ہی غیر معمولی شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔ بازار و راہ گزار سے لے کر تعلیم کی اعلیٰ جماعتوں تک ان کے نغمے سنائی دینے لگے۔ مگر شخصیت کی معصومیت اور شرافت سے آگاہی چند یارانِ خوش انفاس تک ہی محدود رہی۔ عوام انھیں رندِ آشام ہی سمجھتے رہے اور ان کی زندگی کے دورِ آخر کے انقلاب کو بھی بہت کم محسوس کیا گیا۔ اُن کے خطوط اُن کی نگارشات اور ان کے احباب کی یادیں ہی اُن کی شخصیت کی نقاب کشا

کا معتبر وسیلہ ہیں۔ اس لحاظ سے محمد اسلام صاحب کی یہ خدمت قابلِ ستائش ہے اور جو ایسے کام انجام دینے کے اہل ہیں ان کے لیے ایک دعوت بھی۔

عبداللہ ولی بخش قادری

آیاتِ فطرت

مرتبہ: دانش فرازی
صفحات: ۴۸، سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ایک روپے
ناشر: کے۔ ایم۔ نثار احمد
۴۳/۴۴۳ بری انّا سڑیٹ
بڑی میٹ۔ مدراس ۳

انسانی شعور کے سامنے جب کائنات کے مظاہر بے نقاب ہونے لگتے ہیں تو وہ اُن میں محو ہو جاتا ہے اور انھیں نگاہِ حیرت سے دیکھنے لگتا ہے۔ اُس کے دل میں طرح طرح کے سوالات اور خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ جذبات اُس کی رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں اور اس کے ذہن کو ایک "سفر بازیافت" پر آمادہ کرتے ہیں۔ دانش فرازی کی یہ منظوم تصنیف ذہن انسانی کے اسی سفر بازیافت کی گویا مختصر رپورتاژ ہے۔ ابتدائے آفرینش سے انسانی شعور جن منازل سے گزر کر اپنی منزل پر پہنچا ہے اس کا ارتقائی ذکر اس نظم میں کیا گیا ہے۔

اس مقدس سفر کے لیے دانش فرازی نے صحیفۂ خداوندی کی ابتدائی آیات یعنی سورۂ فاتحہ کی متبرک روشنی کو اپنا رہنما بنایا ہے اور مختلف تفاسیر بالخصوص جو عمرانی، تہذیبی اور روحانی اقدار کا احاطہ کرنے والی ہیں۔ ان کی روشنی میں سورۂ فاتحہ کے مطالب و معانی کو نظم کا جامہ پہنایا ہے اور اس طرح قوم کو بیداری کا سبق بھی دیا ہے۔

دانش صاحب کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے امید ہے اس کا مطالعہ قارئین کے لیے دل تسکین اور روحانی سرور کا باعث ہوگا۔

شبنم قادری

روداد

از: مولوی احترام الدین شاغل
صفحات: ۱۴۸ ، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت: پانچ روپے
ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو، تسلیم منزل۔ جے پور، راجستھان

"روداد" کل ہند اردو کانفرنس جے پور اور انجمن ترقی اردو، راجستھان کی ۱۲ سالہ قابلِ قدر خدمات کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ اس شمارہ کی بدولت جہاں حکومت کی بے اعتنائی اور وعدہ خلافی سامنے آتی ہے، وہیں پر اردو نواز حضرات کا عزم و استقلال، خلوص اور جد و جہد کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے کہ کس طرح انجمن کی مساعی کی بدولت ساہتیہ اکیڈیمی راجستھان نے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو وظیفہ دینے کا سلسلہ شروع کیا، سہ ماہی رسالہ "نخلستان" جاری کیا اور اردو کتابوں کی طباعت کی داغ بیل ڈالی۔ اس ضمن میں چیف منسٹر صاحب اور ناگر جی کے وعدے اور اوتار نرائن صاحب کی انصاف پسندی اردو دوستوں کے لیے فالِ نیک کی حیثیت رکھتی ہے۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں جے پور کانفرنس کا سہ روزہ اجلاس ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے جس میں گیارہ ریاستوں کے ۲۰۰ نمائندوں کے علاوہ ہندوستان کے کونے کونے سے ہر مذہب و ملت کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، معلموں اور مصنفوں، صحافیوں اور ناشروں نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انجمن کی تنظیم ملک کے بڑے حصے میں پھیلی ہوئی ہے پنڈت آنند نرائن ملّا کا خطبہ صدارت حق گوئی، بے باکی اور انصاف پسندی کا آئینہ دار ہے۔ لوگوں پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ اس کانفرنس نے فکر و عمل کی نئی راہیں کھولی ہیں، امیدوں کے کتنے چراغ روشن کیے ہیں اور خود اعتمادی اور مستقل مزاجی کی نئی روح پھونکی ہے۔

انجمن کی طرف سے حاضرین کے تفننِ طبع کے لیے محفلِ مشاعرے کا [illegible] کی پوری کارروائی ناظرین کی دلچسپی کے پیشِ نظر

تحریک اشاعت ہے۔
اس کے علاوہ حضوصی مہمانوں، کارکنوں اور شاعروں کی متعدد تصاویر سے بھی رسالہ کو آراستہ کیا گیا ہے۔ اگر اس شمارے کی کتابت اور طباعت کے معیار کا بھی خیال رکھا جاتا تو اچھا ہوتا۔ اس کے علاوہ مواد اور ضخامت کے پیش نظر اس رسالہ کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ بہرنو شاغل صاحب نے اس پرچہ کو بڑی محنت اور خوبی سے ترتیب دیا ہے جس کے لیے وہ قابل مبارک باد ہیں۔

انیس حسن

خیالات

از: یونس نگرامی ندوی
صفحات: ۶۴، سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ایک روپے پچیس پیسے
ناشر: مکتبہ طیبہ لکھنؤ

خیالات، آٹھ ممتاز علماء اور صاحب فکر ہستیوں سے انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ جن میں عبدالماجد صاحب دریابادی، سید مسعود علی صاحب ندوی، مولانا سعید اکبرآبادی، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، جیسے برگزیدہ اور صاحب فکر اشخاص بھی شامل ہیں۔

ان لوگوں سے جو سوالات کیے گئے ہیں وہ ان کی ذاتی زندگی، ان کے مختلف تاثرات اور تجربات پر بھی ہیں اور مختلف مسائل پر بھی۔ جن سے ایک طرف اُن کی ذاتی زندگی اور اس کے بعض پیچ و خم کا علم ہوتا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کے بعض سیاسی اور سماجی مسائل پر ان کی رائے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

انٹرویوز بہت مختصر ہیں۔ بعض سوالات کے جوابات میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سی باتوں کی طرف ہلکا سا اشارا ہی ہو سکا ہے اور اصل جواب کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

خیالات ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک دلچسپ کتاب ثابت ہوگی جو ان بزرگوں کے تجربات اور ان کی آرا سے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

تحسین صدیقی

ادبی خبریں

راجستھان ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے ادبی انعامات: راجستھان ساہتیہ اکیڈمی نے فیصلہ کیا ہے کہ امسال ۶۶-۱۹۶۵ء کے اکیڈمی انعامات بہترین کتابوں پر مندرجہ ذیل طریقہ سے دیئے جائیں۔ اس کے لیے راجستھان کے ادیب و فنکار اپنی معیاری تخلیقات دفتر اکیڈمی میں مندرجہ ذیل شرائط کے تحت ارسال فرمائیں۔ یہ تخلیقات ۳۰ر نومبر تک پہنچ جانی لازمی ہیں۔ تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت فرمائیے۔

جناب منگل سکسینہ
ادبی سکریٹری، راجستھان ساہتیہ اکیڈمی، اودے پور (راجستھان)

دلّی جو ایک شہر تھا: یکم ستمبر بزم ادب دلّی کالج کی جانب سے یادگار زمانہ شخصیتوں کی یاد میں ایک نشست "دلّی جو ایک شہر تھا" کے نام سے منعقد ہوئی۔ جناب نورالدین احمد (میر دلّی کارپوریشن) نے اس نشست کی صدارت اور جناب لالہ شام ناتھ صاحب (ڈپٹی دزیر ریلوے) نے افتتاحیہ تقریر کی۔

جناب جاوید وششٹ صدر شعبۂ اردو دلّی کالج نے معزز مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے بزم ادب دلّی کالج کی ادبی خدمات کا ذکر کیا۔ جناب مرزا محمود بیگ صاحب نے اپنی تقریر میں دلّی کی تہذیب کی یاد دلائی اور سامعین کو اپنی سحرالبیانی سے لطف اندوز کیا۔ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی نے دلّی کی تہذیب کو اجاگر کرتے ہوئے ایک روح پرور تقریر فرمائی اور جناب سید ضمیر حسن دہلوی نے اپنا مقالہ "دلّی والے" دلّی کی زبان میں پیش کیا۔ اس کے علاوہ سلمیٰ قریشی نے داغ دہلوی کی غزل اور ملاّل خاں صاحب استاد ٹیچرز ٹریننگ کالج جامعہ نگر نے مرثیہ دہلی پیش کیا۔ اس جلسہ میں یونی ورسٹی، اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ [illegible] پرانے بزرگ صاحبان نے بھی شرکت کی۔ اختتام پر جاوید وششٹ صاحب نے مہمانوں کا شکریہ [illegible]

سید جعفر عباس رضوی سکریٹری بزم ادب دلی کالج دہلی

غزل سرا (اُردو)

اُردو غزل گو شعراء میں سے ۱۲ مشہور شعراء کی غزلوں پر مجنوں صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مقالوں کا مجموعہ۔ یہ مقالے جو تنقید نگاری کے اصول اور معیار پر پورے اُترتے ہیں، نہایت دیانت داری۔ اور ذمّے داری کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ مجنوں صاحب کے ہاں تنقید کا پہلو زیادہ جاندار، زیادہ نمایاں اور زیادہ صحیح ہے اس لیے نئے تنقید نگاروں کو جن کے لیے یہ کتاب شمعِ ہدایت کا کام دے گی، اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

سائز $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$ صفحات — ۳۰۲

مجلّد قیمت: —— ۶/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

Regd No. D. 58

October, 19

Kitab Numa

JAMIANAGAR, NEW DELHI-25.

کتاب نما

ماہنامہ

نئی دہلی

دیوانِ غالب کے ا[illegible] یڈیشن

دیوانِ غالب اُردو ہندی	مرتبہ سردار جعفری	۳۰/
	ری عرشی	۲۰/-
مرقعِ چغتائی پاکستانی ایڈیشن	اہراہ	۱۰/-
دیوانِ غالب	مرتبہ امتیا[illegible] حسین	۲/-
دیوانِ غالب مصوّر	" مکتبہ شا[illegible]	
	ریس	۱/۵۰
دیوانِ غالب	" اعتقا[illegible]	
	الدین	۴/-
دیوانِ غالب	" نولکشو[illegible]	
		۴/۶۰
ترجمانِ غالب	سید شہاب[illegible]	
فرہنگِ غالب	امتیاز علی عرشی	
بیانِ غالب	آغا محمد باقر	۶/۲۵
مکمل شرح کلام غالب	عبدالباری آسی	۳/-
شرح دیوانِ غالب	جوش ملسیانی	۶/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

[illegible] غلام ربانی تاباں

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

[illegible] عباسی

جلد نمبر ۶ | نومبر ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۱۱

اشاریہ

۲۹ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنا ۴۵ واں یوم تاسیس منایا۔ اس موقعہ پر پرچم کشائی کی رسم ادا کی گئی اور شیخ الجامعہ جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب نے طلبہ اور اساتذہ سے خطاب بھی فرمایا۔ جامعہ کا سالانہ سہ روزہ تعلیمی میلہ جو پہلے اعلان کے مطابق یوم تاسیس کے دوسرے دن سے شروع ہونے والا تھا، موجودہ ہنگامی حالات کی وجہ سے بر وقت نہ ہو سکا۔ اب میلے کے لیے ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ نومبر کی تاریخیں مقرر ہوئی ہیں۔ اس تبدیلی کی وجہ سے مکتبہ جامعہ کا خاص ادبی پروگرام "فن اور فن کار" بھی بجائے ۳۱ اکتوبر کے اب ۱۳ نومبر کو بعد دوپہر ملتوی ہوا ہے۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے ہم اپنے وعدے کے مطابق "فن اور فن کار" کے بارے میں کوئی مضمون موجودہ شمارے میں نہیں شائع کر سکے ہیں۔ بہرحال امید ہے ہم آئندہ شمارے میں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے۔

مکتبہ جامعہ کا تعمیری کام برابر جاری ہے۔ ہم نے پچھلے مہینے جو نئی کتابیں شائع کی ہیں وہ ہر طرح قابل ذکر ہیں۔ ہماری پہلی کتاب "مثنوی گلزار نسیم" ہے جسے جناب رشید حسن خاں صاحب نے مرتب کیا ہے۔ کم سے کم قیمت پر شائع ہونے والے سلسلے کی "باغ و بہار" کے بعد یہ دوسری کتاب ہے۔ دوسری کتاب جناب سید سفارش حسین صاحب کی "اردو مرثیہ" ہے جس میں مرثیے کی تاریخ کے ساتھ سولھویں صدی سے بیسویں صدی تک جنوبی اور شمالی ہندوستان کی مرثیہ گوئی پر مفصل بحث اور تبصرہ کیا گیا ہے۔ تیسری اور چوتھی کتاب بالترتیب جناب رشید احمد صدیقی صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب کی "خندان" اور "دنیا کی کہانی" ہیں جن کے کافی عرصے کے بعد نئے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

سید احتشام حسین

کافرِ غزل

ورڈز ورتھ اور لی ہنٹ دونوں بلیک کو ذہنی طور پر بیمار یا مجنوں خیال کرتے تھے۔ لیکن یہ بلیک ہی تھا جس نے کہا تھا کہ ہر بڑے اور خلاق شاعر اور ادیب کو اپنی عظمت اور خلاقی کے تناسب سے، خود اس ذوقِ سلیم کے لیے فضا تیار کرنی پڑتی ہے، جس سے اس کے فن کی پرکھ کی جائے گی۔ اس قول میں سب سے اہم اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ بڑا فن کار اپنی تخلیقات میں ایسی فنی یا فکری قدروں کا اضافہ کرتا ہے جس کو پوری طرح پرکھنے کے لیے نئے ذہنی رویّہ اور نئے فنی سانچوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جس کے فراہم کرنے میں فن کار خود مدد کرتا ہے۔ یہ بات کسی اور کے لیے درست ہو یا نہ ہو، فراق گورکھپوری پر اچھی طرح صادق آتی ہے کیونکہ ان کی غزل گوئی نے اپنے عروج کی منزل پر جو سوالات پیدا کیے اسے خود ان کی تحریروں نے اکثر واضح کیا ہے اور اس طرح غزل سے متعلق جن بندھے ٹکے تصورات کا اظہار کیا جاتا تھا اس کی حدیں بہت وسیع ہو گئی ہیں اور اب نہ صرف ان کی غزل گوئی کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے بلکہ نفسِ غزل پر بھی خیال انگیز گفتگو ہو سکتی ہے۔ اس کے ایمائی اور علامتی پیکر میں وہ عناصر دیکھے جا سکتے ہیں جو امکانات بالقوۃ کی شکل میں اس میں پوشیدہ ہیں۔

غزل کے امکانات کا یہ انکشاف غالباً انھوں نے خود اپنی ذات اور شخصیت (اور اسی پردے میں انسان کی ذات اور شخصیت) کے امکانات کی جستجو کے سلسلہ میں کیا ہے۔ جدید تفکر پسند ذہن کی یہ بڑی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی ذات اور کائنات کے رشتہ کو سمجھنے کی کوشش میں اپنی ذات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا اور اس احساس کے باوجود کہ وہ تنہا اور کمزور ہے۔ اپنے اندر کائناتی تضادات اور تلاطم تصورات کا عکس دیکھتا ہے اور بہ یک وقت اپنی تنہائی اور زندگی میں بھرپور

حرکت کا احساس کرنے لگتا ہے۔ فراق کا ذہن اسی معنی میں بالکل جدید ہے۔ ان کے یہاں تصورات اپنی جدلیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ آتے ہیں اور اتنا ذہن کا نتیجہ یہ ہے کہ جذبات بھی پوری شدت سے بلندی اور پستی نیکی اور بدی، خوبصورتی اور بدہیئتی کا احساس کر کے ان میں معنوی رشتہ تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں اور اس کا اظہار ان کے فن میں کبھی تضادات کی یکجائی کی صورت میں، کبھی ایک دوسرے سے گریز کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس کی ایک شکل اور ہے جس کے تذکرے کے بغیر فراق کے فنی اور فکری نقطۂ نظر کا صحیح ادراک نہیں ہو سکے گا

ہم عام طور پر اپنے مطالعہ میں کلاسیکیت اور رومانیت کو دو متضاد یا متخالف قسمیں قرار دے کر اس طرح گفتگو کرتے ہیں گویا انھیں یک جا نہیں دیکھا جا سکتا۔ اکثر یہ بحث اسی طرح کی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے ہمہ گیر احساس میں ان کی پرچھائیاں ایک دوسرے کو کاٹ جاتی ہیں۔ کلاسیکیت میں روایت کے احترام کے ساتھ طریقۂ فن اور ظاہری تراش خراش پر زور دیا جاتا ہے۔ رومانیت میں جذبہ اور تخیل کے وفور پر ـــ لیکن حقیقت کیا ہے؟ تخلیقی عمل کی بھٹی میں یہ دونوں صورتیں مل کر ایک نیا پیکر اختیار کر لیتی ہیں روایتِ فن کا تسلسل بھی باقی رہتا ہے اور ایک ایسا نیا پن بھی پیدا ہو جاتا ہے جو حقیقت کے معنوی احساس سے وجود میں آتا ہے۔ خیالات اور جذبات کے جوش و خروش میں وہ ٹھہراؤ بھی دکھائی دیتا ہے جو زندگی میں ضبط و نظم کے احساس ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ فراق کی غزل میں یہ صورت بار بار نمایاں ہوتی ہے جس کی توجیہہ محض کلاسیکی اور رومانی اندازِ نظر کی تشریح اور تاویل سے نہیں کی جا سکتی۔ فراق نے زندگی کے اس شعور کی نفی نہیں کی ہے جو قدیم تھا اور اس شعور سے بدظن اور بیگانہ نہیں ہیں۔ جو آج کا عہد ہر حساس طبیعت رکھنے والے کے لیے فراہم کرتا ہے، اسی وجہ سے ہم تو فراق کی شاعری کو انقلابی کہہ سکتے ہیں اور نہ بندھی ٹکی روایتوں کی پیروی کرنے والی۔ بصیرت کی یہ منزل مطالعہ سے نہیں حاصل ہوتی، جاندار تخلیقی قوت، جو شخصیت کے تمام تضادات پر حاوی ہو جاتی ہے، حقیقت کے مختلف سروں کو ملا کر ایک کرتی ہے۔ اسی سبب سے فراق کے نظریۂ فن کو چند لفظوں میں بیان کر دینا آسان نہیں۔ والیری آرٹسٹ کے اندر شیطان کے وجود کو لازمی قرار دیتا ہے۔ کیونکہ وہ جذبہ کی شدت کے تصور کو بدی یا اسفلیت سے علیحدہ نہ کر سکا لیکن فراق یزداں اور اہرمن دونوں کے وجود سے فن کی تکمیل کی

طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں اندیشہ، اخلاق کے ساتھ فکر زمین بھی ہے، روایت کے ساتھ بغاوت بھی ہے۔ قدیم میں جدید اور جدید میں قدیم کی دھڑکنیں محسوس کرنے والا دل اور جنس کی کثافت میں لطافت، مادہ کی ثقافت میں روحانیت دیکھنے والا ذہن ہے۔ ان باتوں کا تعلق بصارت سے نہیں بصیرت سے ہے۔ بعض اشعار سے ذہن اور جذبہ دونوں کا یہ جدلیاتی عمل اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

صد مہر و قمر اس میں جھلک جاتے ہیں ساقی — اک بوند مئے ناب میں صد عالم امکاں
تیرنگِ روزگار میں کیف دوام دیکھ — ساقی کی مست آنکھ سے گردش میں جام دیکھ
لٹادے اپنی ظلمت، عام کر دے روشنی اپنی — حیات اپنی، ممات اپنی، ملال اپنا، خوشی اپنی
مرے دوستوں کو معمہ ہے مری نور و نار کی زندگی — جو ادھر چراغِ حرم کی لو تو ادھر بھی کفر ہے شعلہ زن

کبھی ہو سکا تو بتاؤں گا تجھے راز عالم خیر و شر
کہ میں رہ چکا ہوں شروع ہی سے گہے یزد و گہے اہرمن

قدیم فکریات میں جدید فکریات کے — ہزارہا اشارے پائیں گے تلاش شرط ہے

وہی آنکھ جام مئے حیا، وہی آنکھ جام جہاں نما
جو نگاہ اٹھتی نہیں کبھی، وہ نگاہ جاتی ہے چار سو

ظلمت و نور ہے عشق کی ہستی — تیرہ تیرہ تاباں تاباں
کون ترغیب ہوش دے کہ جنوں — بے خبر بھی ہے ہوشیار بھی ہے
ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے — نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس طرح کے اشعار دیکھنے کے بعد شاعر کے عمل تخلیق کے کچھ بھید کھلنے لگتے ہیں۔ اور قدیم و جدید فکریات کے درمیان ایک نازک جمالیاتی رشتہ کی تلاش کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ جس کی بنیاد محض وجدان پر نہیں رکھی جا سکتی بلکہ جس کی تہہ میں ایک طرح کا استدلال انداز بھی کار فرما ہے جس درجہ درجہ حیات نے تفکر کے مقابلہ میں وجدان سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ اگر اسے جدلیاتی جمال پرستی یا جمالیاتی جدلیت کے نام سے موسوم کیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ یہی ان کے لہجے، ان کی آواز، ان کے اسلوب اور ان کے فکری سرمایہ کی انفرادیت ہے جو انہیں بڑے ریاض سے حاصل ہوئی ہے اور جس نے اردو غزل کو ایک نئے حسن [illegible]

ایک نئے توانا اسلوب سے آشنا کیا ہے۔

جس نے بھی فراق کی تحریریں پڑھی ہیں اور ان کی غزل گوئی کی ارتقائی منزلوں کا گہرا مطالعہ کیا ہو اسے یہ دیکھنے میں بالکل دشواری نہیں ہوگی کہ وہ ابتدا میں تقریباً ایک روایتی اسلوب کی تقلید کرتے تھے لیکن چونکہ ان کے پاس خوب سے خوب تر کی جستجو کرنے والا ایک سیماب صفت اور جولان در قصدہ ذہن تھا۔ اس لیے وہ بڑی خوبی سے اس کی گرفت سے آزاد ہوگئے۔ اس کے محاسن کو سمیٹتے ہوئے وہ ایک دوسری منزل کی جانب چل پڑے روایت کے گہرے شعور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود اپنے اسلوب کے خط وخال دکھائی دینے لگتے ہیں اور ہزاروں آوازوں میں اپنی آواز کا مخصوص آہنگ سنائی دینے لگتا ہے۔ ذوق تخلیق شعور کا سہارا لے کر انفرادیت کو نکھارتا ہے اور حقیقتوں کو نئے رشتوں میں مربوط کر کے اپنے انداز سے پیش کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس طرح اپنی ذات کا عرفان خود شاعر کو بھی ہوتا ہے اور دوسرں کو بھی تکمیل کی خواہش ریاضت پر اکساتی ہے اور وہ جد و جہد جاری ہوتی ہے جس میں اس کا شعور اپنی شخصیت کی پوری طاقت سے سرگرم عمل ہوتا ہے۔

فراق کی غزل گوئی اس معنی میں ان کے عاشقانہ تجربوں یا فکری میلانات کی ترجمانی نہیں ہے جسے عرف عام میں "واردات قلبیہ" یا "امور ذہنیہ" کا اظہار کہا جائے گا۔ اس میں وہ رباعی بعض بھی شامل ہے جو علم اور فنون کی دین ہے۔ اس طرح ان کی شاعری ایک ایسے شخصیت عنصر کی حامل بن جاتی ہے جو نفسیاتی اعتبار سے شخصیت کے بعض پہلوؤں کا مظہر ہونے کے باوجود کائناتی ہے کیونکہ یہاں اپنے میں کائنات کو سمو لینے کی خواہش شدت کے ساتھ پائی جاتی ہے اسی وجہ سے فراق کی شاعری کے سلسلے میں آفاقیت کا ذکر بار بار آتا ہے۔ یہ آفاقیت عصریت کی نفی نہیں کرتی اور سچ تو یہ ہے کہ آفاقیت کا تصور عصریت ہی کے پردے میں ہوتا ہے۔ ہر اچھے فن کار کے اندر اس کا عہد سانس لیتا ہے اور فراق ان کی صدی بولتی ہے اس کا وہ شعور بولتا ہے جسے زندگی کے تجربات نے تقاضوں سے ابھارا اس لیے یہ سوچنا کہ یہ آفاقیت عصریت سے خالی، تاریخ اور نفسیات کے غلط تصور کا نتیجہ ہوگا جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے کہ جدلیت کا پیچیدہ عمل دونوں کے تصور میں شامل ہوتا ہے اور حقیقتیں ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک دوسرے میں پیوستہ رہتی ہیں ایسا نہ ہوتا تو حقیقت وحدت ہی میں نہ آتے۔ فراق کی بعض تحریروں سے

یہ شک ہوتا ہے کہ وہ افادیت اور عصریت سے الجھتے ہیں۔ اس کا سبب غالباً افادیت اور عصریت کا وہ ان گڑھ اور سطحی تصور ہوگا جسے سماجی علوم نے عام کیا ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر عصریت اور افادیت کے گہرے احساس اور وقت کے الجھے ہوئے رشتوں کے درمیان مرکزی نقطہ کو گرفت میں لینے ہی کا نام آفاقیت اور ابدیت ہے۔ فراق کی غزل گوئی میں تغیر کا جو گہرا شعور ملتا ہے وہ بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آفاقیت اور ابدیت کا تصور ان کے یہاں مجرد اور مطلق نہیں، جستجوئے حسن، جستجوئے خیر اور جستجوئے حقیقت کی ارتقائی اور ازلی کشمکش کی ایک شکل ہے۔ اگر ہم اس بات کو نہ سمجھیں تو فراق کے یہ خوبصورت شعر بے معنی معلوم ہوں گے۔

اس دور میں زندگیِ بشر کی بیمار کی رات ہو گئی ہے

ہوئی ختم صحبتِ میکشی، یہی داغ سینوں میں بچ رہے
کہ طلوع ہونے سے رہ گئے کئی آفتاب خم و سبو

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
یاد سی آکے رہ گئیں دل کو کئی کہانیاں

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

طبیعت اپنی جب گھبراتی ہے سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

زمیں جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل وہ رات ہے کہ کوئی ذرہ محوِ خواب نہیں
ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی ابھی حیات کے چہرے پر آب و تاب نہیں

بس اک تسلسلِ تغیرِ حال قائم ہے
نصیبِ عشق فنا و دوام بھی تو نہیں

وقت کے زندہ تصور کے بغیر ایسے اشعار نہیں کہے جا سکتے۔ ان میں سے ہر شعر عصریت سے ابدیت کی طرف ایک پرواز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی صورت تصور مکاں کی بھی ہے، جس میں قومیت اور آفاقیت، قومی تہذیب اور انسانی [illegible] ل جاتی ہیں۔ اور آفاقی تصورات کے اندر سے ہندوستانیت کا رنگ [illegible]

پھوٹ نکلتا ہے۔ لیکن اس وقت مجھے اس کا تذکرہ نہیں کرنا ہے۔ صرف اس حقیقت پر زور دینا ہے کہ استدلالی اور جدلیاتی ذہن اسی طرح کام کرتا ہے اور اسی طرح کر سکتا ہے۔ اسی ذہن کی گرفت میں حقائق کی زندہ رگ آسکتی ہے۔ سادگی سے یہ کہہ دینا کہ افادیت اور عصریت فن کے منافی ہیں، بصیرت کا حامل نہیں ہے۔

میں نے فراق کے طرز فکر کو جمالیاتی جدلیت کہا ہے تاکہ ان کی غزل گوئی کے سبھی پہلوؤں کی وضاحت اس طرح ہو سکے کہ کلاسکیت اور رومانیت، ارضیت اور آفاقیت، عصریت اور ابدیت، گناہ اور ثواب، خیر اور شر، جنسی آلودگی اور جنسی پاکیزگی کی معنویت کو ایک وسیع تر نظام فکر میں سمویا جا سکے۔ لیکن شاید بات زیادہ واضح نہ ہوئی ہو اس لیے چند جملے اور لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

صرف نفسیات ہی میں نہیں سماجی اور فطری سائنسوں کے تجزیہ میں بھی عناصر کے باہمی کھنچاؤ اور تناؤ کا ذکر بہت آتا ہے کیونکہ ان سے عمل کے بہت سے بھید کھلتے ہیں۔ انسانی ذہن بھی بہت سے حقائق کا ادراک اسی طرح کرتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے جذبے اور خیال کی تہہ میں کوئی تناؤ ہی رد عمل پیدا کر کے اسے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔ یہ تناؤ فرد میں اپنی ذات کے اندر باطنی جذباتی کشمکش سے بھی وجود میں آسکتا ہے اور فرد کے دوسرے افراد یا سماج کے کسی حصہ سے کھنچاؤ کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ جدلیاتی اصطلاح میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اضداد کے تناؤ سے نئی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کی لاتعداد شکلیں ہو سکتی ہیں۔ فن کی سطح پر یہ عمل معنی اور لفظ، مفہوم اور صورت، احساس اور اظہار کی کشمکش کے روپ میں نمایاں ہوتا ہے جہاں ان دونوں صورتوں کے درمیان آنکھ مچولی ہوتی رہتی ہے۔ اور فن کار کا تخلیقی ذہن اسے فنی پیکر دے دیتا ہے۔ فراق کی نظم و نثر میں اس کا عمل بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ الفاظ نہ تو آفاقی ہوتے ہیں اور نہ کائناتی لیکن فراق کے ذہن اور جذبے سے چھو جانے کے بعد ان کی معنوی حدیں بدل جاتی ہیں۔ ان کا ذہن بھی حقائق زندگی کی تلاش میں نقطوں سے نقطوں تک جا کر روابط تلاش کرتا ہے لیکن یہ نقطے خط مستقیم نہیں بناتے۔ جس نے ایٹمی ذروں کی حرکت کی تصویر دیکھی ہو گی، اسے خیال ہو گا کہ وہاں بھی حرکت نقطے سے نقطے تک ہوتی ہے۔ لیکن سیدھی

نہیں، تاہم ان کا ربط باہمی بالکل نمایاں ہو جاتا ہے اور یہی نہیں ان لفظوں کو ملانے سے ایک خوبصورت منقش سانچہ بن جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جذباتی اور ذہنی کشمکش اور تناؤ کو اپنی شدت اور نوعیت کے لحاظ سے نئے جمالیاتی سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے لیکن یہ عمل میکانکی نہیں ہے، صلاحیت چاہتا ہے جو فن کار کائنات کے دل کی دھڑکن سن اور سمجھ سکتا ہے، وہی اسے الفاظ میں بھی قید کر سکتا ہے۔ فراق کے ذہن میں جو بجلی کی طرح کوندے پیدا کرنے والی تابندگی ہے وہ ان کے جذبات کو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ دیتی ہے اس لیے ان کے قلم سے وہ اشعار نکلتے ہیں جو فکر اور جذبے کے امتزاج کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اگر ان کی غزلوں کے تہہ دار اشعار کو ان معروضات کی روشنی میں دیکھا جائے گا تو نہ صرف ان کی عشقیہ شاعری کی نرمی اور گرمی کا راز معلوم ہوگا، بلکہ ان کی فکری شاعری کی جدلیاتی پیچیدگی بھی واضح ہوگی ذرا ان اشعار کو دیکھیے۔

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا، کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

کب اپنے ہوش میں شبِ غم کائنات ہو
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

وہ اک ذرا سی جھلک برقِ کم نگاہی کی
جگر کے زخم نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا

پیامِ حسن، پیامِ جنوں، پیامِ فنا
تری نگہ نے فسانے سنائے ہیں کیا کیا

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بیجا بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا مقام
کنجِ زنداں بھی نہیں، وسعتِ صحرا بھی نہیں
قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن
آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
لہرا رہی ہیں گردشِ خوں میں حقیقتیں
وہ کون زندگی ہے کہ باطل کہیں جسے
عہد و پیماں کوئی حسن بھی کیا کرے
عشق بھی تو ہے کچھ بدگماں بدگماں
جیسے کوئی زمیں کے دل پہ ہو بوجھ سا
عشق سے حسن ہے سرگراں سرگراں
کیوں فضاؤں کی آنکھوں میں تھے اشک سے
وہ سدھارے ہیں جب شادماں شادماں
خیالِ گیسوئے جاناں کی وسعتیں نہ پوچھ
کہ جیسے پھیلتا جاتا ہو شام کا سایہ
بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی
اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی
اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

کون بتا سکے گا ان اشعار میں جو عشقیہ بھی ہیں، تفکرانہ بھی، خیال اور جذبے کی حدیں ایک دوسرے سے کہاں الگ ہوتی ہیں! یہی فراق کی غزلوں کی وہ کافرادائی ہے جس پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

فانی بدایونی

غزل

کی وفا یار سے، ایک ایک جفا کے بدلے
ہم نے گِن گِن کے لیے خونِ وفا کے بدلے

کی سپردِ درِ بُت خانہ، اجل نے مری خاک
کِس کو سونپا مجھے ظالم نے، خدا کے بدلے

لطف، بیداد، حیا، غصّہ، تغافل، شوخی
رنگ کیا کیا نہ تلوّن نے ادا کے بدلے

ہائے میں کشتۂ اندازہوں یارب، کس کا
حور آئی مجھے لینے کو، قضا کے بدلے

تیر سے، تیغ سے، خنجر سے، سناں سے مارا
کئی پہلو مرے قاتل نے قضا کے بدلے

کفن، اے گردِ لحد نہ میلا ہو جائے
آج ہی ہم نے، یہ کپڑے ہیں نہا کے بدلے

عشق، اللہ بچائے وہ مرض ہے فانی
زہر بیمار کو دیتے ہیں دوا کے بدلے

("کلیاتِ فانی" صفحات ۳۴۴ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد قیمت ۷/ حوالہ صفحہ ۲۲۴، ۲۲۵)

قدسیہ زیدی

آذر کا خواب

کا

پہلا ایکٹ

برسات کا موسم ہے۔ پھوار پڑ رہی ہے۔ دلی میں پھول والوں کی سیر کا زمانہ ہے۔ مہرولی میں میلہ بھر چکا ہے۔ کارخندار، رؤسا، گلنے والیاں جوق جوق چلی آ رہی ہیں بہشتی کٹورا بجا رہے ہیں ساقی حقہ پلاتے پھر رہے ہیں۔ خوانچہ والے جگہ جگہ اپنا سامان لیے بیٹھے ہیں۔ ایک بارگی زور سے پانی کا ریلا آتا ہے۔ مجمع چھٹ جاتا ہے۔ ایک پیڑ کے نیچے ایک معمر عورت اور اس کی لڑکی کھڑی ہیں۔ دو تین آدمی اسی پیڑ کے نیچے ذرا ہٹ کر کھڑے ہیں۔ ایک آدمی سب سے الگ ایک نوٹ بک ہاتھ میں لیے بڑے انہماک سے کچھ لکھ رہا ہے۔

خورشید: ناک میں دم کر دیا۔ اس کم بخت بارش نے نہ جانے فرید کہاں جا کر بیٹھ گیا۔ بیس منٹ سے زیادہ ہو گئے اسے گئے ہوئے۔

بیگم باقر: نہیں بیٹی اتنا وقت تو نہیں ہوا۔ مگر پھر بھی اب تک اسے گاڑی لے کر آ جانا چاہیے تھا۔

راہ گیر: (رامپوری لہجہ) اتنے وخت گاڑی کا ملنا مشکل ہے کہیں آٹھ ایک بجے ملے تو ملے جب سواریاں ٹھکانوں پہنچ لیویں گی تو شاید مل جاوے۔

بیگم باقر: یہ تو بُرا ہوا۔ بھلا تب تک ہم کیوں کر کھڑے رہیں گے۔

بیٹی: تو اماں آؤ میلہ دیکھیے۔ یہ میلہ ہمارے طبقے کے لوگوں کے لیے نہیں ہوتا ہے

راہ گیر: (طنزیہ لہجہ) اجی بے فضول پریشان ہوا نچنت ہو کے بیٹھ جاؤ۔ ابھی

جا دے ہے گاڑی۔
خورشید: اگر فرید میں ذرہ برابر بھی عقل ہوتی تو درگاہ کے دروازے سے پکڑ لاتا گاڑی۔
بیگم باقر: تم تو بے کار کی باتیں کرتی ہو۔
خورشید: جی دنیا بھر کو مل سکتی ہے گاڑی اور نہیں ملتی تو فرید کو۔ (فرید ٹپکتا ہوا چھاتا لے کر اندر آتا ہے) نہیں ملی نہ گاڑی؟
فرید: کسی بھاؤ نہیں ملی۔ معلوم ہوتا ہے سب کی سب گاڑیاں شہر کی طرف نکل لیں۔
خورشید: کیا مصیبت ہے۔ تو تمہارے خیال میں ہم خود جا کر لائیں گے گاڑی۔
فرید: بتا تو دیا کہ سب چلی گئیں۔ ایکا ایکی بارش ہونے کی وجہ سے لوگ جلدی لوٹ گئے۔
بیگم باقر: بیٹے سو پچاس قدم آگے بڑھ کر ڈھونڈی ہوتی۔
فرید: اماں میں تو قطب صاحب کے دروازے تک ہو کر آیا مگر ہو بھی کوئی گاڑی۔
خورشید: جھوٹا کہیں کا۔ بس کھڑا باتیں بنا رہا ہے۔
بیگم باقر: واقعی فرید تم اس قدر بے کارا اور اپاہج ہو کہ .... جاؤ ایک بار پھر دیکھ کر آؤ۔ اور خبردار جو خالی ہاتھ لوٹے۔
فرید: فضول پریشان ہوتا پھروں گا اماں۔
خورشید: تو کیا یہیں کھڑے رہیں۔ خود غرض کہیں کا۔
فرید: تو میرا کیا ہے۔ میں پھر چلا جاتا ہوں۔ (امرود والی اندر آتی ہے۔ فرید جلدی میں اس سے ٹکرا جاتا ہے۔ امرود والی کے سب امرود زمین پر بکھر جاتے ہیں۔)
امرود والی: مالی ٹلا کہیں کا ہمرے امرود سب لے کر بکھرائے دہیں۔
فرید: معاف کرنا میں جلدی میں ہوں (جاتا ہے)
امرود والی: (زمین پر بیٹھ کر امرود سمیٹنے لگتی ہے۔) ارے الو، تری کا تیج تو پھوٹی نا ہیں گئی ہے۔ پاجی بٹا پھرید صاحب بنا پھرت ہے۔
بیگم باقر: لڑکی تمھیں میرے بیٹے کا نام کیوں کر معلوم ہوا۔
امرود والی: اچھا، تو یو تمرا لونڈا ہوئے۔ لاؤ دواؤ ہمرے امرودن کے دام۔

خورشید: خدا سنتا تو اس بدتمیز کنجڑن کی باتیں۔ چھوڑو اماں۔
بیگم باقر: نہیں بیٹی، کیا تمھارے پاس کچھ چھٹے پیسے ہیں؟
خورشید: نہیں اٹھنی سے کم کوئی سکہ نہیں۔
امرود والی: روپیہ تڑواوے کٹ ہوئے تو لاؤ میکا دیو۔
بیگم باقر: (بیٹی سے) لاؤ اٹھنی لاؤ (بیٹی لے دلی سے دیتی ہے) لویہ رہے
تمھارے امرودوں کے دام۔
امرود والی: اللہ تمرا بھلا کرے۔ میں تو سمجھی رہوں کہ مورے امرودوں کا ناس
ہوئی گوا۔
خورشید: اماں باقی کے دام اس سے واپس لے لیجیے۔ امرود مشکل سے دونی کے
ہوں گے۔
بیگم باقر: زیادہ بکواس مت کرو۔ لڑکی تم سب دام رکھ لو۔
امرود والی: تمرے بچے جیئں۔
بیگم باقر: اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم اس نوجوان کا نام کیوں کر جانتی ہو؟
امرود والی: ہم تو اوئی کا نام نا ہیں لئے رہوں
بیگم باقر: میں نے خود سنا تھیں اس کا نام لیتے ہوے۔ اب مجھ سے جھوٹ
تو بولو نہیں۔
امرود والی: اری جاؤ، جھوٹ کون بولی ہے۔ میں تو ایسن کہہ دیئے ہوئی ہوں
پھرید، مرید، بندو گیر آدمی کے لیے سبے نام ٹھیک ہیں۔
خورشید: (ماں سے) ہیں موری میں پھینک دیئے تم لے آٹھ آنے۔ غریب فرید ہی
کو دے دیئے ہوتے (خفا ہو کر درخت کے پیچھے چلی جاتی ہے)۔
(فرحت بارش سے بچنے کے لیے پیڑ کے نیچے کھڑا ہو جاتا ہے
پاجامے کے پائینچے فرید کی طرح بھیگ رہے ہیں۔)
فرحت: لاحول ولا قوۃ! مزا کرکرا ہو گیا میلے کا۔
بیگم باقر: ہاں ابھی رک جائیے تو میلہ جم جائے گا۔
فرحت: (آسمان کو دیکھ کر) فی الحال تو بارش رکنے کے کچھ آثار ہیں نہیں پچھلا

دوچار منٹ سے تو اور دھواں دھار ہوگئی ہے۔ (امرود والی کے قریب
کھڑے ہوکر تیلون کے پائنچے ٹھیک کرتا ہے)۔

امرود والی: بارش بڑھ گئی ہے تو اب سمجھ لیو تھمے جئی ہے۔ تم پھکر نہ کرو۔ بابوجی
بس تھوڑے سے امرود لے لیو۔

فرحت: افسوس ہے میرے پاس ریزگاری نہیں۔

امرود والی: ارے کپتان صاحب، ریزگاری کی کون پھکر ہے۔ لاؤ میکا دیو
روپیہ میں ترڑائے دیہوں۔

فرحت: میرے پاس اس وقت صرف دس دس کے نوٹ ہیں۔

امرود والی: ارے لیو کپتان صاحب، پانچ روپیہ کی ریزگاری مورے
پاس ہوئی ہے........ لو، دوئی آنے کے ہیں۔

فرحت: کیوں ناک میں دم کر رہی ہو۔ اچھی لڑکیاں یوں دوسروں کے سر نہیں
ہوا کرتیں۔ میرے پاس واقعی ٹوٹے ہوئے پیسے نہیں ہیں۔ (جیب ٹٹولتے
ہوئے) رکو، نکل آئی اکنّی (دیتے ہوئے) لو یہ لو۔

امرود والی: (مایوسی سے) لاؤ اچھا یہی سہی (فرحت چلا جاتا ہے)۔

راہ گیر: (بھوپالی لہجے میں) ذرا خبردار، پیسے لے کر امرود تو دے دئے ہوتے
وہ دیکھو تمھارے پیچھے کھڑا ہوا ایک آدمی تمھاری سب باتیں لکھتا
جا رہا ہے۔

(سب مڑ کر دیکھتے ہیں)

امرود والی: (خوف زدہ ہوکر)۔ میں بابوجی سے بات کئے کے کونسا گناہ کیوں،
میں تو اپنے پھل بیچت ہوں۔ تم میکا کوئی ایسی ویسی لونڈیا نہ سمجھ لیو۔ میں
سربھلے جات کی ہوں، ہاں اتنا جرور کہی رہوں کہ بابوجی امرود لے لیو۔

(ہل چل۔ سب کی ہمدردی امرود والی کے ساتھ ہے۔ آوازیں
کیوں لڑکی کو تنگ کر رہے ہو۔ غریب کا ناک میں دم کر دیا۔ بات
کا بتنگڑ بنا ڈالا۔ کیوں مانگے اس نے کپتان سے پیسے۔ وغیرہ وغیرہ)

امرود والی: ہائے میکا بچاؤ، نہ جانے کا ریٹ ماں [illegible] ارت [illegible]

ناک کٹری ہے۔ لڑکی کی اجت رہے تو نسے کچھ ہے یو تو میکا کہیں کا نہ
چھوڑی ہے۔ (روتی ہے)

آذر : (لکھنا چھوڑ کر دائیں کو آتے ہوئے) ارے ارے کون تمھیں کچھ کہہ رہا ہے! بے وقوف لڑکی، تم کیا سمجھ رہی ہو مجھے!!

راہ گیر : (دلی کے کارخندار کا لہجہ) اجی لونڈیا تمھیں خفیہ کا آدمی جان رہی ہے مخبر۔

آذر : مخبر!

دوسرا راہ گیر : جی جو چپکے چپکے لوگوں کی رپٹ لکھا کرتے ہیں۔

امرود والی : قسم لے لیو جو میں کوئی ایسی ویسی بات کہے ہوں مخبر صاحب۔

آذر : (غصے میں)، بکومت، کیا میں تمھیں صورت سے پولیس والا لگتا ہوں۔

امرود والی : اوز مینی کا، پھر موری باتیں سب ای کتاب اں کاہے کو لکھت ہو
میں کا جانوں تم کا کا لکھے ڈالت ہو۔ لاؤ تنیٔ دکھاؤ تو اپنی کتاب۔
(کاپی لے کر دیکھتی ہے اور لوگ بھی لکھنے والے کے کندھے کے
اوپر اچک اچک کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں) ای کا کیڑے
مکوڑے بنائے ہو؟

آذر : اَن پڑھ، جاہل، لاؤ میں پڑھوں (پڑھتا ہے) بارش بڑھ گئی ہے تو اب سمجھ لیو تھم جیئی ہے۔ تم بکر بکر نہ کرو، بابوجی بس تھوڑے سے امرود لے لیو۔

امرود والی : بھلا یہ کون سی لکھے کی بات ہوئے۔ میں بولیہوں تو اپنی بولی بولیہوں اور کا بولیہوں توری بولی؟ جرا دیکھو تو کیسی نکلیں آتارت ہے۔

آذر : تمھیں کون روکتا ہے۔ تم اپنی بولی بڑے شوق سے بولو۔ گنوارو بولی۔

راہ گیر : آپ کو کیا حق ہے کہ آپ کسی کی بولی کی مذمت کریں۔ یہ اپن کو پسند نہیں

آذر : آپ بھوپال سے تشریف لائے ہوں گے۔

راہ گیر : آپ سے کس نے کہا، میں بھوپال کا رہنے والا ہوں۔

آذر : (لڑکی سے) تم بارہ بنکی کی رہنے والی ہو۔ یہاں دلی میں کیا کر رہی ہو۔

امرود والی : کاہے، کا بارہ بنکی کا چھوڑنا کوئی گناہ ہوئے۔ پیٹ کی خاطر آدمی سے کہیں جانا پڑت ہے (زور زور سے روتی ہے۔)

آذر: تمھیں روکتا کون ہے، جہاں تمھارا جی چاہے رہو۔ مگر رونا دھونا بند کرو۔

امرود والی: (سوچ میں پڑجاتی ہے اور ٹوکری کی طرف تکتی ہے۔ پھر جیسے خود سے باتیں کر رہی ہے) میں سریچھ جات کی ہوں سریچھ۔

دوسرا راہ گیر: (آذر سے) اچھا صاحب یہ بتایئے کہ میں کس مقام کا رہنے والا ہوں۔

آذر: حیدرآباد دکن کے۔

راہ گیر: (حیدرآبادی لہجے میں) واللہ آپ کو تو جیسے الہام ہوتا ہے، آپ کیسے معلوم کر لیتے ہیں۔ اپن کی سمجھ میں آیا نہیں۔

امرود والی: دیکھو ہو، کھبردار، مورے ملے میں نہ پڑیو۔

راہ گیر: (مظفر نگری لہجہ) تمھارے ملے میں کون دکھل دے ہے (آذر سے) میاں کیوں بے فضول لونڈیا کو حیران کر دو۔

امرود والی: ای کے جو جی ماں آوے کرے۔ ہیں تو ای سے بھر پایوں۔

راہ گیر: (پنجابی لہجہ) اجی غریبوں کو ستانا جانتے ہو کسی بڑے آدمی کو دباؤ تو جانوں۔

تیسرا راہ گیر: (پٹھان کا لہجہ) ہم تمھارے سے یہ پوچھتا ہے کہ بتاؤ یہ کہاں سے آیا ہے۔

آذر: ملتان کے آس پاس کے علاقے سے اور آپ پشاور سے۔

(قہقہے۔ اور مختلف آوازیں۔ اجی جادوگر ہے جادوگر۔ سب کچھ جانتا ہے، علم غیب جانتا ہے، سب ٹھیک بتاتا ہے، وغیرہ وغیرہ)

فرحت: جناب عالی کیا یہ آپ کا پیشہ ہے؟

آذر: ہے تو نہیں مگر بنانا چاہتا ہوں۔ شاید کسی دن یہ امید بر آئے۔

(بارش بند ہو جاتی ہے۔ مجمع چھٹ جاتا ہے۔)

امرود والی: بڑا آیا سریچھ لڑکپن کے ما ملن میں دکھل دینے والا۔

خورشید: (امرود والی کو دھکا دیتی ہے جو آذر سے جا کر ٹکراتی ہے آذر اسے [illegible] ہاتھوں سے تھام لیتا ہے۔ بجلی اور گرج کی آواز آتی ہے۔ [illegible]

فرد کیاں غارت ہوگیا کھڑے کھڑے پنڈلیاں شل ہوگئیں۔

آذر: پنڈلیاں شل ہوگئیں۔ (دیکھتا ہے) لکھنؤ سے تشریف لائی ہیں۔

خورشید: آپ اپنی بے ہودہ رائے محفوظ ہی رہنے دیجیے۔

بیگم باقر: (آذر اور خورشید کے درمیان آتے ہوئے) آپ واقعی درست فرما رہے ہیں، ہم لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔

آذر: (لڑکی سے) کیا، آپ کو گاڑی چاہیے۔

خورشید: آپ مجھ سے گفتگو کرنے کی زحمت نہ فرمائیں۔

بیگم باقر: خدا کے واسطے خورشید، سیدھی بات کا اوندھا جواب کیوں دیا کرتی ہو (آذر سے) جناب عالی، اگر آپ ہمیں گاڑی لا دیں تو ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہوں گے۔ (آذر سیٹی بجاتا ہے)۔

راہ گیر: (پٹھان) ہم نہ کہتا تھا کہ یہ پولیس کا آدمی ہے۔

امرود والی: یو موری اجت با کاہے کا ہاتھ ڈالے۔ کا موری اجت بیگمن کی اجت سے کم ہے۔

آذر: آپ صاحبان نے خیال کیا یا نہیں کہ بارش بہت دیر سے تھمی ہوئی ہے۔

راہ گیر: ہاں ٹھیک تو ہے۔

راہ گیر ۲: (پنجابی) آپ نے پہلے کہنا تھا۔ گھنٹوں سے کھڑے بے کار باتوں میں وکت ضائع کر رہے تھے۔ (جاتا ہے)۔

امرود والی: تو پھر سب جنن پر رعاب کیسے گٹھی ہے پر کوئی ای کے رعب میں آئی ہے کا ہے۔

بیگم باقر: اب تو مطلع بالکل صاف ہے۔ خورشید چلو چل کر فرید کو راستے میں سے لے لیں۔ آؤ (کپڑے سمیٹ کر جاتی ہے) مگر گاڑی (ماں دور نکل چکی ہے) کیا بدتمیزی ہے (غصّے میں جاتی ہے۔ صرف امرود والی آذر اور فرحت رہ جاتے ہیں۔)

امرود والی: ہائے بے چاری لونڈیا۔

فرحت: (آذر سے) آپ اپنے فن کے ماہر معلوم ہوتے ہیں، غیر معمولی علم ہے۔

نہیں کوئی ایسی غیر معمولی بات تو نہیں۔ یہ علم الصوت ہے۔ اس ملک میں مگر لوگوں نے اس فن کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی اس لیے اس علم نے زیادہ ترقی نہیں کی۔ اس فن کو در اصل میں اپنا پیشہ بنانا چاہتا ہوں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ دلی والے کی گفتگو سن کر میں یہ تک بتا سکتا ہوں کہ وہ کون سے محلّے کا رہنے والا ہے اور کیا کام کرتا ہے۔

امرود والی : بے سرم۔ دوسروں کی نکل اتارت ہے۔

فرحت : بڑا دلچسپ پیشہ ہے۔

آذر : ہاں اکثر نو دولتے مجھ سے رائے لینے آتے ہیں اور چند دن کی مشق کے بعد ان کا لب و لہجہ بہت کچھ درست ہو جاتا ہے۔

امرود والی : ارے کا تم ای بہرُکا ٹھیکا لیے ہو۔ جاؤ کہیں اور کا ہے نہیں جات ہو۔

آذر : عورت تم اپنی بکواس بند کرو۔ اور درگاہ کے سامنے جا کر اپنا سودا بیچو۔

امرود والی : ہاں تم تو میاں رہ سکت ہو اور دوسرے جائیں درگاہ کے در دیچ پا۔

آذر : جو عورت اس قدر بھونڈی باتیں کرے اُسے یہاں ٹھہرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسے زندہ رہنے کا حق نہیں۔ (جوش میں آکر) اے عورت یاد رکھ کہ تو عورت ہے، اور طاقتِ گفتار پروردگار کی دی ہوئی ایک بہت بڑی نعمت ہے تیری زبان میرؔ و غالبؔ کی زبان ہے وہاں بیٹھ کر کڑک مُرغی کی طرح مت کڑکڑاؤ۔

امرود والی : تمرے مرے مرجایئ۔ تم تو ہمرا پیچھا ہی لے لیے ہو۔

آذر : (کتاب نکالتے ہوئے) واللہ کیا محاورہ ہے کیا تلفظ ہے ذرا دھرانا تو تمرے مرے مرجایئ، تم تو ہمرا پیچھا ہی لے لیے ہو۔

امرود والی : نکل کھٹا بندر۔

آپ نے دیکھا اس کا تلفّظ۔ یہ تلفّظ، یہ بولی اُسے عمر بھر غلیظ موری میں سے نہیں نکلنے دے گی۔ مگر میں شرط لگاتا ہوں کہ تین مہینے کے اندر اندر میں اس کے

قلعہ معلیٰ کی شہزادیوں کی زبان بلوا سکتا ہوں اور اس کا شمار پڑھے لکھے شرفا میں ہو سکتا ہے۔

امرود والی : تیئں پھر تو کہو۔ کا کہت رہو۔

آذر : مرگھنی گائے۔ تم، تم اس سرزمین پر ایک بدنما دھبّہ ہو۔ تم زبان اردو کے لیے باعثِ ننگ ہو مگر میں تمھیں حال کی زیب النساء بنا سکتا ہوں (فرحت سے) فرمایئے کیا خیال ہے۔

فرحت : یقیناً ممکن ہو سکتا ہے۔ میں ایک زباں داں کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔

آذر : (ذرا سوچ کر) زباں داں! آپ کہیں مرزا فرحت اللہ بیگ تو نہیں۔

فرحت : جی خاکسار کو فرحت اللہ ہی کہتے ہیں اور جناب کا اسم گرامی۔

آذر : آذر۔

فرحت : میر آذر، مجھے جناب سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ آپ کا دولت خانہ

آذر : میرا غریب خانہ کوچہ چیلان میں ہے۔ اور آپ؟

فرحت : میں فی الحال مہرولی میں مقیم ہوں۔

امرود والی : (فرحت سے جو اس کے پاس سے گزرتا ہے) بھیّا تھوڑے امرود لے لیو۔ مورے پاس آٹے کے دام نا ہیں ہیں۔

فرحت : بی بی کہہ تو دیا کہ ریزگاری نہیں۔ سن لیا کرتے ہیں بات۔ (جاتا ہے)

آذر : (غصّے اور حیرت سے) جھوٹی، مکّار، ابھی تو تم کہہ رہی تھیں، کہ تمھارے پاس پانچ روپے کی ریزگاری ہے۔

امرود والی : بڑا آدا تھانے دار کہیں کا (ٹوکری اٹھا کر آذر کے قدموں میں ڈال دیتی ہے) لے سبئی لے لے چھ آنن ماں۔

(اذان کی آواز)

آذر : (چونک کر، خدا بھی اسی کا ساتھ دے رہا ہے (جیب میں سے بہت سی ریزگاری اور نوٹ نکال کر اس کی ٹوکری میں ڈال کر چلا جاتا ہے۔

امرود والی : (نوٹ اٹھا کر) ارے ارے (سکّے اٹھا کر) نیچے ہی مجے ہو گیو۔ (مٹھی بھر سکّے اٹھا کر) پیسے ہی پیسے، روپیا ہی روپیا۔

فرید: (اندر آتے ہوئے) آخر کار چل گئی گاڑی (امرود والی سے) ذرا دیکھنا یہاں دو عورتیں کھڑی تھیں کہاں چلی گئیں؟

امرود والی: پانی تھمار ہے تب چلی گئی رہیں۔ جہاں بس گاڑی ٹھاڑ ہوت ہی ہوا ہوگئیں۔

فرید: اور گاڑی میرے گلے میں ڈال گئیں۔

امرود والی: کچھ پروا نہ کریو بابو۔ مینئ اج ای گاڑی ماں گھر جئی ہوں۔ (گاڑی والا اندر آتا۔ امرود والی کو دیکھ کر ہچکچاتا ہے) دامن کی پھکر نہ کرو چاچا۔ ٹوکری کی پھکر کرد۔ ای کا کا ہوئی ہے۔

گاڑی والا: تمہارے ساتھ یہ بھی گاڑی میں آجائے گی۔

امرود والی: گدئی تلے چھپائے دیہوں۔ کوئی دیکھ نہ پئی ہے (گاڑی والا ٹوکری اٹھا لیتا ہے) سلام کرت ہوں پھر ید بابو۔

فرید: سلام۔

گاڑی والا: کہاں جاؤگی؟

امرود والی: راشٹرپتی بھون۔

گاڑی والا: راشٹرپتی بھون۔

امرود والی: انڈیا گیٹ سے تنک آگے راج پتھ کے سرد پر کا اتو ناہیں جانت ہو۔ ہو ہئی۔ جہاں راشٹرپتی رہت ہیں (فرید سے) پھرید بابو تم کاہے کٹ کھڑے ہو۔ تھک جئی ہو۔ جاؤ اپنے گھر، گھرا جائیچ (فرید جاتا ہے)

گاڑی والا: بھلا راشٹرپتی بھون میں تمہارا کیا کام؟

امرود والی: مورا ہواں کا کام ہوئی ہے۔ مگر اوئی کے سامنے کاہے کٹ تنئی نیوں۔ — کرما کہاں رہت ہوں۔

گاڑی والا: تو پھر کہاں لے چلوں؟

امرود والی: جاما مجد کے کنے چتلی کبر کے تنک آگے بندو کنجڑے کی دکان کی بغل ماں۔

گاڑی والا: ہاں یہ بات آئی ہے سمجھ میں چلو تو چلو۔ (جاتے ہیں) (پردہ)

(آنند کا خواب پانچ ایکٹ کا ڈراما صفحات ۱۶۰ قیمت ۱/۵۰ حوالہ صفحہ ۲۱۶)

شرابِ کہنہ

وزیر

۱۸۱۳ ——— ۱۸۵۳ء

نام محمد وزیر، تخلص وزیرؔ۔ ابن خواجہ محمد فقیر۔ وطن لکھنؤ۔ ان کا نسبی سلسلہ والد کی طرف سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے اور والدہ، مرزاؤں کے ایک مشہور اور مقتدر خاندان سے تھیں۔ عالی نسبی کے علاوہ ذاتی تقدس کی وجہ سے بھی بہ بڑی عزت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ گوشہ نشینی اور توکل بھی باپ دادا سے ورثے اور ترکے میں ملا تھا۔ فارسی زیادہ جانتے تھے اور عربی کم بلکہ بقدرِ ضرورت، اور یہ دونوں زبانیں انھوں نے علمائے لکھنؤ سے سیکھی تھیں۔ فنِ عروض اور علم قافیہ میں ماہر تھے، شعر و سخن کی طرف بچپن ہی سے مائل تھے۔ شیخ امام بخش ناسخؔ کے شاگرد تھے۔ اور انھیں کی زندگی میں مسلم الثبوت استاد بن گئے۔ ناسخؔ کو وزیرؔ پر بڑا فخر اور اعتماد تھا۔ مختلف حیثیتوں سے ان کی حوصلہ افزائیاں کرتے رہتے تھے، بسا اوقات اصلاحِ سخن کا کام بھی انھیں کے سپرد کر دیتے تھے۔

وزیرؔ کا توکل اور قناعت پسندی بھی مشہور ہے۔ عمر بھر کہیں نوکری نہیں کی۔ حد یہ کہ ایک دو بار بادشاہِ وقت کی طرف سے بھی بلوائے گئے۔ مگر انھوں نے دربار تک جانا گوارا نہ کیا اور معذرت کہلوا بھیجی۔ اچھا خاصہ خرچ تھا اور آمدنی کا بظاہر کوئی وسیلہ نہ تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کو دستِ غیب ہوتا ہے۔ آخری عمر میں شعر و شاعری سے الگ ہو کر خانہ نشین ہو گئے تھے۔ فتوح اور تسخیرِ اعمال میں مصروف رہنے لگے تھے۔ بیشتر اوقات بیٹھے نقوش بھرا کرتے تھے۔ کلام کی جمع و ترتیب کی خود کبھی کوئی خواہش یا کوشش نہیں کی۔ وفات کے بعد ان کے بعض دوستوں اور شاگردوں نے ان کا کچھ کلام یکجا کیا اور "دفترِ فصاحت" کے نام سے ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء میں شائع کیا۔ وزیرؔ نے اپنے استاد کے رنگ کو اپنانے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے۔ وہی مشکل زمینوں میں طبع آزمائیاں، بلند مضامین، متین لب و لہجہ اور منجھی ہوئی زبان، غرض تاثیر کے علاوہ باقی لوازمات اور محاسنِ شاعری وزیرؔ کے دیوان

میں موجود ہیں۔

انتخاب:۔

بہت کچھ کھو کے پائی اس نے راہِ خود فراموشی
دلِ گم گشتہ آپ ہی خضر ہے اپنے بیاباں کا

فلک پر ہے دماغ اے منعمو! اپنا گدائی میں
بہت ہے بوریا، خواہاں نہیں تختِ سلیماں کا

سر جھکائے رہا سدا گردوں
کیا کیا تھا، جوش سرمسار رہا

اٹھ گیا یار میرے پہلو سے
درد پہلو میں یادگار رہا

دیکھنا حسرتِ دیدار اسے کہتے ہیں
پھر گیا منہ، تری جانب دمِ مردن اپنا

شیفتۂ زلف دوتا ہوگیا
خود میں گرفتارِ بلا ہوگیا

بیٹھے بٹھائے تمھیں کیا ہوگیا
اٹھ کے چلے حشر بپا ہوگیا

تعریف پہ شیریں کی عبث ہوتے ہو کڑوے
تم نیک سہی سارا زمانہ نہیں اچھا

بات کا اپنی نہ جب پایا جواب
ہم یہ سمجھے وہ دہن ہے لاجواب

باقی رہا تھا جیب، سو ٹکڑے اڑا دیا
دستِ جنوں نے خوب کی امداد یا نصیب!

سرمہ آسا ہوں سیہ بختی سے
پھر میں نظروں سے گرا، کیا باعث

ترے کوچے کی شاید راہ بھولی
صبا پھرتی ہے مضطر کو بہ کو آج

گئی زمیں سے فلک تک، فلک سے عرش تلک
پھری تلاشِ اثر میں کہاں کہاں فریاد

کسی کی خاطرِ نازک کا جب خیال آیا
زباں تک آکے ہوئی زیرِ لب نہاں فریاد

چلا ہو اور دل راحت طلب کیا شادماں ہوکر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہوکر

اسی خاطر تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہوکر

پہنچ وہ مزدور کہ مر کر نہ ہوا چھٹکارا
لے چلا بارِ غمِ فرقتِ یاراں سر پہ

آ بیٹھے وقتِ خزاں پنجرے، آئی ہی بہار
لے لے صیاد قسم، رکھ دے گلستاں سر پہ

نہ کر نظر مرے جُرم و گناہ بے حد پر
الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں عدو نہ کہیں مجھ کو دیکھ کر محتاج
یہ ان کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ہے چشمِ نیم باز عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

ہوئی گر صلح بھی، تو بھی رہی جنگ
ملا جب دل، تو آنکھ اُس سے لڑا کی

پڑا ہے تفرقہ بے تابیوں سے
وزیر آب ہیں کہیں ہوں دل کہیں ہم

جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد کی مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
اصول نفسیات سوم (نفسیات)	سر ولیم جیمس	۶/۸۷
" " دوم (")	"	۹/۲۵
الملل و [النحل] دوم (درسی اسلامیات)	ابو محمد علی ابن احمد	۹/۵۰
" " اول "	"	۸/۶۲
" " سوم "	"	۷/۶۲
فضا ذیلی ریاضی دوم (طبیعیات)	مولوی محمد عبد الرحمن	۸/۶۲
ہندسی مخروطات (جومیٹریکل)		۳/۲۵
مبادی نباتیات دوم	لوسن	۶/-
مساحت اول (انجینئرنگ)		۲/۶۲
نظریۂ خیر و شر اول (اخلاقیات)	ہسٹنگز راشڈل	
ہندسۂ تحلیلی (جیومٹری برائے بی اے)	گرلیس	۴/۷۵
نامیاتی کیمیا دوم (کیمسٹری)	جے بی کوہن	۲/۲۵
نظریات سیاسیہ اول (تاریخ سیاسیات)	ولیم آرچ بالڈ ڈننگ	۴/۸۱
تفرقی مساواتیں (ریاضی)	ایڈورڈ	۱/۵۰
علم ہندسہ نظری (جیومیٹری)	ای ایچ السیکولھ	۴/۳۷
ہسٹالوجی یعنی نسیجیات دوم	ایڈورڈ شارپی	۱۰/۶۲
عمل طب، ٹیلر (طب) اول	ای پی پولٹن	۵/۲۵
مساواتوں کا نظریہ اول (ریاضی)	ڈبلیو ایس برنسائڈ	۴/۵۰
" " " دوم	"	۸/-
علم ہندسہ ستوی مجسم (جیومیٹری)	"	۱/۶۲
" " چہارم	"	۱/۲۵
نظری علم الحیل (ریاضی)	جے ایچ جینس	۱۱/۵۶

اِن کتابوں کی صرف ایک ایک کاپی ہی ہمارے پاس موجود ہے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی

نئی مطبوعات

نام کتاب	مصنف	مطبوعہ	صفحات	قیمت
اُردو مرثیہ (ادبی)	سید سفارش حسین	دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵	۴۴۶	۶/-
دنیا کی کہانی (نیا اڈیشن)	پروفیسر محمد مجیب	" " " "	۲۰۴	۳/۵۰
چچا چھکن (مزاحیہ خاکے)	سید امتیاز علی تاج	رامپور، کتاب کار پبلیکیشنز	۱۲۸	۱/۲۵
حرف حرف (مجموعہ کلام)	فیض احمد فیض	" " " "	۳۰۸	۳/-
تاج کے ڈرامے انارکلی پر ایک نظر	آنسہ رحمان	" " " "	۹۶	۱/-
رسوم دہلی	سید احمد دہلوی	" " " "	۱۹۲	۲/-
پری خانہ	نواب واجد علی شاہ	" " " "	۱۹۲	۲/-
ادبی ڈرامے	اعجاز حسین	الہ آباد، شو ودیالیہ پریس	۱۶۲	۳/۵۰
طوائف (ناول)	مضطر ہاشمی	دہلی، مشورہ بک ڈپو	۱۲۸	۲/۵۰
مرہم "	الیاس احمد گدی	" " "	۱۸۸	۲/۵۰
ایک بوند لہو کی (ناول)	جوگندر پال	" " "	۱۷۵	۲/۵۰
ہیرو (ناول)	رشید مدراسی	" " "	۱۴۴	۲/۵۰
انداز غالب	نریش کمار شاد	" " "	۲۸۸	۲/۵۰
نئے سکے (ناول)	دت بھارتی	" " "	۱۸۸	۲/۵۰
آخر دل ہے "	گووند ردیپ	چنڈی گڑھ، راما پبلشرز	۱۸۴	۳/۵۰
نادان "	رئیس احمد جعفری	ملنے کا پتہ دہلی، اُردو مرکز	۵۶۴	۷/۵۰
صفورہ "	بلقیس ظفر		۳۵۲	۶/-
رُباب "	تنویر زہرہ بخاری		۲۰۸	۳/۷۵
معصوم تبسم "	حسین فاطمہ		۲۷۲	۵/-
دشت وفا "	احمد ندیم قاسمی		۲۹۶	۵/-
۳۹ ٹیڑھے آدمی "	ڈیل کارنیگی		۲۷۲	۳/۵۰
نہرو کی کہانی (نیا اڈیشن)	ترجمہ رام فیروزپوری	دہلی، ملہوترا بک ڈپو	۲۵۶	۳/۵۰

نسیم (ناول)	مائل ملیح آبادی	دہلی، سلطانیہ بکڈپو	۲۴۰	۴/۰۰
انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ	بمبئی، رائٹرس امپوریم	۲۰۴	۲/۵۰
۴۲ نظمیں	کلیم الدین احمد	پٹنہ، کتاب منزل	۲۴۸	۵/۷۵
سپہ سالار خلجی (ناول)	مائل ملیح آبادی	لکھنؤ، کتاب پبلشرز	۳۵۰	۵/۰

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

شاہ کار
(فراق نمبر)

مرتب: محمود احمد ہنر
صفحات: ۵۸۴ سائز ۳۰×۲۰/۱۶
قیمت موجودہ شمارہ: پانچ روپے، سالانہ دس روپے
پتہ: ممتاز باغ، لوکر گنج، الہ آباد ۳

اب سے پندرہ بیس برس پہلے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ اُردو میں اس وقت چار بہترین غزل گو ہیں: اصغر، فانی، حسرت، اور جگر۔ اس وقت کچھ لوگوں نے اس قول کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا تھا؛ آج اگر کسی سے پوچھا جائے کہ اُردو کا سب سے اچھا غزل گو کون ہے، تو ہر واقف کار شخص بلا تامل فراق گورکھپوری کا نام لے گا، اور ایک آواز بھی اس کی مخالفت میں نہیں اُٹھے گی۔

اوپر جن شاعروں کا نام آیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کا ایک انداز ہے اور منفرد انداز۔ زمانے سے ان کو سندِ قبول ملی اور ادب کی قلمرو میں بھی ان کی یکتائی کو عموماً تسلیم کیا گیا اور آج بھی تسلیم کیا ہے۔ لیکن ان لوگوں کا سارا کمال اندازِ بیان میں پنہاں ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اردو غزل کا سارا کمال بالعموم اندازِ بیان پر مبنی رہا ہے۔ فراق کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غزل میں ان خیالات اور اُن اسالیب کا اضافہ کیا، جو مغربی ادب سے براہِ راست ماخوذ ہیں اور اس حسنِ صناعت سے کہ مغرب کے عمیق خیالات، مشرق کے لطیف پیرایۂ بیان میں پوری طرح سمو گئے۔ غزل کا اپنا مخصوص لہجہ ہے، جن شاعروں نے اس لہجے کو ملحوظ رکھے بغیر اضافوں کا تصور کیا، وہ ناکام رہے۔ فراق صاحب نے ایسے پیچیدہ اور نازک تصورات کو پیش کیا جو ذرا سی بے نیازی سے، سارا حسن کھو بیٹھتے ہیں اور اس فن کارانہ صناعی کے ساتھ کہ وہ غزل کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہو گئے۔

اسی بات کی مدتوں سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ فراق کے فن کا اور ان کی شخصیت کا کسی تصنیف میں تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے کہ اس شاعر خوش نوا اور

باکمال صاحبِ فکر نغمہ سرا کے اعترافِ کمالات کا کچھ حق ادا ہو سکے، یہ نہایت مسرت کی بات ہے کہ اردو کے موقر ماہانہ ڈائجسٹ "شاہ کار" (الہ آباد) کے اڈیٹر، ہنر صاحب نے اس ضرورت کو محسوس کیا، اور نہایت محنت کے ساتھ اپنے رسالے کا ایک خاص نمبر فراق کے لیے وقف کر دیا۔ شاہ کار کا یہ فراق نمبر، بجائے خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے اس خاص نمبر میں جو مضامین شامل ہیں، اُن سے فراق صاحب کی شاعری اور شخصیت کے بیشتر پہلو ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور اس صاحبِ فکر غزل گو کے کمالِ فن کا صحیح طور سے اندازہ ہوتا ہے۔

یہ نمبر جو ۵۸۴ صفحات پر حاوی ہے، فراق کی شاعری کو سمجھنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ کئی مضامین میں فراق کی شخصیت کے ایسے پہلو سامنے آگئے ہیں اور فراق صاحب کے بعض ایسے خیالات منقول ہیں، جن کی روشنی میں اُن کی شاعری کے بعض پہلوؤں کو صحیح طور سے سمجھا جا سکتا ہے، اور اس طرح جو لوگ فراق کی شاعرانہ قدر و قیمت سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور اُن کی زندگی کے کچھ ضروری حالات کو بھی سمجھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے اس نمبر کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ولی شاہجہانپوری

تاریخِ عصرِ قدیم

مصنف : عبدالحلیم شرر
صفحات : ۲۸۰ سائز $\frac{20\times30}{16}$ مجلد
قیمت : چار روپے ۵۰ پیسے
ناشر : نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

مولانا عبدالرحیم شرر لکھنوی نے تاریخی ناول لکھ کر تو اردو ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہی ہے۔ لیکن انھوں نے کچھ ایسی کتابیں بھی لکھی ہیں جو خالص تاریخ کے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ "تاریخِ عصرِ قدیم" اسی سلسلے کی کتاب ہے۔

"تاریخِ عصرِ قدیم" کوئی بڑی کتاب نہیں لیکن اپنے موضوع کے اعتبار سے اس دور میں، بلکہ آج بھی ایک دلچسپ، اہم اور کارآمد کتاب کہی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب کافی عرصے سے نہیں مل رہی تھی اس لیے ہو سکتا ہے کہ آج کی نسل اس کتاب سے شناسا نہ ہو۔ یوں تو

اس کتاب کے اسلوب اور زبان کا مزاج آج کا نہیں لیکن اندازِ بیان تا دیر اس کے جادو سے جلد آزاد نہیں ہونے دیتا۔ مولانا شرر افسانے کے مردِ میدان تھے شاید یہی وجہ ہے کہ اس تاریخ کی کتاب میں بھی افسانوی رنگ جھلکتا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو مولانا نے جس دور میں سانس لیا اس دور کا یہی پسندیدہ انداز بھی تھا۔

یہ تاریخ ۲۴۹۷ء قبل محمدؐ سے شروع ہوتی ہے یعنی آج سے تقریباً ۳۸۸۲ سال قبل سے اور ۵۴۸ء قبل محمدؐ تک آکر ختم ہو جاتی ہے۔ عصرِ قدیم کی یہ تاریخ مولانا کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی بجا طور پر تعریف کی جا سکتی ہے۔ کتاب کے شروع میں شمیم انہونوی صاحب کی اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی کہ... یہ اس قدر دلچسپ اور جامع ہے کہ پڑھنے والا اکتا نہیں سکتا، بلکہ میں تو کہوں گا کہ تاریخ ہمیں ترقی یافتہ دور کی تاریخ سے زیادہ دلچسپ محسوس ہوتی ہے۔"

تاجور سامری

یادگارِ جگر

مرتبہ: محمد اسلام ایم۔ اے
صفحات: ۱۲۸، سائز: $\frac{۳۰×۲۰}{۱۶}$
قیمت: دو روپے
ملنے کا پتہ: دانش محل بک سیلرز۔ لکھنؤ

"یادگارِ جگر" جگر مرادآبادی کے کمیاب اور نایاب کلام کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے مرتب محمد اسلام صاحب لکھنؤ یونیورسٹی سے جگر کی حیات اور شاعری پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں جگر صاحب کا بہت سا ایسا کلام ان کی نظر سے گزرا جو ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ کچھ پرانے رسالوں میں بکھرا ہوا، کچھ جگر صاحب کے دوست احباب کے پاس۔ محمد اسلام صاحب نے اس کو حاصل کرکے "یادگارِ جگرؒ" کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ اس کے علاوہ شعلۂ طور اور آتشِ گل کے ان اشعار کو بھی شامل کر لیا جن کو بعد کے ایڈیشنوں سے نکال دیا گیا تھا۔

کلام کی ترتیب میں جگر کی شاعری کے مختلف ادوار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔
کتاب کے شروع میں نورالحسن ہاشمی صاحب کا تعارف ہے اور مرتب کا مقدمہ ہے

اس مجموعے کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔
"یادگارِ جگر" یقیناً ایک اچھی کوشش ہے۔ اس کی حیثیت محض تبرک کی نہیں ہے۔
اس میں جگر صاحب کے بعض بہت اچھے اشعار بھی شامل ہیں۔ ایسے اشعار جن کو یقیناً
ان کے کسی مجموعے میں ہونا چاہیے تھا۔

تحسین صدیقی

●

بیسک سہل تواریخ

از : سید مرتضیٰ حسن گوہر
صفحات : ۱۶ ، سائز : ۳۰×۲۰/۱۶
قیمت : ۳۰ پیسے
ناشر : ٹیچرس ایسوسی ایشن ۔ دربھنگا (بہار)

اس چھوٹی سی تاریخ کی کتاب میں مختلف دور کے جن ۱۸ لوگوں کے حالات دیے گئے ہیں ان کے نام بالترتیب اس طرح آتے ہیں۔ بشیر شاہ۔ اکبر تُلسی۔ شاہجہاں۔ شیواجی۔ رام موہن رائے، گاندھی جی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت جواہرلال نہرو۔ سبھاش چندر بوس۔ بال گنگا دھر تلک۔ لنکن۔ گلیسٹن۔ اسٹیفن۔ روسو۔ لینن۔ سن یات سین اڈیسن اور لکشمی بائی۔ کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ " حکومت بہار سے منظور شدہ نصاب کے مطابق" اس کے ساتھ یہ نہیں لکھا کہ کس جماعت کے نصاب کے مطابق البتہ کتاب کے ایک دم آخر میں ہندی میں ایک لائن ضرور ہے: "پنچم درگ کے لیے" یعنی پانچویں جماعت کے لیے۔ یہ طریقہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کچھ باتیں اس میں اور بھی کھٹکتی ہیں اور وہ یہ کہ زبان ایک سی استعمال نہیں کی گئی ہے، کہیں کسی کے ذکر کے ساتھ "تھا" کا لفظ استعمال کیا ہے اور کہیں کسی کے ساتھ "تھے" کا عزت و احترام سب کو ہی دیا جاتا تو اچھا تھا۔ دوسرے ناموں میں کسی ترتیب کا اہتمام نہیں رکھا۔ ناموں کی ترتیب یا تو زمانے کے مطابق ہوتی یا رتبوں کے مطابق کچھ نہ کچھ ہوتی ضرور۔ اس طرح شاہجہاں کے بارے میں لکھا ہے کہ نئی دہلی اس نے ہی بسائی جو غلط ہے۔ یوں مجموعی طور پر اس کتابچہ میں آسان اور سہل زبان میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو قابلِ تعریف ہے۔

ریحان احمد عباسی

آئینہ

شائع کردہ: اردو سوسائٹی۔ رانی گنج

اس کتاب کے شروع میں آؤ ہم عہد کریں" کے عنوان سے مختصراً قومی یک جہتی کی باتوں کے ساتھ کتاب کا تعارف کراتے وقت صرف اتنا لکھا گیا ہے کہ "رانی گنج میں ہونے والے اس قومی یک جہتی سے متعلق مشاعرے کی سنہری موقع پر ہم لوگ ایک کتابچہ شائع کر رہے ہیں"۔ ٹائیٹل پر ۲۱ راگست ۶۵ء کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشاعرہ اسی تاریخ کو ہوا ہوگا۔ کتاب کے اندرونی صفحات میں ایک صفحہ پر اراکین مجلس عاملہ کے تمام اوران کے عہدوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد قومی یک جہتی سے متعلق مختلف نظمیں شروع ہوتی ہیں جن میں بالترتیب علامہ سیاب اکبرآبادی، پروفیسر عباس علی بیخود، رفعت سروش، ڈاکٹر حافظ محمد سالم، چندربھان ادھیاست نرائن کھنیان، حسرت جے پوری، عبدالعلیم خاں، رونق نعیم اور سلطان انجم کی نظمیں شامل ہیں۔ ساتھ ہی کچھ صفحات بنگلہ، ہندی اور انگریزی زبان کے لیے بھی وقف کئے ہیں۔ اس کتابچہ پر کسی قیمت وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔

فردوسِ خیال

شاعر: ایم۔ اے۔ دل حسینی
صفحات: ۳۲، سائز $\frac{۳۰\times۲۰}{۱۶}$
قیمت: ۳۰ پیسے
ناشر: ادارہ روح ادب، رگھوناتھ پورہ، مئو

"فردوسِ خیال" دل حسینی صاحب کے نعتیہ کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ "نغمۂ دل" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ کتاب کے شروع میں نظام الدین احمد قادری صاحب نے شاعر کا تعارف کرایا ہے اور اس کے بعد قیصر الخیری صاحب نے "دل حسینی میری نظر میں" کے عنوان کر تعارف کے ساتھ ساتھ ان کے کلام پر بھی کچھ روشنی ڈالی ہے۔ آپ فرماتے ہیں ... "دل کی شاعری حسرت آیات و باقیات نہیں بلکہ اس کے اندر خونِ جگر کی آمیزش کے ساتھ بجا تملق طرازی سے فرار بھی ملے گا جسے پڑھتے پڑھتے آپ دلی کیفیات کی ترجمانی متصور کرنے لگیں گے" دل صاحب کے روح پرور اور سرور انگیز نعتیہ کلام کو پڑھ کر قیصر صاحب کی رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔

ریحان احمد عباسی

ادبی خبریں

وفیات

● اُردو کے مشہور شاعر جناب پنڈت ترجھون ناتھ زار زتشی دہلوی کا ۶ر اکتوبر کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۹۳ سال تھی۔ آپ کا شمار اردو، ہندی، فارسی اور عربی کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ آپ استاد داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔

● اُردو کے مخلص ورکر اور نوجوان شاعر و ادیب جناب نندلال پروانہ حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ ۲۴ر اگست کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ آپ گاندھی نگر شاہدرہ میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کے جنرل سکریٹری تھے اور آپ ہی کی کوششوں سے اس علاقے میں اردو کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تھا۔

● سنٹرل پبلشنگ ہاؤس بنگلور کے مالک ڈاکٹر نذیر احمد کا ۱۳ر اکتوبر کو بنگلور میں انتقال ہوگیا۔ آپ کا شمار جنوبی ہند کے سب سے بڑے پبلشرز میں ہوتا تھا۔ آپ معاملے کے نہایت صاف، بے حد ملنسار، صاحبِ ذوق اور نہایت خوش اخلاق تھے۔ آپ کے انتقال کی خبر اردو بک سیلرز میں نہایت رنج کے ساتھ سنی گئی۔

ادارہ کتاب نما ان تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے اور ان کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

فی پرچہ دس پیسے	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵	سالانہ ایک روپیہ

(پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے کوہ نور پرنٹنگ پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر ...

غالب پر کتابیں

تلامذۂ غالب	مالک رام	۷/۵۰
خطوطِ غالب	۔۔	۷/۵۰
مکاتیبِ غالب	امتیاز علی عرشی	۴/-
غالب کی نادر تحریریں	خلیق انجم	۴/۵۰
فکرِ غالب	پرتھوی چند	۳/۵۰
غالب	خورشید الاسلام	۶/-
مطالعۂ غالب	اثر لکھنوی	۱/۵۰
محاسن کلامِ غالب	عبدالرحمٰن بجنوری	۱/-
یادگارِ غالب	الطاف حسین حالی	۳/-
مشکلاتِ غالب	نیاز فتح پوری	۲/۵۰
اُردوئے معلّیٰ	غالب	۴/-
عودِ ہندی	غالب	۲/-
غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	۴/۵۰
غالب نامہ	محمد اکرام	۴/۵۰

Regd No. D. 58 November, 19

Kitab Numa

JAMIANAGAR. NEW DELHI-25.

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

کچھ اچھی کتابیں

تعلیم پر کتابیں

اُردو املا کا آسان طریقہ	عبدالغفار مدہولی	-/۷۵
اصولِ تعلیم	خواجہ غلام السیدین	۶/-
بنیادی اُستاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	۴/۲۵
تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	۳/۷۵
تعلیم دینے کا فن	گلبرٹ ہگٹ	۳/۵۰
چند پروجکٹ	عبدالغفار مدہولی	۲/۵۰
کھیل کے ذریعے تعلیم اوّل	〃 〃	۲/-
〃 〃 〃 دوم	〃 〃	۱/-
ہم کیسے پڑھائیں	ڈاکٹر سلامت اللہ	۳/۵۰
مدرسہ ابتدائی کی کہانی	عبدالغفار مدہولی	۲/-
نظریۂ تعلیم اوّل دوم	قاضی عبدالمجید	۶/۱۲
زندگی کا رُخ	سعید انصاری	۲/-

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی
جنرل منیجر غلام ربانی تاباںؔ
ایڈیٹر بیگم انجم عباسی
جلد نمبر ۶ | دسمبر ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۱۲

اِشاریہ

مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب غلام ربانی صاحب تاباںؔ جو ۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کو مغربی جرمنی تشریف لے گئے تھے، پروگرام کے مطابق اپنا دورہ مکمل کرنے کے بعد ۲۳ نومبر کی صبح کو بخیر و خوبی واپس دہلی تشریف لے آئے۔ جیسا کہ پہلے لکھا تھا، تاباںؔ صاحب مغربی جرمنی اُس سوسائٹی کی دعوت پر تشریف لے گئے تھے جو طباعت کے سلسلے میں جدید معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ تاباںؔ صاحب نے وہاں کے مشہور اشاعت گھروں اور پریسوں میں جا کر جو مفید معلومات حاصل فرمائی ہیں اُن کی روشنی میں ہمیں یقین ہے مکتبہ اور بھی زیادہ عمدہ اور بہتر کتابیں پیش کر سکے گا۔ مکتبہ جامعہ کا تمام اسٹاف اپنے رہبر کے اس مبارک سفر کی کامیابی پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعلیمی میلہ سابقہ روایات کے مطابق مختلف اور رنگا رنگ پروگراموں کے ساتھ حسب اعلان ۱۱، ۱۲، اور ۱۳ نومبر کو ہوا۔ اس موقعے پر مکتبہ جامعہ کا ادبی پروگرام "فن اور فن کار" ۱۳ نومبر کی شام کو پیش کیا گیا جس کو عام طور سے پسند کیا گیا، اس بار "فن اور فن کار" کا ہمارا پروگرام "کاروانِ نظم" کے نام سے پیش کیا گیا تھا جسے دہلی یونی ورسٹی کے لکچرر جناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لکچرر جناب انور صدیقی صاحب نے ترتیب دیا تھا۔ ہم گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی پروگرام کی پوری تفصیل کتاب نما کے ماہ جنوری ۱۹۶۶ء کے شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ

قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔

"شراب کہنہ" کے عنوان سے کتاب نما میں شاعروں کے تعارف کا جو سلسلہ شائع کیا جا رہا ہے وہ اب جنوری ۶۶ء کے شمارے سے "جام نو" کے عنوان سے شائع کیا جائے گا۔ یہ سلسلہ حالی کے تذکرے سے شروع ہوگا اور حسب سابق حالی کے بعد کے شعرا کے حالات اس عنوان کے تحت قسط وار شائع کیے جاتے رہیں گے۔

افسوس ملک کی مایۂ ناز اور قابل تعظیم ہستی بوہرہ جماعت کے امام مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے چانسلر عزت مآب جناب سیدنا طاہر سیف الدین صاحب کا ۸ نومبر کی شب کو انتقال ہوگیا۔ سیدنا صاحب کا انتقال واقعی ایک ایسا سانحہ اور ایک ایسا نقصان ہے جس کی کمی مشکل سے پوری ہو سکے گی۔ ادارۂ کتاب نما مرحوم کے پس ماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

کربل کتھا (دہ مجلس)

مولف : فضل علی فضلی

مرتبہ : مالک رام و مختارالدین احمد

انوار سہیلی اور اخلاق محسنی فارسی کی مشہور کتابیں ہیں۔ ان کے مصنف ملا حسین واعظ کاشفی اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے۔ انھوں نے ایک کتاب روضۃ الشہدا لکھی تھی۔ اس کے شروع میں انھوں نے بعض انبیا کے حالات عموماً اور رسول اسلام کے خصوصاً لکھے اور اس کے بعد اہل بیت کی مشکلات اور کربلا کے حادثۂ خونیں کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔ اس کتاب کی مقبولیت کو دیکھ کر ادیبوں اور شاعروں نے اس کے نثری اور منظوم ترجمے کیے۔ ایسا ہی ایک اردو ترجمہ فضل علی فضلی نے ۱۷۲۲—۲۳ء میں کربل کتھا کے نام سے کیا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ مولوی کریم الدین کے پاس تھا۔ یہ قلمی نسخہ مولوی کریم الدین نے اپنے محسن اور دوست ڈاکٹر اشپرنگر، پرنسپل دلی کالج کی نذر کر دیا تھا، جسے وہ اپنے ساتھ جرمنی لے گئے تھے چونکہ کتاب کا کوئی نسخہ کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے ہندوستان اپنی اس متاع عزیز سے گویا بالکل محروم ہوگیا تھا۔

[illegible] ڈاکٹر اشپرنگر کی کتابوں کا تمام ذخیرہ محفوظ رہ گیا۔ [illegible] [illegible] کی ترتیل بھی ہے۔ وہیں سے کربل کتھا کا عکس [illegible]

[illegible] مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ [illegible] دہلی [illegible]

آنسہ روح افزا رحمان

تاج کے ڈرامے

انار کلی پر ایک نظر

(۱)

فنونِ لطیفہ میں ڈرامے کا ادب سے گہرا تعلق ہے۔ ڈرامے کی ابتدا مذہبی حکایات اور واقعات کو نقل کرنے کے شوق سے ہوئی۔ پہلے پہل یہ نقل اسٹیج پر کسی ایک ہی شخص کی اداکاری کے ذریعہ ہوتی تھی جس کے بعض نمونے کلاسیکی رقص اور کتھا کاری کے فن میں اب بھی مل جاتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ اس کو حقیقت سے زیادہ قریب دیکھنے کے شوق نے کہانی کے سارے کرداروں کو اسٹیج پر لا کھڑا کیا۔ سننے کے مقابلے میں آنکھوں دیکھا حال ہمیشہ سے زیادہ دلچسپ رہا ہے، عام زندگی میں بھی ہمارا یہ تجربہ ہے کہ جو لوگ واقعات کے بیان کے ساتھ اپنی حرکات و سکنات کو شامل کر لیتے ہیں، انھیں سننے والے کہیں زیادہ شوق سے سنتے ہیں اور دیکھنے والوں کے لیے ان میں زیادہ دلچسپی کا سامان ہوتا ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جن کا بیان بالکل سپاٹ اور طرزِ ادا بے جان ہو۔

یہاں ڈراما نگاری کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں لیکن ضمناً یہ کہنا نا مناسب نہ ہوگا کہ یونان ڈرامے کا اصلی وطن ہے اور یہیں سے یہ دنیا کے مختلف ملکوں میں باقاعدہ ایک فن کی طرح پھیلا ہے، ڈرامے کے سلسلے میں ہندوستان کی تاریخی اہمیت کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قدیم زمانے سے یہاں اسٹیج اور ڈرامے کی باقاعدہ روایات رہی ہیں اور آج بھی یہاں کے ڈراموں اور ڈراما نگاروں کا تذکرہ کیے بغیر اس فن کی تاریخ پر گفتگو ممکن نہیں، کالی داس، بھاس، بھوبھوتی کے ایک سے زیادہ ڈرامے عالمی ڈراموں کی کلاسیکی [illegible] میں شامل کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو زبان میں جو ہندوستان [illegible] ہے، ڈرامے کا سرمایہ اتنا کم اور غیر اہم ہے کہ بقول غالب

ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

اُردو میں ڈراموں کا فقدان شاید اس وجہ سے ہے کہ جو تفریح ڈرامے کے ذریعہ ممکن تھی اس کی تسکین یہاں بہت حد تک رقص و سرود کی محفلوں اور مشاعروں وغیرہ کے ذریعے ہو جاتی ہے، ہاں دیہات میں ضرور ڈرامے کی ایک بہت معمولی شکل سانگ یا نوٹنکی کی صورت میں رائج رہی ہے اور اب تک چلی آتی ہے۔ یہ سانگ کرنے یا نوٹنکی دکھلانے والی منڈلیاں گانو گانو گھومتی پھرتی ہیں، خوشی کے موقعہ پر انھیں خصوصیت سے بلایا جاتا ہے اور گانو کے اَن پڑھ اور سیدھے سادے لوگ ان نوٹنکیوں کے اُلٹے سیدھے قصوں اور ان کے ساز و سنگیت سے اپنی راتوں میں راگ اور رنگ کا لطف پیدا کر لیتے ہیں۔

ڈراموں کی کمی کا باعث یہ بھی تھا کہ آج سے نصف صدی پہلے تک کا معاشرہ اس فن کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا، اور با صلاحیت لوگ ڈرامے اور اسٹیج کو اپنے سے فروتر جانتے تھے۔ یہ تعلق سماج کی نظر میں کتنا غیر پسندیدہ اور معیوب رہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اندر سبھا کے مصنف امانت نے اندر سبھا کو اپنی خواہش سے نہیں بلکہ ایک دوست کی فرمائش اور اصرار پر لکھا تھا، ان کے نزدیک ڈراما معیوب تھا اور انھیں اپنی اس تصنیف کے ساتھ اپنا نام ظاہر کرنے میں تامل تھا، اسی لیے انھوں نے اپنی شخصیت کو چھپانے کی خاطر اس کتاب کی حد تک اپنا تخلص بدل کر استاد کر لیا تھا تاکہ لوگ اندر سبھا سے اُن کی نسبت پہچان نہ پائیں، لیکن اس میں مندرج غزلوں کی وجہ سے پڑھنے والے پہچان گئے کہ پس آئینہ کون طوطی صفت ہے، ابتدا میں امانت کو بھی یہ احساس نہیں تھا کہ اندر سبھا ایسی بے پناہ مقبولیت حاصل کرے گی۔ جیسی کہ اس نے حاصل کی۔ چنانچہ جب اس کی شہرت اور مقبولیت بڑھی تو امانت نے سوچا کہ کیوں ایک مقبول کتاب جو دراصل ان ہی کی تصنیف ہے اور اگرچہ کبھی مصلحتاً اس کتاب سے انھیں اپنی نسبت نامنظور تھی کسی مجہول اور فرضی شخصیت کے حساب میں لگ جائے اس لیے انھوں نے اندر سبھا کے مصنف کی حیثیت سے بالآخر اپنے اصلی نام کا اظہار کر دیا۔

بہرحال آج جو کچھ مواد بھی اُردو ڈرامے کے نام پر ہمارے پاس موجود ہے وہ بھی اگر لکھنؤ کے بدنام لیکن فنون لطیفہ کے رسیا رنگیلے پیا جانِ عالم واجد علی شاہ کو

اپنی تفریح کے لیے نت نئی ہنگامہ آرائیوں کا شوق نہ ہوتا وہ خود صاحب قلم تھے اور انھوں ہی نے پہلی بار "رادھا کنھیا" نامی ڈراما لکھ کر اردو کو اس صنف سے متعارف کرایا "اردو ڈرامے کے لیے واجد علی شاہ کا دور بہت ہی مبارک رہا ہے، اس وقت تک مغربی تہذیب کے بہت کچھ اثرات ہندوستان میں پھیل چکے تھے جن کے زیر اثر یہاں ڈرامے کی ترقی کے کم و بیش امکانات پیدا ہوگئے تھے۔ واجد علی شاہ کے یہاں ڈرامے کی باریابی میں ان اثرات کو کچھ نہ کچھ دخل ضرور رہا ہے"۔ "اندر سبھا" کی تخلیق کا باعث عہد واجد علی شاہ کے لکھنؤ کا تفریح پسند مزاج ہے۔ امانت نے جو اس منظوم ڈرامے کے خالق ہیں اس تصنیف میں وہی ماحول پیش کیا ہے۔ جو اس رنگین عہد کا تقاضا تھا۔ واجد علی شاہ خود بھی کسی اِندر سے کم نہ تھے۔ گویا اِندر سبھا "خود واجد علی شاہ کا دربار تھا۔ یہ تصنیف جو اپنے دور میں بہت مقبول ہوئی اُردو ڈرامے کا سنگ بنیاد ہے اس کے ڈھنگ پر اور بھی اندر سبھائیں لکھی گئیں مثال کے طور پر ہم مداری لال کی اندر سبھا کو پیش کرسکتے ہیں۔ اندر سبھا کی مقبولیت کے باوجود ڈرامے کی ترقی میں تیز رفتاری تو نہیں آسکی لیکن پھر بھی آہستہ آہستہ بعض دوسری تخلیقات سامنے آتی گئیں اور کچھ خالص مذہبی انداز کے ڈرامے تیار کیے گئے جن کا انداز بہت کچھ رام لیلا کے جلسوں سے ملتا جلتا تھا۔ ان کی مقبولیت اس لیے کچھ زیادہ نہ ہوسکی کہ اُن کا تانا بانا صرف چند ہی واقعات سے تیار کیا گیا تھا۔ اور نہ صرف یہ کہ اُن پر گہرا مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا بلکہ ان کی زبان سنسکرت آمیز زیادہ تھی اور عام لوگوں کو ان کے مکالموں میں دلچسپی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے رُبع اول میں اردو ڈرامے کو فروغ حاصل ہوا، جس میں بمبئی کے پارسیوں کی کوششوں کو بہت دخل رہا ہے انھوں نے ابتدا میں اپنے قومی کارناموں کو عوام سے روشناس کرانے کے لیے اپنے بعض قومی واقعات اور روایتوں کو اسٹیج کرنا شروع کیا اس جذبے کے تحت سب سے پہلے رستم و سہراب کی المیہ داستان کو پیش کیا گیا چونکہ خود اس داستان میں بھی بڑی کشش ہے اور یوں بھی طربیہ کے مقابلے میں المیہ واقعات انسانی ذہن کو زیادہ متاثر کرتے ہیں اس لیے اُن کی یہ کوشش توقع سے زیادہ کامیاب ہوئی اور دیکھنے والوں نے

اپنی گہری دلچسپی اور ذوق و شوق کا اظہار کیا۔

اگرچہ اس ڈرامے کی تخلیق یا پیش کش میں کوئی اعلیٰ فنی مقصد کارفرما نہیں تھا محض عملی مفاد اور قومی جذبے نے اس کی تحریک کی تھی لیکن عوامی مقبولیت نے اس کو باقاعدہ تجارتی رُخ دے دیا اور بمبئی کے چند سیٹھوں نے یہ سوچا کہ کیوں نہ عوام کی اس پذیرائی سے فائدہ اٹھا کر اس کے ذریعے روپیہ کمایا جائے۔ اس طرح بمبئی اور کلکتے میں تھیٹر کی بنیاد پڑ گئی مالی منفعت کا تقاضا تھا کہ ان ڈراموں کی زبان زیادہ سے زیادہ عوام کے قریب ہو یوں ان ڈراموں میں جو مکالمے دیے گئے وہ آسان اردو کے مکالمے تھے اور ان کے لکھنے والے لکھنؤ اور دہلی کے وہ اہلِ قلم تھے جن کی زبان عوام کی بولی ٹھولی کا انداز رکھتی تھی۔ اکثر مکالمے منظوم ہوتے تھے۔ اس کی جہاں ایک وجہ یہ ہے کہ نظم، نثر کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ، پُرکشش اور متاثر کرنے والی ہوتی ہے وہیں اداکاروں کے لیے بھی بہ آسانی اس کو یاد رکھنا ممکن ہوتا ہے۔

اسٹیج ڈرامے کی مقبولیت بڑھی تو ڈراما نگاروں نے کہانی کے لیے اپنی تلاش کا رُخ مغربی زبانوں بالخصوص انگریزی کی طرف موڑ دیا ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں شیکسپیئر کی طرف زیادہ رجوع کیا گیا، اس کا شاید ہی کوئی ڈراما باقی رہا ہو جسے مختلف مصنفوں نے کئی کئی بار اپنے ڈھنگ سے اردو میں منتقل نہیں کیا یہ عمل مذاقِ عام اور ضرورتِ زمانہ کے پیشِ نظر کچھ اس طرح ہوا کہ ان ڈراموں کا مزاج اور ان کے کردار خاص ہندوستانی ہوگئے۔ کرداروں کے نام بدل گئے، کہانی کی ترتیب بدل گئی حسبِ ضرورت واقعات کو بھی اس حد تک موڑ دیا گیا اور کردار بھی گھٹائے بڑھائے گئے کہ مغربی ڈراما بالکل مشرقی قالب میں ڈھل گیا۔

ان ڈراموں کے مترجمین میں بہت سے دوسرے ناموں کے ساتھ آغا حشر کاشمیری کا نام سب سے نمایاں ہے۔ آج بھی بڑے بوڑھے ان کو انڈین شیکسپیئر کہتے ہیں۔ اس خطاب سے آغا حشر کی مقبولیت اور ان ڈراموں کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے آغا حشر نے اپنی خصوصی صلاحیتوں سے اردو ڈرامے کو آگے بڑھایا، اب اس میں ایک معیاری انداز آگیا خاص طور پر اس کی زبان بہت سدھر بلکہ سنور گئی وہ خود ایک خوش گوار شاعر اور اعلیٰ درجے کے مقرر تھے اس لیے اُن کی تحریر میں جذبے اور فکر دونوں کا حسین امتزاج ہوا اور یا درہے کہ ان کے بیشتر ڈرامے شیکسپیئر کے ڈراموں کے چربے ہیں، ان کی اہمیت سے انکار نہیں

کیا جا سکتا۔ انھوں نے ان ڈراموں کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ترجمے سے زیادہ تخلیق کیے جانے کے مستحق بن گئے ہیں۔ آغا حشر خود انگریزی سے نا واقف تھے دوسرے لوگ انھیں ناولوں کی کہانیاں اور مطالب بتا دیا کرتے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کے قلم کو زیادہ آزادی اور ان کے ذہن کو زیادہ اختیارات حاصل ہو گئے تھے اور اسی لیے ان کے ترجموں میں تصنیف کی شان پیدا ہو گئی تھی۔

آغا حشر نے صرف ترجمے ہی نہیں کیے، طبع زاد ڈرامے بھی لکھے ہیں اور اپنے قصوں میں عوام کی پسند کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ ان کے ڈرامے تھیٹر کے لیے مثالی ڈرامے ہیں جن کو کم سے کم تیاری کے ساتھ اسٹیج کرنا ممکن ہے۔ ان کے قصوں میں المیہ سخت المیہ ہوتا ہے اور طربیہ بھرپور طربیہ یعنی اس میں جذبات اور احساسات کی وہ شدت ملتی ہے جو عوامی ذہن اور زندگی کا خاصہ ہے اسی چیز نے تماشائیوں کو اور بھی زیادہ متاثر کیا ہے۔ ان کے ڈرامے دیکھ کر یا تماشائی سچ مچ روتے نکلتے تھے یا پورے طور پر باغ وبہار آغا حشر کے ڈرامے کا تاثر ان کے دل ودماغ پر مدتوں چھایا رہتا تھا۔ حشر کی تقلید میں بہت سے ڈرامے لکھے گئے مگر مولوی مدن کی سی بات کسی میں نہ آئی۔

آغا حشر کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ صرف صاحب قلم نہیں تھے بلکہ ان میں اداکاری اور ہدایت کاری کی صلاحیتیں بھی بدرجۂ اتم موجود تھیں وہ اگر ایک طرف ڈراما نگاری کے فن سے واقف تھے تو دوسری طرف انھیں اسٹیج کی ضروریات اور اس کے تقاضوں اور عوام کی ذہنی افتاد کا بھی علم تھا۔ انھوں نے اپنی اسی واقف کاری کی بنیاد پر اپنے ڈراموں کو حیرت انگیز حد تک دلچسپ اور عوام پسند بنا دیا ہے۔ مگر یہ بھی ان کا کارنامہ ہے کہ عوام سے قریب تر ہونے کے باوجود بھی ادبیت مجروح نہیں ہوئی ہے۔ ان کے یہاں قدرتِ اظہار ترتیب مواد اور اسٹیج کے تقاضوں سے واقفیت تینوں نے مل کر ایک ساحرانہ دلکشی اور جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ آغا حشر کے ہندوستانی اسٹیج سے منسلک ہونے سے یہ فائدہ ہوا ہی کہ ان کی بہترین تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار آئیں لیکن ایک یہ فائدہ بھی ہوا کہ اسٹیج کے خلاف سوچنے والوں نے کسی معقول آدمی کا علاوہ تھیٹر سے گوارا کرنا شروع کر دیا۔

آغا حشر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تھیٹریکل کمپنیوں کے تجارتی تقاضے کے لیے ڈرامے

لکھنے کے باوجود معیار کو بنایا بھی، کمپنیوں کا مقصد اول و آخر پیسے کمانا تھا اور انھیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ لکھنے والے نے اپنا کتنا خون پسینہ کیا ہے اور کس طرح ادب پارے تخلیق کیے ہیں۔ آغا حشر نے ادب اور تجارت دونوں کے تقاضوں کو پورا کیا یہ ان کا اعجاز تھا۔ وہ عوام کے نبّاض تھے اور ادب کے بھی۔ اس لیے وہ اگر ایک طرف عوام میں مقبول تھے تو دوسری طرف ان کی ادبی حیثیت بھی تسلیم کی جاتی تھی۔

آغا حشر کے بعد ایک مدت تک ڈرامے میں صرف تقلیدی انداز کارفرما رہا اور سارے موضوعات کسی نہ کسی طرح آغا حشر کی تخلیقات کے اردگرد گھومتے رہے اس لیے کوئی اعلیٰ درجے کی تخلیق نہ ہوسکی، نہ کوئی جدّت پیدا کی جا سکی۔ ۱۹۰۵ء میں اردو کے مشہور شاعر اور صحافی مولانا ظفر علی خاں نے جنگ روس و جاپان کو موضوع بنا کر ایک ڈراما لکھا جس میں قومی بیداری کے احساس اور حسن و عشق کے جذبات کا سنگم ملتا ہے مگر اس کی روشنی بھی اپنے پہلے ڈراموں سے مختلف نہ تھی، موضوع میں ضرور کسی قدر نیا پن تھا۔ اسی زمانے میں منشی امراؤ علی نے "البرٹ بل" کے نام سے انگریز امیروں کی فرعونی ذہنیت کا نقشہ کھینچا اور بڑے شائستہ انداز سے اس میں مزاح کی چاشنی بھی پیدا کی یہ شائستگی و لطف و مزاح اور ڈرامے کے سلسلے میں ایک خوشگوار تجربہ تھا لگ بھگ اسی زمانے میں منشی کشن چند زیبا نے ایک خالص سیاسی ڈراما لکھا جس کا نام تھا "زخمی پنجاب" اس نے ڈرامے میں سیاسی موضوعات کے امکانات کو روشن کیا۔ یہاں سے سماجی ڈراموں کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس کی ابتدا مولانا عبدالماجد دریا بادی کے ڈرامے "زود پشیمان" سے ہوئی اس کی سادگی اور بے ساختگی نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ڈراما بہت مشہور ہوا، اور اس کو ادبی حلقوں میں تعریف و توصیف کے ساتھ بڑی مقبولیت نصیب ہوئی۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی جو اپنے تاریخی ناولوں کے لیے مشہور ہیں دو ڈرامے لکھے جن میں ایک کا موضوع سماجی تھا اور دوسرے کا تاریخی مگر ان ڈراموں کا مزاج ان کے ناولوں سے ذرا بھی مختلف نہیں تھا۔ چند اور ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں لیکن نہ تو ان کے مصنفین قابل ذکر ہیں اور نہ ان کے موضوعات و مندرجات۔

یہی وہ زمانہ تھا جب کہ تھیٹر کے فن کو اور اس کی مقبولیت کو جو اگر چہ پہلے ہی

کچھ بہت زیادہ نہ تھی) ایک زبردست دھچکا لگا۔ بائسکوپ کی ایجاد نے آناً فاناً ترقی کی۔ کیمرے کے فن کارانہ استعمال نے افسانے کو زیادہ حقیقت بنا دیا تھا اس لیے عوام و خواص دونوں اس پر ٹوٹ پڑے اور آج تو یہ ایجاد دنیا کی بڑی آبادی کے لیے ذریعہ تفریح ہے۔

فلم اسکرپٹ اور اسٹیج ڈرامے دونوں کے تقاضے علٰحدہ علٰحدہ ہیں، اس لیے ڈراما نگاری اردو میں جوان ہونے سے پہلے ہی سدھار گئی۔ اسٹیج نہ ہو تو ڈراما کاہے کے لیے۔ بس کی رہی سہی شکلیں فیچر، ایکانکی ڈرامے وغیرہ نظر آجاتی ہیں اور وہ بھی خال خال۔ اسکولوں کی تقریبات یا ریڈیو پروگرام یہ اس کا میدانِ عمل ہیں جہاں نہ ڈرامے کے فن پر زور دیا جاتا ہے نہ کوئی خاص مالی منفعت وابستہ ہوتی ہے۔ نہ تجارتی حریف ہوتے ہیں، کہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا جذبہ ہی کسی کام آسکے اس لیے ان کا معیار بھی یوں ہی سا ہے۔

ڈرامے کی اس غیر اطمینان بخش رفتارِ ترقی میں اچانک ہمارے ادب کے افق سے ایک ایسا ڈراما طلوع ہوا جس نے سچ مچ پچھلے مصنفین کی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ یہ ڈراما ہے سید امتیاز علی تاج کا "انارکلی" آج بھی جب کہ اس ڈرامے کو وجود میں آئے ۴۳ سال گزر چکے ہیں، اردو کا اس لحاظ سے یکتا ڈراما ہے کہ اس کی مقبولیت میں سرمو فرق نہیں آیا اس کی ترتیب، اس کی زبان اور اس کی کہانی تینوں حیثیت سے مکمل ہیں، اور اس کا مجموعی اثر اتنا مکمل ہے کہ اسے بغیر کسی جھجک کے کسی بھی زبان کے نمایاں ڈراموں کی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی تخلیق ہے جسے بیک وقت ہمت افزا اور حوصلہ شکن کہا جانا چاہیے، اس کی کامیابی نے اگر ایک طرف اردو ڈرامے کی ترقی کی راہوں کو واضح اور تابناک بنا دیا تو دوسری طرف لکھنے والوں سے ان کا اعتماد بھی چھین لیا اور ان کے ذہن اور ان کے قلم اس معیار تک پہنچنے کی آرزو میں بھٹکتے رہ گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

("تاج کے ڈرامے، انارکلی پر ایک نظر" آنسہ روح افزا رحمان صفحات: ۹۶ قیمت -/۱)

رُباعیاں

آسی غازی پوری

ذرّے سے جو دیکھنے میں کم ہوں گے — تیرے لیے وہ بھی مہرِ انور ہوں گے
اے دل نہ برابری کسی کی کرنا — ہاں خاک کے اک روز برابر ہوں گے

کرتا رہوں میں تو یوں فغان و زاری — اس بُت کے نہ دل میں رحم ہو یا باری
پتھر سہی دل مگر پسیجے نہیں کیوں — پتھر سے تو ہو جاتے ہیں دریا جاری

جگت موہن لال رواںؔ

حرص و ہوسِ حیاتِ فانی نہ گئی — اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگِ مزار پر ترا نام رواںؔ — مر کر بھی اُمیدِ زندگانی نہ گئی

نوروز ہے غرقِ بادہ دنیا کر دے — میرا ارمان آج پورا کر دے
پی لوں میں شراب بھر کے اس میں ساقی — تو کاسۂ آسماں کو سیدھا کر دے

تلوک چند محرومؔ

پھولوں کا لیے نکھار آئے گی بہار — کٹ جائیں گے خار زار آئے گی بہار
مایوس نہ ہو کہ ایک دن آخرِ کار — اے منتظرِ بہار، آئے گی بہار

ہم کہتے ہیں کاش غیر فانی ہوتے — بہرِ اندوہِ کامرانی ہوتے
فانی ہوتے نہ ہم اگر اے دلِ زار — غمہائے نہاں بھی جاودانی ہوتے

پیراں شام و سحر ہوئے جاتے ہیں — ایام یونہی بسر ہوئے جاتے ہیں
جتنے ہوتے دور ہم سے مرنے والے — ہم ان سے قریب تر ہوئے جاتے ہیں

یگانہ چنگیزی

ساجن کو سکھی منا لو پھر سو لینا
سوتی قسمت جگا لو پھر سو لینا
سوتا سنسار، سننے والا بیدار
اپنی بیتی سنا لو پھر سو لینا

دل کیا ہے اک آگ ہی دہکنے کے لیے
دنیا کی ہوا کھا کے بھڑکنے کے لیے
یا غنچۂ سربستہ چٹکنے کے لیے
یا خار ہے پہلو میں کھٹکنے کے لیے

فانی بدایونی

تکمیلِ بشر نہیں ہے سلطاں ہونا
یا صف میں فرشتوں کی نمایاں ہونا
تکمیل ہے عجزِ بندگی کا احساس
انسان کی معراج ہے انساں ہونا

ہستی کے نہ آغاز، نہ انجام میں دخل
تکلیف پہ قابو ہے نہ آرام میں دخل
اک سانس پہ عمر بھر کبھی بس نہ چلا
مختار ہوں اور نہیں کسی کام میں دخل

فراق گورکھپوری

قامت ہے کہ انگڑائیاں لیتی سرگم
ہو رقص میں جیسے رنگ و بو کا عالم
جگمگ جگمگ ہے شبستانِ حرم
یا قوسِ قزح لچک رہی ہے پیہم

موجِ مئے ناب بہکی بہکی سی یہ چال
گھنگھور گھٹائیں بکھرے بکھرے سے یہ بال
چھلکی چھلکی نئی جوانی کی شراب
قد ہے کہ بھرا بھرا ہے مینائے جمال

جوش ملیح آبادی

جب حدِ طلب سے دل نکل جاتا ہے
سانچے میں طرب کے درد ڈھل جاتا ہے
کر لیتی ہیں غم کا جب احاطہ نظریں
ہر اشک تبسم میں بدل جاتا ہے

چلنے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کر مرے زانو پہ سو رہی ہے
روکے، روکے، سحر کو روکے کوئی

رشید احمد صدیقی

ریڈیو سننے والے

خدا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سنتا سب کی ہے، کرتا اپنی جیسی ہے۔ ریڈیو سننے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ سنتے سب کی ہیں اور کر کچھ نہیں پاتے۔ غالب کو بھی یہی دقت پیش آئی تھی۔ لیکن وہ تو یہ کہہ کر صاف نکل گئے:

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

لیکن آپ کو تو معلوم ہے جب آدمی کچھ کر نہیں پاتا تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے یا اس کے بندوں کو گالی دینے لگتا ہے۔ مگر اب زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے کہ آدمی کو اللہ کا شکر ادا کرنے کی نہ تو فرصت ہے اور نہ ضرورت، چار ناچار گالی سے جی بہلاتا ہے، اس میں ریڈیو والوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اُن کی کمزوری ضرور ہے۔ وہ ہر ایک کو خوش کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ خوش ہونے سے شرماتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ خوش ہونے سے کھانا ہضم ہوتا ہے۔ ریڈیو سننے والے بھی اکثر قابلِ رحم ہوتے ہیں، اول تو یہی کیا کم آفت ہے کہ ان کی کوئی نہ سنے اور وہ سب کی سنتے جائیں، اس لیے اکتا کر وہ کبھی کبھی اول فول بکنے لگیں یا بکنے لگ جائیں (بکنے لگیں یا بکنے لگ جائیں دونوں صحیح ہیں، بشرطیکہ آپ پہلے یہ دریافت کر لیں کہ بکنے والا کون ہے) یا چہرہ ایسا بنائیں جیسے کوئی اناڑی کی طرح سوڈا واٹر چڑھا جائے اور ڈکار آنے والی ہو تو مہذب بننے کی کوشش کرے تو اس کو معاف کر دینا چاہیے۔

ریڈیو سیٹ ابھی ہندوستان میں عام تو ہوا نہیں ہے اس لیے جس کسی کے پاس اس قسم کا سیٹ ہے اس کو وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جیسے کسی گاؤں میں پہلے پہل اونٹ آیا، لوگوں نے کہا بھگوان آئے۔

اونٹ اور بھگوان والی مثل کا میں مصنف نہیں ہوں، یہ روایت صفِ زندگی

سے سنتا آیا ہوں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں میں نے نہ تو اونٹ قسم کا بھگوان دیکھا نہ بھگوان قسم کا اونٹ البتہ ان اقسام کے آدمی ضرور دیکھے ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ ہی کے آس پاس کوئی صاحب اسی قسم کے بیٹھے ہوں۔ لیکن آپ گھبرائیں نہیں وہ جس کل بیٹھ گئے ہوں گے، بیٹھے ہوں گے پھر اونٹ کی صحت کچھ بری بھی نہیں ہے۔ بشرطیکہ آپ اس وقت کسی اونٹ گاڑی کی اوپر والی منزل پر نہ بیٹھے ہوں۔ ریڈیو سننے والوں کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔ میں نے احتیاطاً اونٹ گاڑی کا نام لے دیا۔ ورنہ کجا آپ اور کجا اونٹ۔ یورپ کی مثل تو آپ نے سنی ہوگی: "دودھیلی گائے کی دولات بھی برداشت کرنا چاہیے"۔ اور اونٹ کا حال تو آپ جانتے ہیں۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اونٹ اور گائے دونوں الہامی جانور ہیں جن سے دور ہی رہنا بہتر ہے۔

اچھا دیکھیے وہ صاحب جو سامنے بیٹھے ہوئے ہیں ان سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ ان کی آنکھیں دیکھیے دونوں مصنوعی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ بٹن جیسی، یعنی پتھرائی ہوئی۔ یہ گانا جانتے نہیں لیکن ان سے زیادہ گانا سمجھنے کی کوشش کرنے والا شخص میں نے نہیں دیکھا ہے۔ گانا سنتے وقت ان کا پیٹ پھولنے لگتا ہے اور شکل چوروں جیسی ہو جاتی ہے۔ پوچھا جاتا ہے حضور گانا کیسا تھا۔ غرّا کر جواب دیتے ہیں گانا کون سن رہا تھا۔ پوچھا گیا حضرت کس فکر میں تھے؟ کنجی کہیں بھول آیا، تلاش میں نکلا، پھر سوچا ریڈیو ہی سنتے چلیں۔ اور کیوں جی یہ جو گا رہا تھا کوئی عورت تھی یا مرد۔ میں نے کہا نہ عورت نہ مرد۔ گراموفون تھا۔ کہنے لگے جب ہی تو سوچتا تھا کہ آواز کبھی کی سنی ہوئی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔

ریڈیو سننے والوں کو ایک جگہ بیٹھا دیکھ کر مجھے اکثر کونسل یا اسمبلی کا اجلاس یاد آجاتا ہے یعنی پروگرام جاری ہے لیکن حاضرین اپنے اپنے حال میں مست ہیں۔ کوئی ہنس رہا ہے کوئی بول رہا ہے کسی کو بولنا نہیں آتا تو کراہ رہا ہے۔ کوئی اونگھ رہا ہے کوئی کسی ایسے مقام کی تلاش میں ہے جہاں نہ اس کو کوئی دیکھ سکے اور نہ اس کی سن سکے۔ کوئی آمادۂ فوجداری ہے تو کوئی آمادۂ وفاداری۔

بعض لوگ ریڈیو کے بہانے شربت پانی، سگریٹ سے شغل کرنے آتے ہیں اور

چلتے وقت یہ کہہ کر دل بڑھا جاتے ہیں کہ آپ کا ریڈیو اچھا ہے۔ فرصت ہوئی تو کبھی پھر سنوں گا۔ اچھا پروگرام ہوا کرے تو اطلاع بھجوا دیا کیجیے۔ ریڈیو کے بعض مالک خود ریڈیو نہیں سنتے بلکہ ریڈیو سننے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور ان کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے اللہ تعالیٰ اپنے کمزور بندوں کی دوڑ دھوپ، مکر و فریب رنج و راحت دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں دیکھیے کیسی معمولی چیز کو یہ شخص کس انہماک یا دلچسپی سے سن رہا ہے، اللہ تعالیٰ بھی کیسا کارساز ہے۔ اپنے کمزور بندوں کی حاجت روائی مجھ سے کراتا ہے۔ اچھا خوب لطف اٹھا، قبل اس کے کہ تو اس دنیا سے اٹھ جائے نادان کھلونے کھیلنے والا جانور۔

بعض سننے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر بے اختیار محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص بیوی سے لڑ کر آیا ہے۔ ورنہ یہاں سے جا کر ضرور لڑے گا۔ ایسے اشخاص ریڈیو کا سارا پروگرام سن جائیں گے لیکن کانوں کے ذریعے نہیں نتھنوں کے راستے۔ وہ بھی اس طور پر گویا براڈ کاسٹنگ اسٹیشن والوں کو چیلنج دے رہے ہیں۔ بس میرا تم نے کیا بگاڑ لیا۔ ہاتھی جھومتا جائے کتا بھونکتا جائے۔ حالاں کہ آپ یقین مانیے ان میں اور ہاتھی میں سوا سونڈ کے اور کوئی چیز ملتی جلتی نہیں پائی جائے گی۔

میرے ایک دوست ریڈیو اس طور پر سنتے ہیں جیسے کوئی مذہبی شخص ہو جس کا گناہ کرنے کو جی چاہتا ہو لیکن گناہ کرنے کی نہ اہلیت اور نہ ہمت۔ ان کا جی تو بہت چاہتا ہے کہ ریڈیو سنیں۔ لیکن ڈرتے اس سے ہیں کہ کوئی ریڈیو سنتے دیکھ لے تو اللہ میاں سے نہ کہہ دے، یا کوئی مولوی کافر نہ قرار دے دے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کو کافر بننے میں عذر نہیں۔ البتہ ایک کافر سے جو توقعات خوش مذاق لوگ کرتے ہیں وہ ان کے بس کی نہیں اس لیے کفر سے ڈرتے ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ سننے والے میاں بیوی ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ دو چار بچے بھی موجود ہوں۔ فرض کیجیے کوئی محترمہ گا رہی ہیں۔ میاں کو غور سے سنتے دیکھ کر بیوی کے کان کھڑے ہوئے، بولیں کیسا برا گا رہی ہے، میاں بولے ہاں لیکن آواز سے کم سن معلوم ہوتی ہے۔ بیوی جھک کر بولیں۔ دلی نہیں چلے جاتے۔ میاں نے کہا، تھوڑا اللہ دشمن بھی تو رہنے قائم کریں۔ اتنے میں کسی خاموش بچے کو دیکھ کر بولیں باہر جا کر کھیلتا کیوں نہیں، یہاں پڑا کیوں سڑ رہا ہے۔ اس نے بھی کہہ دیا [illegible]

ماں بولیں، باپ گاتا نہیں۔ بیٹے کھانا ٹھونسیں اور میں ساری مصیبتیں جھیلوں۔ یہ ریڈیو جب تک جہنم رسیدنہ ہوگا اس گھر میں چین آرام دیکھنا نہیں ملے گا۔ اس اثنا میں کسی منجھلے چھوٹے بچے نے لپک کر ریڈیو سٹ کی کوئی گھنڈی گھمادی۔ ریڈیو کا سانس تلے اوپر ہونے لگا۔ بیوی بچے پر جھپٹیں، بچے نے باپ کی پناہ پکڑی، وہ ریڈیو کی حفاظت کے لیے بڑھے۔ آخر میں مطلع صاف ہوا تو معلوم ہوا کہ باوا کی عینک بیوی کی زلف میں جھول رہی ہے اور بیوی کا بُندا باوا کی داڑھی سے پینگیں بڑھا رہا ہے، بچوں نے تالیاں بجائیں۔ اناؤنسر نے پکارا۔ فلاں صاحبہ عورتوں کے حقوق پر گفتگو فرمائیں گی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک دن بازار سے گذر رہا تھا۔ ایک دوکان کی بالائی منزل پر ریڈیو سٹ تانیں اڑا رہا تھا، نیچے مجمع تھا، بکہ بان تانیں سیکھنے کی مشق کر رہے تھے، بوڑھی عورتیں کھانس رہی تھیں اور کلجگ کو کوس رہی تھیں۔ فقیر بھیک مانگ رہے تھے، بچے گولی کھیلتے تھے، بوڑھے قیامت کے منتظر تھے، نوجوانوں پر قیامت گزر رہی تھی۔ یہ سب کھیل ریڈیو کا تھا۔ ناگاہ ایک طرف گلی سے کوئی بے فکرا نکلا۔ لنگوٹی بندھی۔ مانگ نکلی، منہ سے ستار بجاتے ہوئے، ایک یکہ بان کو دیکھ کر نعرہ لگایا۔ بیٹا گھوڑا بیچو نہیں تو جوانی مفلسی ہی میں کٹ جائے گی۔ بوڑھے کو دیکھ کر بولے بابا کمر سیدھی کرنے کھڑے ہوگئے گانا سُن لو بال کالے ہو جائیں گے۔ بڑھیوں کو دیکھ کر کہنے لگے۔ مائی جی سلام تم بھی کس سمے نکل پڑیں۔ ابھی مائی جی پورے طور پر گالیاں بھی ختم نہ کرپائی تھیں کہ ہمارے دوست نے ایک نوجوان عورت کو مخاطب کرکے تان لگائی آؤ آؤ نگریا ہماری۔ ایک بچے نے پکارا کلن دوست آؤ آج ہمارے ساتھ گولی کھیلو کتنے دنوں سے ہم نہیں کھیلے۔ اتنے میں سارے لڑکے کلن کو جھپٹ گئے کسی نے کہا گولی کھیلو، کسی نے کہا کندھے پر بٹھاؤ۔ کلن نے ایک کو کندھے پر بٹھالیا اور دوسرے کو پکے پر بٹھادیا۔ تیسرے کو اٹھا کر ایک موٹے تازے بنئے کی گردن سے چپکادیا جو تھے کی دونوں ٹانگیں مضبوط تھام کر اسے بلند کیا اور مرغے کی آواز بلند کی۔ سامنے سے پولیس کا سپاہی آتا نظر آیا۔ مسٹر کلن نے ایک لڑکے کو دوکان کے سامنے کے تختوں کے پیچھے پھینکا۔ پیچھا نیچے آرہا۔ اسٹیل ٹرنک کی دوکان

تھی سارے ٹرنگ ایک دوسرے پر گرے، بھگدڑ مچ گئی۔ ریڈیو سننے والے ہنستے بولتے روتے گاتے، گالی دیتے، کھلنتے پھلانگیں مارتے یا لنگڑاتے اپنے اپنے راستے لگے۔ اور مسٹر کلن یہ جا وہ جا غائب!

ریڈیو سننے والوں میں سب سے دلچسپ جماعت بچوں کی ہوتی ہے۔ میرا سابقہ ایسے بچوں سے ہے جو گانا یا تقریر سمجھنے کے بجائے، ان کی نقلیں کیا کرتے ہیں۔ ایک ہی کمرے میں ہر بچے نے ریڈیو سٹ لگا رکھا ہے، جوتے کے خالی کاغذی بکس میں ایک جوڑا گول سوراخ بنا کر سرخ کاغذ لگا دیا ہے، یہ اصلی ریڈیو کے اس حصے کا جانشین ہے جو گھڑی نما سامنے ہوتا ہے۔ نقلی ریڈیو کو کمربند کے ذریعے کھونٹی پر لٹکا کر ایریل کا کام لیا گیا۔ اب ریڈیو کے مالک کھڑے ہو کر پکارتے ہیں۔ دلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے شیخ نیازی ستار بجائیں گے۔ اب شیخ صاحب منہ سے ستار بجا رہے ہیں۔ دوسرے نے پکارا دلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے سلمیٰ نعت سنائیں گی، نعت بھی شروع ہو گئی عذرا دلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے بچوں کی تعلیم پر تقریر کریں گی، تقریر بھی شروع ہو گئی اقبال نے آواز دی دلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے اقبال انگریزی خبریں سنائیں گے، خبریں بھی آنی شروع ہو گئیں۔ احسان نے نعرہ لگایا۔ دلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے احسان بھجن گائیں گے۔ بھجن بھی شروع ہو گئے اتنے میں ایک صاحب کا جو ابھی پر ہی تول رہے تھے، ریڈیو زمین پر آ رہا، انھوں نے چیخ چیخ کر بغیر پروگرام بتائے انگلش میوزک اور ہندوستانی پکا گانا ساتھ ساتھ شروع کر دیا۔ کمرے میں (آر ایل ایس) آرکسٹرا بج رہا تھا کہ دفعتاً مرنج براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے آواز آئی۔ قہرن اب خربوزے تقسیم کریں گی۔ اس خبر نے آرکسٹرا کو آناً فاناً درہم برہم کر دیا اب جو دیکھتے ہیں تو کسی کا ریڈیو کمربند کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ کسی کا پاجامہ ہاتھ میں ہے اور کمربند کھونٹی پر، کسی کی نعت نتھنوں میں پھنسی ہوئی ہے اور کسی کی بھجن گلے میں اٹکی ہوئی ہے کسی کا ہاتھ خربوزے پر اور کسی کی گردن قہرن کے ہاتھ میں۔

سننے والے ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ امیر، غریب، مرد، عورت، جاہل، تعلیم یافتہ معقول نامعقول، تندرست، مریض، فلسفی، چور، غرض کہاں تک تفصیل بتائی جائے سنانے والے بھی اسی قسم کے ہوتے ہوں گے، قطع کلام ہوتا ہے، میرے کہنے کا مقصد

یہ ہے کہ ممکن ہے سنانے والوں میں بعض اقسام نہ ہوتی ہوں۔ مثلاً چور یا کوئی اور لیکن آپ اس کی ذمہ داری کیسے لے سکتے ہیں کہ کب وہ سنانا ختم کردیں گے اور چوری شروع کردیں گے۔ بالفرض چوری نہ بھی شروع کریں تو قیافے سے چور معلوم ہوتے ہوں گے۔ یہ بھی نہ سہی تو میری ہی غلطی سہی غلطی انسانوں ہی سے ہوتی ہے خواہ وہ چور ہی کیوں نہ ہو۔

پکّے گانے سن کر بعض لوگوں کو وحشت ہونے لگتی ہے۔ لیکن جو اصحاب گانے کے فن سے واقف ہیں، ان کو میں نے دیکھا ہے اس قسم کے گانے سے بے حد لطف اٹھاتے ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں جن کو میں نے دنیا اور دنیا داروں سے بہت کم مطمئن اور خوش پایا ہے۔ لیکن جب سے ریڈیو شروع ہوا ہے ان کی ذہنی زندگی بالکل بدل ہی گئی ہے۔ ایک دن کسی قدر ہشاش بشاش ہو کر فرمایا، دنیا ابھی رہنے کے لائق ہے۔ ہندوستان میں اچھے گانے بجانے والے اب بھی موجود ہیں۔ میں نے کہا اس قسم کا گانا بجانا ہوا کرے تو فدوی کو بھی یاد فرمالیا کیجیے، چنانچہ ایک دن مجھے انھوں نے ایک صاحب کا گانا سنایا میں نے کہا حضرت یہ گانا ہے یا ہسٹریا۔ بگڑ کر بولے جہنم میں جاؤ چھوکروں کی چیں چیں اور میں میں سنا کرو، تمھاری کئی پشت گانا نہیں سمجھ سکے گی، بہرحال میں نے ان کو اس گانے پر اونگھنے دیا اور خود بھاگ کھڑا ہوا لیکن آپ اس امر کا بھی لحاظ رکھیں کہ میرے ان دوست کی عمر چالیس سے زائد ہے اور بیوی سے ڈرتے ہیں۔

ریڈیو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے ہر شخص کے دوستوں اور عزیزوں کے دائرہ کو وسیع کردیا ہے۔ کم سے کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ مقررہ وقت پر ریڈیو نے ہماری توجہ ہر طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مائل کرلی، اناؤنسر کی آواز خاندان کے کسی دوست کی آواز کی طرح کانوں میں آئی۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تعلق اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اناؤنسر بار بار نہ بدلے جائیں۔ زمانہ گزرنے کے بعد اناؤنسر کی وہی حیثیت ہوجائے گی جو گھر کے ڈاکٹر یا ڈاکیے کی ہوتی ہے جن کی آواز پر گھر کا ہر چھوٹا بڑا دوڑتا ہے اس سے ایک قسم کی یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت براڈکاسٹنگ اسٹیشن کے بعض بات چیت کرنے والوں کے ساتھ بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ ایسی بات چیت کرے جس سے لوگوں کا دل بہلے۔ بات چیت سے مراد ہر قسم کی بات چیت سے ہے مثلاً کچھ بچوں کی باتیں

کچھ ہنڈیا ڈوئی، کچھ ہنسی ٹھٹول، رشتے، ناتے، آمدنی خرچ، مہمانوں کا آنا جانا، تیج تیوہار، موسم کا حال، سیر و تفریح کے ذرائع اور وسائل، میٹھی میٹھی ہمدردیاں یا دل بہلانے کی باتیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی مستقل آدمی ایسا ہو جو براڈ کاسٹنگ کا نہیں بلکہ صحیح معنوں میں سننے والوں کا آدمی ہو یعنی اس کو وہی حیثیت حاصل ہو جو اپنے گاؤں میں رپ وان ونکل کو حاصل تھی، یعنی عورت، مرد، کتے بچے سب کے دوست ہیں اور سب کے معتمد۔ اپنے کام کے علاوہ سب کام کرتے ہوں۔ موسم وقت، عمر، رنج راحت کسی کی قید نہیں۔

("خنداں" رشید احمد صدیقی۔ صفحات: ۳۸۳، قیمت: ۵/۲۵)

شراب کہنہ

سالکؔ

۱۸۲۴ء ــــــــ ۱۸۸۱ء

نام مرزا قربان علی بیگ خاں، پہلا تخلص قرباںؔ اس کے بعد سالکؔ۔ قوم اُزبک ترک، اجداد کا وطن دہلی۔ ان کے والد مرزا عالم بیگ خاں ریاست حیدرآباد میں ملازم تھے۔ وہیں یہ پیدا ہوئے، ملازمت کی مدت پوری کر کے جب عالم بیگ خاں دہلی واپس آئے اُس وقت سالکؔ چھے سال کے تھے، ان کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما دہلی ہی میں ہوئی۔

تعلیم سے فراغت پاتے ہی ریاست الور میں ملازم ہو گئے۔ جب وہاں سے الگ ہوئے تو حیدرآباد جا کر برسرِ کار اور مقیم ہو گئے۔

محکمہ تعلیمات میں ملازمت کے ساتھ ساتھ، سالکؔ نے حیدرآباد سے نواب عماد الملک کی سرپرستی میں" رسالہ مخزن الفوائد" بھی جاری کیا۔ اور بہت دنوں تک اس رسالے کے ذریعے علم و ادب کی معقول خدمت انجام پاتی رہی۔

سالکؔ کا انتقال بھی حیدرآباد میں ہوا۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔

پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے مومنؔ سے اصلاح لی اس کے بعد غالبؔ کی طرف رجوع ہو گئے۔ مرزا ہی کے مشورے سے سالکؔ تخلص اختیار کیا تھا۔

شگفتہ رُو اور خوش مزاج لوگوں میں سے تھے۔ ذہانت و ذکاوت، سخن سنجی اور سخن فہمی میں بھی ممتاز تھے۔ اسی بنا پر استاد کی نگاہ میں ان کا مرتبہ بلند اور ساتھیوں

صـــہ تلامذۂ غالبؔ" از مالک رام ص ۱۴۱۔ مذکور ہے کہ" ۵۷ برس کی عمر میں ۱۸۸۱ء مطابق (۱۲۹۷ھ) میں حیدرآباد میں وفات پائی۔" اسی بنیاد پر یہ سال ولادت تحریر کر دیا گیا ہے۔

ہم عصروں میں ان کی حیثیت اہم اور وقیع تھی۔

غالب کی وفات کے بعد اُن کے بہت سے نو آموز اور کم مشق شاگرد بھی انھیں سے اصلاح لینے لگے تھے۔

شاعری کے علاوہ سالک کو شطرنج سے بھی بڑا شوق تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ دو دیوان "ہنجار سالک" اور "خانۂ سالک" مرتب کیے تھے مگر اب دونوں نایاب ہیں۔

سالک اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب تھے کہ ان کو دو بے مثل اور مایہ ناز استادوں کی رہ نمائی حاصل کرنے اور اصلاح لینے کا شرف حاصل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں مومن کی رنگیں بیانی اور غالب کی ندرت آفرینی اپنے اپنے موقعے پر جلوہ گر ہے۔

انتخاب :—

جس فتنے نے پایا نہیں رستہ مرے گھر کا
ناچار ہوا وادیٔ محشر کو روانہ

جینے کا گماں تھا، مجھے مرنے کا یقیں تھا
یوں عمر گزاری تری فرقت میں کہ ہر دم

مجبور ہے اس سے کہ خدا ہو نہیں سکتا
انسان ہوس پیشہ ہے، کیا ہو نہیں سکتا

بے وفا! تو بھی اسے لے کے پشیماں ہوگا
دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی

گویا ہمارے واسطے کبھی کچھ بنا نہ تھا
تم غیر کے ہوئے، تو رہا کیا جہان میں

بجھ بھی گئی تھی آگ، تو بجلی کو کیا ہوا
میرا ہوا آشیانہ اور آدھا جلا ہوا

آجاؤ کہ میں آپ میں اکثر نہیں رہتا
کہلاتے ہو کیوں وعدہ فراموش جہاں میں

کچھ ہو پر ان کو جانبِ اغیار دیکھنا ۔۔۔ اک بار منع کیجیے تو سو بار دیکھنا

نہیں اک بار بھی اب سُننے کی طاقت دل میں ۔۔۔ پہلے سو بار ترا نام لیا کرتا تھا

اپنی ستم کشی کا مجھے امتحاں ہے اب ۔۔۔ درکار ایک اور نیا آسماں ہے اب

کس کو دل دیتے ہو، کیا کرتے ہو، دیکھو سالک ۔۔۔ ہائے نادان بنے جاتے ہو، دانا ہو کر

تم آ گئے تو ہوش کہاں میزباں ہو کون ۔۔۔ آج آپ اپنے گھر میں ہیں۔ کچھ میہماں سے ہم
مایوس و نا امید ہیں، کیا مدعا سے ہم ۔۔۔ کہتے ہیں اور کہتے ہیں بس التجا سے ہم

پھرتے ہیں داد خواہ ترے حشر میں خراب ۔۔۔ تو پوچھتا نہیں، تو کوئی پوچھتا نہیں

وہ دشمن، دوست ہو یا آسماں ہو ۔۔۔ اجل بن کر ہی کوئی مہرباں ہو

شکر کیجے کہ نہیں تابِ تکلّم مجھ کو ۔۔۔ ورنہ اس طرح بھی جو چاہو، کہو تم مجھ کو

رگ رگ میں تپشِ عشق ہے، اے چارہ گر مرے ۔۔۔ یہ درد وہ نہیں کہ کہیں ہو، کہیں نہ ہو

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک ۔۔۔ تن درستی ہزار نعمت ہے

جانے دے اے تصورِ جاناں، نہ کر تلاش ۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں دشمن کے گھر ملے

پہنچے عدو کے گھر میں تو دامن جھٹک دیا ۔۔۔ ہم خاک بھی ہوئے ہیں تو مٹی خراب ہے

زباں کٹ جائے، گر لب سے تمھارا کچھ گِلہ نکلے
مگر یہ تو کہوں گا، تم کو کیا سمجھے تھے، کیا نکلے

اس کے آنسو ٹپک پڑے سالک ۔۔۔ حال اس درد سے کہا تو نے

صیاد الله بندِ قفس سے رہا کرے ۔۔۔ جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے

نئی مطبوعات

نام کتاب	مصنف	مطبوعہ	صفحات	قیمت
ایک طالب علم کی کہانی	عبدالغفار مدہولی	دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ		۲/-
کبیر بانی (اردو ہندی)	مرتبہ سردار جعفری	بمبئی، ہندوستانی بک ٹرسٹ	۳۰۸	۲۰/-
کربل کتھا (دہ مجلس) فضل علی فضل	مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد	پٹنہ، ادارہ تحقیقات اردو	۳۴۴	۷/۷۵
سمجھوتہ (ناول)	عارف مارہروی	دہلی، پنجابی پستک بھنڈار	۲۴۰	۵/-
چھیڑ غالب سے چلی جائے (مزاحیہ)	مرتبہ اکبر علی خاں	رام پور، کتاب کار	۳۰۴	۳/-
چندر مکھی کی بیل (ناول)	جیٹا کارلیٹن	دہلی، انڈین اکیڈمی	۴۹۴	۳/-
زخم (ناول)	نریندر شرما	دہلی، پراماؤنٹ پبلشنگ	۱۳۶	۳/۲۵
وہ لوٹے گی (ناول)	ستیہ پرکاش سنگر	" " "	۱۴۲	۳/-
ایک ناؤ کاغذ کی (ناول)	وجے سوری	دہلی، ہائی دے پبلیکیشنز	۱۵۶	۳/۵۰
یسلی استاد (مزاحیہ کلام)	محمد نیاز	پٹنہ، کارنرس بکس	۱۱۲	۲/-
گردش ایام (ناول)	ترجمہ مظہر الحق علوی	لکھنؤ، نسیم بک ڈپو		۸/-
زرد دیوتا "	" ایم جے عالم	" " "		۵/۵۰
موت کا نغمہ "	مسعود جاوید	" " "		۵/-
تہذیب "	اختر ملیح آبادی	" " "		۵/-
دولت سپانیہ عرب (تاریخ)	ترجمہ محمد صدیق	" " "		۱۲/-

پاکٹ بکس

جوگیا (افسانے) راجندر سنگھ بیدی
کامریڈ شیخ چلی (مزاحیہ خاکے) کنہیا لال کپور
عورت اور آبشار (ناول) بلونت سنگھ
میلی چاندنی (ناول) گلشن نندہ
عورت مرد (نفسیات) ڈاکٹر لکشمی نارائن

کانچ کے ٹکڑے (افسانے) کرشن چندر
لندن کی ایک رات (ناول) سجاد ظہیر
محبت یا ہوس (ناول) ٹالسٹائی
اردو کی بہترین غزلیں۔ مرتبہ پرکاش پنڈت
کامیابی کے راز (نفسیات) ماردن

نئی کتاب
ایک روپیہ
ایجنٹ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی ۶

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

من سمجھاون

مرتبہ: ڈاکٹر عبدالستار دلوی
صفحات: ۹۶، قیمت: ۲/۵۰
ناشر: اردو مرکز - بمبئی
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی ۳

دکنی ادب اُردو زبان کی سمت و رفتار کی تعین میں ہماری سب سے زیادہ مدد کرتا ہے، بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق نے سب سے پہلے تلاش و تحقیق کے بعد بہت سے دکنی شعرا و نثر نگاروں کو ادبی حلقہ سے متعارف کیا، بحمداللہ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ہماری لائبریریوں میں اب تک ایسے بہت سے قلمی نسخے محفوظ ہیں جو ہمارا بیش قیمت ادبی سرمایہ ہیں اور انھیں منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے اس سلسلے کی ایک اہم نظم "من سمجھاون" کو پہلی بار اردو داں طبقہ کے سامنے پیش کیا ہے جو بارھویں صدی ہجری میں مدراس کے قریب ترنا پلی میں لکھی گئی تھی۔ اس خوب صورت نظم کو چشتیہ سلسلے کے ایک صوفی شاعر شاہ تراب نے نظم کیا تھا۔ شاہ تراب نے یہ نظم مرہٹی کے صوفی شاعر رام داس کی نظم "مناچے شلوک" سے متاثر ہو کر لکھی ہے اور اس کے خیالات کو اسلامی رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کیا ہے، اور اکثر مقامات پر رام داس کی مرہٹی نظم کا ترجمہ کیا ہے۔ فاضل مرتب نے اپنے طویل مقدمہ میں من سمجھاون اور مناچے شلوک کا مقابلہ کیا ہے اور ان کی مشترک خصوصیات پر سیر حاصل ناقدانہ روشنی ڈالی ہے۔ موصوف نے رام داس اور شاہ تراب کے حالات اور تعلیمات پر بھی معلومات بہم پہنچائی ہیں اور مرہٹی شعراء پر تصوف کے اثرات بھی دکھائے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے صوفیا اسلامی تصوف اور ویدانت کو دارا شکوہ کی طرح ایک ہی مرکز پر لا کھڑا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اُردو میں قومی یک جہتی، اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے سلسلے میں جو

کوشش ہوتی رہی ہیں ان میں "من سمجھاون" بلند مقام رکھتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے "من سمجھاون" کی لسانی خصوصیات کی طرف بھی اشارے کیے ہیں، گو سنسکرت سے عدم واقفیت کی وجہ سے ہمارے محققین کے لسانی مطالعوں کو حرف آخر کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ نہ ہی کوئی علمی کام حرف آخر کے درجہ پر پہنچ سکتا ہے تاہم ڈاکٹر دلوی کا رجحان جدید لسانیات کی طرف معلوم ہوتا ہے، بہتر ہوتا کہ اگر من سمجھاون کے متعدد الفاظ کو تاریخی لسانیات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جاتی۔ قدیم ادب سے متعلق اس قسم کے مطالعوں کی افادی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

من سمجھاون کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند ایک الفاظ کے معنی کے سلسلے میں مرتب سے غلطی ہوئی ہے اور بعض جگہ متن میں بھی غلطی ہوئی ہے، دکنی کتابوں کے سلسلے میں اس قسم کی غلطیاں عام ہیں، جس کی بنیادی وجہ شاید یہ ہے کہ خود قلمی نسخوں کا پڑھنا ہی مشکل کام ہے جس کی وجہ سے ترتیب میں اس قسم کی غلطیوں سے بچنا محال ہے۔

کتاب کی ابتدا میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے پیش لفظ تحریر کیا ہے آخر میں مرتب نے بڑی محنت سے فرہنگ بھی دی ہے۔ کتابیات سے فاضل مرتب کے ذوقِ جستجو کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ادبی حلقوں میں کتاب مقبول ہوگی اور آئندہ اشاعت میں اس کی موجودہ کمزوریاں دور کرنے کی کوشش کی جائے گی جو من سمجھاون کے تمام مخطوطوں کے ہمدست ہونے سے رہ گئی ہیں۔ اس سلسلے میں طباعت پر بھی خاص طور پر سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

شاہد علی خاں

ہمارے نثر نگار

تاریخ اشاعت: جون ۱۹۶۵ء

مرتب: سید صفی مرتضیٰ
صفحات: ۱۰۴ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے
ناشر: نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ

اس کتاب میں میر امن اور رجب علی بیگ سرور سے لے کر آل احمد سرور اور کنھیا لال کپور

تک ۲۵ نئے پرانے نثر نگاروں پر تبصرہ شامل ہے۔ "غرضِ نگارش" میں کہا گیا ہے کہ "اس کتاب کے لکھنے کا مقصد صرف طلبہ کی خدمت ہے۔"

اس اعتبار سے انتخاب بالکل درست ہے اور وقتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، کیونکہ انھیں ادیبوں کو منتخب کیا گیا ہے جو عموماً ہماری دسویں گیارھویں جماعتوں میں نصاب کی زینت ہوا کرتے ہیں۔ ہر ایک نثر نگار کے عہد اور کلام کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف ناقدین کی رائیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ جن سے بیان بہت کچھ وقیع ہو گیا ہے۔ حالات کے پیشِ نظر اگرچہ اختصار برتا گیا ہے لیکن پھر بھی احوالِ واقعی ضرور پیش کر دیے گئے ہیں۔ مصنف کا بیان سلجھا ہوا اور بے جا عبارت آرائی سے پاک ہے۔ اچھا ہوتا اگر نثر کے مختلف اسالیب کے بارے میں بھی کچھ لکھا جاتا۔

ایسی کتابیں اپنی مخصوص اہمیت رکھتی ہیں اور جو لوگ طلبہ کی ضرورتوں کے پیشِ نظر زحمت گوارا کرتے ہیں، وہ واقعی سب کی شکر گزاری کے مستحق ہیں۔ پوری توقع ہے کہ یہ کتاب ہائر سکنڈری کی اعلیٰ جماعتوں اور انٹرمیجیٹ کلاس میں اردو ادب پڑھنے والوں کے لیے خاطر خواہ طور پر مفید ثابت ہوگی۔ خوشی کی بات ہے کہ کتاب صاف ستھری چھپی ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

کنول

مطبوعہ ۱۹۶۲ء (نیا اڈیشن)

شاعر: شری نرائن داس پوری
صفحات: ۲۱۱ سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: پانچ روپے
ناشر: سنٹرل بک ڈپو۔ اردو بازار دہلی

"کنول" نظموں کا مجموعہ ہے۔ ۱۹۳۸ء میں اس کا پہلا اڈیشن پوری مرحوم کی زندگی میں چھپا تھا۔ اس کا نیا اڈیشن شاعر کے سعادت مند اور خوش ذوق فرزند لالہ کپور چند ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا نے شائع کیا ہے۔

شاعر کی پیدائش ۷ فروری ۱۸۸۰ء کو ہوئی اور ۹ دسمبر ۱۹۵۳ء میں وفات پائی۔ نظمیہ فضا میں شاعر کا ذہن مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی سے متاثر ہے۔ پوری مرحوم تقریباً ۲۲ برس ہیڈ ماسٹر اور انسپکٹر مدارس کے عہدوں پر فائز

رہے اس لیے مغربی ادب کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ ورڈس ورتھ شیلے اور کیٹس کا ان کے ذہن پر کافی اثر رہا۔ بھگتی تحریک سے بھی لگاؤ رہا۔ اس لیے نظموں میں ان عناصر کی جلوہ گری ہے۔ شاعر کے خیالات میں تنوع ہے اور مشاہدے کی قدرت بھی ہے مگر زبان کے معاملہ میں احتیاط نہیں برتی گئی۔ مثلاً

ایک نظم "گھنٹہ گھر" کا تیسرا شعر۔ ص ۱۰۰ ملاحظہ کیجیے۔

محنت کا ثمر پاؤ ۔ نیکی کا اجر پاؤ

اجر اور ثمر ہم قافیہ لفظ نہیں ہیں۔ (اجر) میں "ج" بالفتح نہیں ہے سالک کی سند ملاحظہ فرمائیے۔

ملے گا اجر جس دن شیخ کو طاعت گزاری کا تو یارب پاس رکھنا کچھ ہماری شرمساری کا

(ص ۱۳۱) "ستاروں کی حقیقت ہیں" دوسرے شعر کا مصرع اول بحر سے خارج نظر آتا ہے۔ شعر:-

چورا ہے میں کسی بڑھیا نے جو دیے جلائے تھے
وہی ہم چرخ برائے یار "تارے بن کے آئے تھے

ہمیں توقع ہے کہ شاعر کے لائق فرزند "کنول" کے تیسرے اڈیشن اور غیر مطبوعہ مجموعے "نرگس" کی اشاعت کے وقت اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

"کنول" کے شاعر نے انگریزی نظموں کا قابل قدر ترجمہ کیا ہے۔ اور مذہبی رزمیہ نظموں کے مطالعہ سے شاعر کی قدرت بیان اور خلوص کا پتہ چلتا ہے۔ شاعر کی نیچرل نظمیں بہت اچھی ہیں اور اردو کی نظموں میں انھیں ایک مقام ملنا چاہیے خصوصاً اردو ریڈرس مرتب کرنے والوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ نظموں میں پیغام سادگی پاکیزگی، روانی اور تاثر ہے۔

ہمارے نزدیک "چنبیلی اور بھونرا" "معصومیت" ۔ نورجہاں کا مزار"۔ شاعر کی بہترین نظمیں ہیں۔

"کنول" کا دیباچہ جناب بسمل سعیدی ٹونکی نے لکھا ہے۔ اور پہلے اڈیشن پر اخبار "ٹریبون" کا عمدہ تبصرہ شامل ہے۔ کتابت اور طباعت عمدہ ہے۔ کاغذ معمولی۔ کتاب کی جلد اچھی ہے اور شاعر کی تصویر شامل اشاعت ہے۔

سیفی پریمی

سرچشمہ

مصنف : چندن بھارتی
ضخامت : ۲۴۰ صفحات ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت : پانچ روپے
ناشر : چندن کمپنی، ٹونک (راجستھان)

" سرچشمہ " جناب اتم چند چندن بھارتی کی غزلوں کا مجموعہ ہے ۔ چندن صاحب ایک معروف کاروباری آدمی ہیں، شاعری ان کا پیشہ نہیں شغل ہے، لیکن اپنے اس شغل کو نباہنے کے لیے چند سال کی مختصر مدت میں انھوں نے جو فنی استعداد بہم پہنچائی ہے، ان کا کلام اس کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔ ان میں شاعری کا ذوق تقسیم ملک کے حادثے کے بعد پیدا ہوا اور دھیرے دھیرے اس نے اتنی ترقی کی کہ فکر سخن ان کے روزانہ معمولات میں شامل ہوگئی ۔ " سرچشمہ " ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے اور اس میں ان کی ۲۲۱ غزلیں شامل ہیں ۔ اس سے پہلے وہ اپنی چار بیتوں کا مجموعہ " بہار چندن " کے نام سے شائع کر چکے ہیں ۔ اس سے شاعری کے ساتھ ان کے غیر معمولی شغف اور ان کی زودگوئی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

تخلیق عموماً اپنے خالق کی صفات کا پرتو ہوتی ہے ۔ چندن صاحب ایک بڑی دل آویز شخصیت کے انسان ہیں ۔ نیکی اور خلوص، سادگی اور صداقت، مروّت اور ہمدردی ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں ۔ ان کے مزاج کی سادگی اور شیرینی ان کے کلام میں بھی منتقل ہوگئی ہے ۔ ان کی بیشتر غزلیں بڑی مترنم، رواں، سلیس اور پراثر ہیں اور ان میں صرف معاملاتِ حسن وعشق کی ترجمانی ہی نہیں بلکہ زندگی کے دوسرے اہم مسائل کی تشریح وتوضیح کا حق بھی ادا کیا گیا ہے ۔ ان کے جذبات وخیالات کا بنیادی جوہر انسان دوستی ہے اور ان کے کلام میں جگہ جگہ اس کی دل افروز جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔

زبان وبیان کی صحت کا بھی چندن صاحب بہت خیال رکھتے ہیں اور موجودہ زمانے میں ایک ایسی خوبی ہے جو بہ طور خاص قابل داد ہے ۔

کتاب کا تعارف جناب سید علی ٹونکی نے لکھا ہے اور بڑی خوبی سے شاعر کی شخصیت اور اس کی شاعری کی بنیادی خصوصیتوں کی وضاحت کی ہے ۔

محمود سعیدی

قابلِ مُطالعہ

حالی کی اُردو نثر نگاری
از ڈاکٹر عبدالقیوم
قیمت: پندرہ روپے ۱۵/-
"یہ مقالہ مصنف کے تنقیدی شعور اور دقتِ نظر کا آئینہ دار ہے" (آل احمد سرور)

مباحث (تحقیقی و تنقیدی مضامین)
از ڈاکٹر سید عبداللہ
قیمت: تیرہ روپے ۱۳/-
یہ کتاب موصوف کی ادبی تحقیق و بصیرت اور لسانی علم و فراست کا بہترین آئینہ ہے۔

مرزا محمد ہادی و مرزا رسوا
از ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری
قیمت: چھ روپے ۶/-
مؤلفہ نے مرزا رسوا کے تخلیقی کارناموں کا جائزہ لیتے وقت کہیں بھی تنقیدی توازن اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔

قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے سیاسی نظریے
مرتبہ: بزمِ اقبال
قیمت: چار روپے ۴/-
ان سیاسی نظریوں کے تراجم جو وقتاً فوقتاً رسالہ اقبال کے انگریزی شماروں میں شائع ہوئے ہیں۔

تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات
از ڈاکٹر تاراچند
قیمت: بارہ روپے ۱۲/-
اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے بھارت کی علمی، ثقافتی، مذہبی اور فنی تحریکات پر مسلمانوں کے افکار و تصورات کا اثر دکھایا ہے۔

ڈرامہ نگاری کا فن
از پروفیسر محمد اسلم قریشی
قیمت: چھ روپے پچاس پیسے ۶/۵۰
ڈرامہ نگاری کے فن کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں جسے مصنف نے نظر انداز کیا ہو۔

ادبی خبریں

ڈاکٹر صفدر آہ جن کی کتاب "ہندوستانی ڈرامہ" پر حال ہی حکومت نے اعزاز عطا کیا ہے اس کے شکریہ ومبارک باد کی شاندار تقریبات نومبر کے دوسرے ہفتے میں ڈاکٹر صاحب کے آبائی وطن "سیتاپور" میں خاص اہتمام سے منائی گئی۔ جن میں شرکت کے لیے خود ڈاکٹر آہ بمبئی سے سیتاپور تشریف لائے تھے۔

۱۳ نومبر کو پانچ بجے سہ پہر "نہرو ہال" میں زیر صدارت ڈاکٹر نول بہاری مصرا، ڈاکٹر صفدر آہ کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جس میں حکام - وکلاء - ڈاکٹر - اور شہر کے بکثرت معززین نے شرکت فرمائی۔ استقبالیہ کا افتتاح شیام کمار اوتھی ایڈوکیٹ کی ایک تقریر سے ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب کی نجی زندگی اور ادبی خدمات کے بارے میں تفصیلی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے بعد بابو جگناتھ پرشاد اگروال سابق ممبر پارلیمنٹ - پروفیسر آغا اشہر لکھنوی جناب سری رام چنڈوک۔ جناب سید محمد اطہر زائر سیتاپوری اور صدر جلسہ ڈاکٹر مصرا نے ڈاکٹر صفدر آہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری ایک درجن سے زاید کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس سے قبل حکومت یو پی نے آپ کی بیش قیمت کتاب "فردوسی ہند" کو بھی انعام کا مستحق قرار دیا تھا

●

پنڈت ترلبھون ناتھ زار زتشی مرحوم کی یاد میں یوم زار کمیٹی دہلی کے زیر اہتمام ۲ نومبر ۱۹۶۵ء کو چار بجے شام دلی پبلک لائبریری ہال میں ایک تعزیتی جلسہ ومشاعرہ منعقد ہوا۔ جلسے کا افتتاح جناب پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب اور صدارت جناب جنرل شاہنواز خاں صاحب نے فرمائی۔ جناب احسن لکھنوی، جناب خواجہ احمد فاروقی، جناب عرش ملسیانی اور جناب سجاد ظہیر صاحب نے اپنی تقاریر میں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مشاعرے کی صدارت جناب لالہ شام ناتھ صاحب نے فرمائی۔

لکھنؤ کے کہن سال شاعر اور لکھنؤ اسکول کے نمایندہ مرزا امراؤ بیگ عشق لکھنوی نے استی سال کی عمر میں ۱۶ر نومبر ۱۹۶۵ء کو بمقام خیرآباد ضلع سیتاپور انتقال کیا۔

مرزا عشق مرحوم حکیم ضامن علی جلال لکھنوی کے شاگردوں میں تھے ان کے والد مرزا قدرت اللہ بیگ بسلسلہ ملازمت ریاست محمود آباد گزشتہ صدی کے آخر میں سیتاپور آگئے تھے۔ مرزا عشق کی تعلیم و تربیت سیتاپور ہی میں ہوئی، عشق مرحوم مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہم سبق اور کلاس فیلو تھے دونوں نے مدتوں ایک ساتھ گورنمنٹ اسکول سیتاپور میں تعلیم پائی تھی۔

مرزا کے کوئی اولاد نرینہ یا دختر نہیں ہے صرف ایک بیوہ خیرآباد میں موجود ہیں۔

مرزا عشق کی تدفین خیرآباد ہی میں ہوئی۔

●

ماہنامہ کتاب لکھنؤ اپنی تیسری سالگرہ کے موقعہ پر یکم دسمبر کو اپنا سالنامہ شائع کر رہا ہے جس میں ملک کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات پیش کی جائیں گی۔ اس نمبر کی قیمت سوا روپیہ ہوگی۔ یہ نمبر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی سے بھی دستیاب ہو سکے گا۔

●

معلوم ہوا ہے کہ لاہور سے شائع ہونے والا مشہور ادبی و علمی ماہنامہ "ہمایوں" جس کی اشاعت ۱۹۵۵ء سے بند تھی، اب تاجور سامری صاحب کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوا کرے گا۔

نئے "ہمایوں" کا پہلا شمارہ جو جنوری ۱۹۶۶ء کا رسالہ ہوگا۔ دسمبر کے شروع میں منظرعام پر آجائے گا۔ (پتہ: "ہمایوں" ۳۴ ایف، کملا نگر نئی دہلی ۲۵)

سالانہ ایک روپیہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵	فی پرچہ دس پیسے

(پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے کوہ نور پرنٹنگ پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا)

اُستادوں اور بچوں کے لیے عبدالغفار صاحب مُدہولی کی کتابیں

اُستادوں اور بڑوں کے لیے

۱۔ **جامعہ کا طریقہ** قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے

اس میں بچوں کو کام اور مشغلوں کے ذریعے اردو، ہندی سکھانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

۲۔ **کھیل کے ذریعے تعلیم** (دو حصے) قیمت ۲ روپے

پہلے حصے میں پہلی جماعت میں زبان اور حساب سکھانے کے کھیل درج ہیں

۳۔ **چند پروجکٹ** قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے

جامعہ کے مدرسہ ابتدائی اور ثانوی میں جو پروجکٹ چلائے گئے ہیں۔ ان میں سے چند منتخب پروجکٹ یک جا شائع کر دیئے گئے ہیں۔

۴۔ **اُردو املا سکھانے کا آسان طریقہ** قیمت ۵۰ پیسے

اس طریقے کے سکھاتے ہی بچے صحیح املا لکھ لیتے ہیں نیز اُردو رسم خط کے لئے انجمن ترقی اُردو نے جو علامتیں تجویز کی ہیں ان کی خوبیاں بتائی گئی ہیں۔

۵۔ **مدرسہ ابتدائی کی کہانی** قیمت دو روپے

جامعہ کے مدرسہ ابتدائی کو چند سال میں نمونہ کا مدرسہ کس طرح بنایا گیا ہے۔ یہی کہانی اس میں درج ہے۔

۶۔ **جامعہ کی کہانی** حصہ اول قیمت ۶ روپے

۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۲ء تک جامعہ کے تعلیمی کاموں کی رُوداد اور اس کے اُتار چڑھاؤ کو کہانی کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ضخامت پانچ سو صفحے

بچوں کے لیے

۱۔ **کیمپ فائر کی نقلیں** (دو حصے) ہر ایک حصے کی قیمت ۷۵ پیسے

اس میں کیمپ فائر میں کھیلنے کے لئے طرح طرح کی نقلیں دی گئی ہیں۔ اس کتاب پر حکومت کی طرف سے انعام ملا ہے۔

۲۔ **ایک طالب علم کی کہانی** قیمت ۲ روپے

اس میں مُدہولی صاحب نے اپنی طالب علمی کے زمانے کے حالات کہانی کی صُورت میں لکھے ہیں۔ مرکزی حکومت نے اس کتاب پر انعام دیا ہے۔

۳۔ **چوری کی عادت** (ڈراما) قیمت ۵۰ پیسے

ایک بچے کی چوری کی عادت کیسے چھڑائی گئی۔

۴۔ **جھوٹا لڑکا** (ڈراما) قیمت ۲۵ پیسے

بچے جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔

۵۔ **غیر ذمہ دار لڑکا** (ڈراما) قیمت ۵۰ پیسے

بچے ذمہ دار ہوتے ہیں یا غیر ذمہ دار۔

۶۔ **سال بھر کی دل چسپیاں** قیمت ۵۰ پیسے

موسم اور تہوار کی جو دل چسپیاں سال بھر میں آتی ہیں انھیں معلوماتی طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

۷۔ **اُردو تاش** قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

اس کے کھیلنے سے لفظ اسی طرح بنتے ہیں جس طرح یہ لکھے جاتے ہیں۔

۸۔ اُردو کا بنیادی قاعدہ اور بنیادی پہلی کتاب۔ یہ درسی کتابیں ہیں

نوٹ: کھیل کے ذریعے تعلیم۔ جامعہ کا طریقہ۔ کیمپ فائر کی نقلیں۔ چوری کی عادت۔ یہ کتابیں ہندی میں بھی ملتی ہیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

Regd No. D. 58

December,

Kitab Numa

JAMIANAGAR, NEW DELHI-25.